allurdupdfnovels.blogspot.com

ایک سیاست کئی کہانیاں

رؤف کلاسرا

www.freepdfpost.blogspot.com

alluurdupdfnovels.blogspot.com

ایک سیاست کئی کہانیاں

رؤف کلاسرا

دوست پبلی کیشنز
اسلام آباد۔ لاہور۔ کراچی

www.freepdfpost.blogspot.com

!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

ڈان کے لیجنڈری ایڈیٹر

احمد علی خان (مرحوم)

کے نام

جن کے 1998ء میں مجھے ملتان سے اسلام آباد تبادلہ کرنے
کے ایک فیصلے نے میری زندگی ہمیشہ کے لیے بدل دی۔

ضابطہ

ISBN: 978-969-496-385-3

کتاب : ایک سیاست کئی کہانیاں

مصنف : رؤف کلاسرا

سن اشاعت : 2010

سرورق : خالد رشید

مطبع : ورلڈ میڈ، اسلام آباد

قیمت :

دوست پبلی کیشنز پلاٹ 110، سٹریٹ 15، I-9/2، پوسٹ بکس نمبر 2958، اسلام آباد

فون 051-4102784-5 E-mail: dostpub@comsats.net.pk

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

ترتیب

کہانیوں کی کہانی	رؤف کلاسرا	7
زاویے	عامر متین	13
چوہدری شجاعت حسین		19
چوہدری نثار علی خان		42
جنرل علی قلی خان		73
شاہد حامد		95
اسحاق ڈار		127
فیصل صالح حیات		147
امین فہیم		167
آصف علی زرداری		188
آفتاب احمد خان شیرپاؤ		217
سلطان محمود قاضی		230

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

کہانیوں کی کہانی

میں یہ کتاب چھ سال کی تاخیر سے لکھ رہا ہوں۔ رپورٹنگ کا کچھ ایسا چسکا پڑا ہے یا صحافت میں ہم سب کے گرو عامر متین کے بقول "کیڑا" ہونے کا کہ اب کسی اور طرف دھیان ہی نہیں جاتا۔ لیکن میں قیام لندن کے دنوں میں جس بک سٹور پر گیا اور جس بیسٹ سیلر بک کو بھی ہاتھ لگایا تو پتہ چلا وہ وہاں کے کسی صحافی نے لکھی تھی۔ پاکستان کے بارے میں جتنی اچھی کتابیں اب تک لکھی گئی ہیں ان کے لکھنے والے بھی غیر ملکی صحافی ہیں۔ یہ صحافی پاکستان میں اپنے اخبار کے لیے صرف تین سال لگاتے ہیں اور اپنی معیاد ختم ہونے پر واپس جا کر ان کا پہلا کام پاکستان اور پاکستانی سیاستدانوں، فوج اور ایجنسیوں کے بارے میں کتابیں لکھنا ہوتا ہے۔ لہٰذا ایک خواہش میرے دل میں بھی ہمیشہ سے موجود تھی کہ کچھ ایسا کام کیا جائے جس سے پاکستانی سیاست کے مختلف ادوار اور بڑے بڑے کرداروں کو عوام کے سامنے ایک کہانی کی شکل میں پیش کیا جا سکے۔ اسی خواہش کے پیش نظر ان سیاسی خاکوں کو اردو میں ایک نیا رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔

مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میرے ذہن میں یہ بات کیسے آئی تھی کہ 2003ء میں، میں نے اس وقت کے سب سے زیادہ طاقتور سیاستدان چوہدری شجاعت حسین کا انٹرویو کیا تھا جس نے میرے لیے ایک نئی راہ متعین کی تھی۔ میں ہمیشہ اس کوشش میں رہا کہ میں خبر کو بھی ایک کہانی کی شکل میں لکھوں تاکہ پڑھنے

جنرل [illegible] 246
میر ظفر اللہ خان جمالی 263
نواز شریف 281
سید یوسف رضا گیلانی 331
ذوالفقار علی بھٹو 352

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

والا ہو رہے کا شکار نہ ہو۔ میں نے چوہدری شجاعت کا وہ انٹرویو اپنے انگریزی اخبار "دی نیوز" میں ایک کہانی کی طرح ہی لکھا تھا۔ وہ کہانی لوگوں کو اتنی پسند آئی کہ پھر میں نے تین کے قریب اور سیاستدانوں کی کہانیاں لکھیں۔ مجھے محمود خان اچکزئی کا وہ فقرہ نہیں بھولتا کہ میں نے چالیس برس بعد اطالوی مشہور عالمی صحافی اوریانا فلاسی کی یاد انہیں دلا دی تھی۔ میں نے اس وقت تک عالمی لیڈروں کے زبردست انٹرویوز پر مشتمل اوریانا کی کتاب "An interview with history" نہیں پڑھی تھی۔

جب پڑھی تو اس کا ایک ایسا رومانس سر پر سوار ہوا کہ میں نے اس کا بھٹو صاحب کا مشہور زمانہ انٹرویو ترجمہ کر کے اس کتاب میں شامل کیا ہے تاکہ ہماری نئی نسل ماضی سے قدرے روشناس ہو سکے۔ یہ انٹرویو 1972ء میں لیا گیا تھا۔ میرا دل چاہا کہ کاش اوریانا فلاسی دوبارہ بھٹو صاحب کا انٹرویو 1977ء کی فوجی بغاوت کے بعد کرتی تو پتہ نہیں کیا کیا انکشافات ہوتے۔ جس انداز سے اوریانا فلاسی نے بھٹو صاحب کی شخصیت کو بے نقاب کیا ہے وہ اس کتاب کو پڑھنے والوں کے لیے زیادہ دلکش بنائے گا۔

جب میں اپنے ان تمام سیاسی خاکوں میں سے انتخاب کرنے بیٹھا تو مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کس کا نام ڈراپ کروں۔ مجھے سب سے زیادہ مایوسی اس بات کی ہے کہ محمود خان اچکزئی کے ساتھ آٹھ برسوں پر محیط نشستوں کے بعد بھی میں اپنے آپ کو اس قابل نہ بنا سکا کہ وہ مجھے اپنے رازوں کی کہانی لکھنے دیتے۔ میرا خیال ہے کہ اگر محمود اچکزئی مجھے اجازت دے دیتے تو وہ اس کتاب کا سب سے بہترین باب ہوتا۔ میں ابھی بھی مایوس نہیں ہوا ہوں۔ انہوں نے آٹھ برس پہلے مجھے یہ کہا تھا کہ یہ تمام راز آف دی ریکارڈ بتائے جا رہے ہیں۔ میرے لبوں پر پھیلتی مسکراہٹ دیکھ کر وہ یکدم سنجیدہ ہو کر براہ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ایک پٹھان کے لہجے میں بولے۔ "اگر تم نے وہ راز راز نہ رہنے دیئے تو پھر ہو سکتا ہے کسی دن تمہیں اپنی جان بچانے کے لیے اسلام آباد سے فرار ہونا پڑے تو اگر کوئی شخص تمہیں پورے پاکستان میں اپنا مہمان بنائے گا تو وہ صرف محمود اچکزئی ہو گا۔ آگے تمہاری مرضی۔ اگر تم اپنی آخری پناہ گاہ کو بھی میرے راز لکھ کر ختم کرنا چاہتے ہو تو یہ تمہاری چوائس!"

یہ بات میں ہی جانتا ہوں کہ کتنی مشکل سے میں نے ان آٹھ برسوں میں محمود اچکزئی کے سینے سے دھواں بن کر نکلنے والے ان خوفناک رازوں کو کیسے ایک صحافی ہونے کے باوجود چھپا کر رکھا ہے۔

اگرچہ میرے دوست کالم نگار سلیم صافی نے محمود اچکزئی کی موجودگی میں مجھے کہا کہ رؤف بھائی اگر تم بھی ان کے پاس آدمی ہو، تم مجھے دیکھو اور یہ مجھے بھی کئی باتیں بتاتے رہتے ہیں جنہیں میں چھاپنے کے بعد ایک دو ہفتے ان سے نہیں ملتا۔ اس پٹھان کا دل بہت بڑا ہے، وہ جلد ہی اپنے سے چھپے صحافیوں کو معاف کر دیتا ہے۔ میں نے مسکرا کر سلیم صافی کو جواب دیا کہ ہو سکتا ہے یہ خصوصی رعایت محمود اچکزئی صاحب صرف پختون صحافی کے ساتھ تو روا رکھتے ہوں لیکن پنجاب کے صحافی کو ان آٹھ برسوں میں ابھی تک ان سے اتنی قربت حاصل نہیں ہو گی۔

محمود اچکزئی کے علاوہ شیخ رشید، خواجہ محمد آصف، مشاہد حسین، مولانا ... الحق، والد ... سیف اللہ اور چند ایک بڑے سیاستدان تھے جن کے پروفائل لکھ کر بھی میں اس کتاب میں شامل نہیں کر سکا۔ اگر اس سیاسی کتاب کو پذیرائی ملی تو شاید ان کے رازوں سے بھی پردے اٹھ جائیں۔ بہت سارے دوستوں نے کہا کہ قاضی حسین احمد، مولانا فضل الرحمن اور الطاف حسین کے بھی اسی طرح کے پروفائل لکھوں۔ پتہ نہیں میرا دل کیوں نہیں مانا۔ میں نے ان سب کو یہی جواب دیا کہ میرا خیال ہے کہ وہ مجھے اپنے دل کی باتیں نہیں بتائیں گے یا وہ سچ جو میں سننا چاہتا ہوں وہ اپنے اندر سے نہیں نکال پائیں گے، لہذا ان کا اور اپنا وقت برباد کرنے کا کیا فائدہ؟ اس لیے میں ان تینوں کے چاہنے والوں سے معذرت خواہ ہوں۔

"دی نیوز" کے سابق ایڈیٹر سلیم بخاری مجھے ہمیشہ یہ کہتے تھے کہ مجھے انگلش میں لکھے گئے یہ سارے سیاسی پروفائلز کتابی شکل میں لے آنے چاہئیں۔ یہ کریڈٹ بھی سلیم بخاری کو جاتا ہے کہ یہ سب کے سب تہلکہ خیز پروفائلز انہی کے دور میں شائع ہوئے اور پہلی دفعہ جنرل مشرف کے دور میں انہی کے خلاف ہی ایسی ایسی چیزیں شائع ہونا شروع ہوئیں جن کا تصور کرنا شاید مشکل تھا۔ سلیم بخاری نے ایک بھی پروفائل نہیں رکنے دیا۔ اگر میں یہاں جنگ گروپ کے مالک میر شکیل الرحمن کا ذکر نہ کروں تو یہ ان کے ساتھ زیادتی ہو گی۔ اس بات کا میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ میر شکیل الرحمن پر جنرل مشرف کا کتنا دباؤ تھا کہ وہ اس طرح کے انٹرویو چھاپنا بند کریں۔ جنرل علی قلی خان کے پروفائل کے بعد تو حد ہو گئی تھی کیونکہ اس سے جنرل مشرف کی ان سازشوں کا پردہ فاش ہوا تھا جو انہیں نواز شریف سے خفیہ ملاقاتوں کے بعد آرمی چیف کے عہدے تک لے گئی تھیں۔ میر شکیل الرحمن نے بڑی ہمت سے میرے سارے پروفائل اخبار میں چھاپے۔ شاید اگر وہ جنرل مشرف کے دباؤ میں آ جاتے تو آج یہ تاریخ اس طرح رقم نہ ہو پاتی جس طرح اس کتاب کی شکل میں ہو رہی ہے۔ میں اس کتاب پر زیادہ تبصرہ اس لیے نہیں کرنا

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

چاہتا ہے کہ آپ اسے اپنے ذہن اور دل سے پڑھیں اور اپنے نتائج خود اخذ کریں کہ اس ملک کو ہمارے فوجی جرنیلوں، بیوروکریسی اور سیاستدانوں نے کس طرح اس حال تک پہنچایا ہے جہاں آج ہم کھڑے ہیں۔ یہ سیاستدانوں کی وہ داستان ہے جس کا انجام ابھی جلدی نہیں ہونے والا کیونکہ اس کہانی کے تمام مرکزی کردار ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں اور سب کچھ دہرایا جا رہا ہے۔ کسی نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ میں جتنے بھی سیاستدانوں سے ملا کسی کو اس قابل نہیں پایا کہ میرے دل میں ان کے لیے کوئی عزت و احترام پیدا ہوتا۔ سب کو میں نے کسی نہ کسی سازش میں شریک پایا اور مقصد ایک ہی تھا کہ اقتدار میں جا کر اپنی نسلوں کا مستقبل سنوارنے کی کوششیں کی جائیں۔ خدا ان پر ایسا مہربان ہوا کہ انہیں وہ کچھ بھی اس ملک سے ملا جس کی شاید انہوں نے خواہش بھی نہیں کی تھی اور بدلے میں وہ اس ملک اور اس کے باسیوں کو کچھ بھی نہیں لوٹا سکے۔ ہماری فوج اور سیکرٹ ایجنسیاں بھی شاید دنیا کے واحد ادارے ہیں جو اپنے سیاستدانوں کو کرپٹ اور بلیک میل کر کے بالواسطہ یا بلاواسطہ حکومت کرتے ہیں۔

جیو ٹی وی کے پروگرام "جوابدہ" کے شہرۂ آفاق اور میرے پسندیدہ میزبان افتخار احمد نے ان انٹرویوز کی روایت کو اپنے جارحانہ انداز کے ذریعے ایک نئی شکل دی اور ان تمام سیاستدانوں کو اخبار سے اٹھا کر سکرین پر لے آئے اور بڑا زبردست کام کیا۔

اس کتاب کے انتساب کا وقت آیا تو میرے دل اور دماغ میں ڈان کے لیجنڈری ایڈیٹر احمد علی خان کی تصویر چمک کر رہ گئی۔ جولائی 1998ء کی بات ہے میں اس وقت ملتان میں ڈان کا ایک معمولی سا نامہ نگار تھا۔ مجھے پتہ چلا کہ ڈان اسلام آباد میں ایک رپورٹر کی جگہ خالی ہے۔ پتہ نہیں میرے ذہن میں کیا سمایا کہ میں نے بھی خان صاحب کو ایک درخواست لکھ کر بھیج دی۔ میرے لاہور کے ایڈیٹر طاہر مرزا صاحب بہت ناراض ہوئے۔ نوکری سے نکالنے تک کی دھمکی دے دی کہ تمہیں یہ جرأت کیسے ہوئی کہ تم ملتان سے اپنا تبادلہ اسلام آباد کرا لو۔ ڈان لاہور کے سب دوستوں نے منع کیا کہ خان صاحب کو درخواست بھیجنے کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ وہ مرزا صاحب کی مرضی کے بغیر میرا تبادلہ ہرگز نہیں کریں گے۔ انہوں نے یہ بھی انکشاف کیا کہ اسلام آباد کی اس ایک سیٹ کے لیے پہلے ہی لاہور اور کراچی کے کوئی دس رپورٹرز درخواست دے چکے ہیں اور انہی میں سے کوئی تجربے کی بنیاد پر اسلام آباد بھیجا جائے گا۔ میں نے دوستوں سے کہا جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ زندگی میں اس طرح کے بلاوجہ چانسز لینے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔ میں نے خان صاحب کے نام ایک درخواست لکھ دی جس میں اپنی خواہش ظاہر کی تھی کہ مجھے ڈان کا فون آیا کہ خان صاحب مجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ مجھ سے کس طرح کی ذاتی ڈیل کرنے والے ہیں۔ میں نے اپنی درخواست میں لکھا تھا کہ میری ہونے والی بیوی کی نوکری ایک ہفتہ پہلے اسلام آباد میں ہوئی ہے۔ اگر میرا فوراً اسلام آباد تبادلہ ہوا تو اسے وہ نوکری چھوڑنا پڑے گی۔ سرائیکی علاقوں کے والدین تو ویسے ہی مشکل سے نوکری کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ لہٰذا اسلام آباد کون اکیلی لڑکی کو جانے دے گا۔

جونہی خان صاحب فون پر آئے تو ان کی بھاری آواز میرے کانوں میں گونجی کہ میں نے اس لڑکی کی درخواست منظور کر کے آپ کا تبادلہ اسلام آباد کر دیا ہے۔ خان صاحب نے کہا کہ وہ اسلام آباد کے بیورو چیف ضیاء الدین صاحب سے بھی فون پر بات کر چکے ہیں۔ میں جب بھی جانا چاہوں میری مرضی ہے۔ انہوں نے میری رپورٹنگ کے بارے میں چند تعریفی کلمات کہے اور کہا کہ مجھے یقین ہے کہ تم اسلام آباد جا کر اپنا نام پیدا کرو گے۔ کراچی اور لاہور کے رپورٹرز کو تو پہلے ہی مواقع ملے ہوئے ہیں۔ اب کی دفعہ ملتان کے رپورٹر کو یہ موقع ملنا چاہیے۔ تم اپنی ہونے والی بیوی سے نوکری نہ چھڑواؤ اور اسلام آباد جاؤ۔

میں ریسیور ہاتھ میں پکڑے پتہ نہیں کتنی دیر وہاں بیٹھا رہا۔ پتہ نہیں کہاں سے چند آنسو میری آنکھ سے نکلے اور میرا سر احمد علی خان صاحب کے لیے احترام سے کچھ ایسا جھکا کہ آج تک جھکا ہوا ہے اور ہمیشہ جھکا رہے گا۔ ان کے اس ایک فیصلے نے میری زندگی بدل دی۔ میری یہ کاوش انہی کے نام ہے۔ ان کی موت کا سن کر ایسا لگا تھا کہ کوئی اپنا بچھڑ گیا ہے۔

خان صاحب کا ذکر چلا ہے تو ڈان اسلام آباد کے بیورو چیف ضیاء الدین صاحب کی شفقت اور پروفیشنل ڈانٹ ڈپٹ بھی اب یادوں کا حصہ ہے۔ میرے ڈان کے دنوں کے دوست اور خوبصورت انسان ناصر ملک نے بھی مجھے اپنی غلطیاں دور کرنے میں بڑی مدد کی ہے۔ آج بھی جب ڈان بیورو چلا جاؤں، اپنے دوست ارشد شریف، شہزاد رضا، اسد محمود اور مطیع اللہ جان سے ملنے جاتا ہوں تو اکثر وہاں خاموش بیٹھا رہتا ہوں کہ وہاں ضیاء الدین، ناصر ملک، شاہین صہبائی، احتشام الحق، اکرام ہوتی، احمد حسن علوی، محمد یاسین، سید عرفان رضا جیسے دوستوں کی یاد ستاتی ہے۔

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

[illegible]

ایک دوسرے [illegible]

کیا گیا ہے اور بعض جگہ کچھ لفظوں کی درستی کی گئی ہیں۔ میں اس کتاب میں شامل ان تمام سیاستدانوں کا شکر گزار ہوں جنہوں نے میرے ساتھ [illegible] لیے۔ میں نے کبھی بھی کوئی انٹرویو یک طرفہ نہیں لکھا۔ کسی ایک بھی سیاستدان نے اخبار میں یہ پروفائل چھپنے کے بعد ہونے والے تمام شور شرابے اور ہنگامے کے باوجود ایک دفعہ بھی اس کی تردید نہیں کی جس سے مجھے یہ حوصلہ ملا کہ اگر رپورٹر اپنی خواہشات کو خبر نہ بنائے تو سیاستدان میں اتنی اخلاقی جرأت ضرور ہوتی ہے کہ وہ تمام تردید کے باوجود اپنی کہی ہوئی بات سے نہ مکریں۔

میں فریال، احمد اور مہدی کی محبتوں کا مقروض ہوں۔ صحافت سے جڑے میرے اس جنون کی قیمت اگر کسی نے ادا کی ہے یا کر رہے ہیں تو وہ یہ تینوں ہیں جن کے بغیر ذاتی زندگی ہرگز اتنی خوبصورت اور مطمئن نہ ہوتی جتنی مجھے اب لگتی ہے!

رؤف کلاسرا

اسلام آباد

زاویے

رؤف کلاسرا کی کتاب "ایک سیاست، کئی کہانیاں" بہت اچھی کاوش ہے جس کی آجکل کے دور میں پہلے سے بھی زیادہ ضرورت ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔

ہمارے ہاں کتابیں لکھنے کا رجحان بہت کم ہے۔ اس طرح کی کتابیں خاص طور پر سیاست پر اور زیادہ لکھی جانی چاہئیں اور لکھنے والا اگر صحافی ہو اور وہ بھی ایسا جسے سیاست اور اس کے کرداروں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہو تو موضوع میں جان پڑ جاتی ہے۔

صحافت میں رپورٹر کو دفتر میں بیٹھے ہوئے اداریہ نویسوں، یونیورسٹیوں میں پڑھانے والے پروفیسروں (ریسرچرز) یا محققوں کے مقابلے میں حالات کو بلاواسطہ (First hand) دیکھنے کا زیادہ موقع ملتا ہے۔ اسی لیے رپورٹنگ کو تاریخ کا پہلا ڈرافٹ کہا جاتا ہے۔ اگر رپورٹر میں بہتر مشاہدہ، تاریخی پس منظر اور لکھنے کی صلاحیت بھی موجود ہو تو رپورٹ میں مزید "چار چاند" لگ جاتے ہیں۔

مگر میرا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ سیاسی رپورٹنگ کے لیے ایک خاص شوق بلکہ جسے عرف عام میں "کیڑا" کہتے ہیں، اس کے ہونے کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔

رؤف کلاسرا میں بلاشبہ وہ "کیڑا" موجود ہے جس کی وجہ سے وہ حالات و واقعات کو سیاسی تناظر میں پرکھتا ہے۔ یہ کیڑا اس کو 24/7 ڈیوٹی پر رکھتا ہے جس میں وہ ہر مشاہدے کو ماضی کی روشنی سے [illegible]

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

جاتا ہے۔ اسے ایسی صحبتوں کی کھوج میں رکھتا ہے جہاں سیاسی گفتگو ہو سکے۔ یہ "کیڑا" رؤف کو چھوٹے واقعات کی بڑی کہانیوں سے کڑیاں جوڑنے میں مصروف رکھتا ہے۔

پاکستان میں سیاسی صحافت کے لوازمات ذرا مختلف ہیں۔ گورے صحافیوں کے لیے پاکستان کا موروثی جاگیردارانہ اور برادری پر مبنی معاشرہ سمجھنا ذرا مشکل عمل ہے۔ حتیٰ کہ ہمارے اپنے انگلش میڈیم صحافی بھی پاکستانی سیاست کے مقامی پیچ و خم، سیاسی کرداروں اور جماعتوں کی تاریخ اور مختلف ادوار کے اتار چڑھاؤ کو سمجھنے کا تردد نہیں کرتے۔ میرے کافی ایسے "مقامی گورے" صحافی دوست ہیں جو فخریہ بتاتے ہیں کہ ان کی اردو بہت کمزور ہے اور یہ کہ وہ اردو اخبار بالکل نہیں پڑھتے۔ اکثر بڑے شہروں میں پلے بڑھے ہیں اور نچلے طبقوں کے معاشرتی مسائل سے بہت کم واقفیت رکھتے ہیں اور جو صحافی درمیانے اور نچلے طبقوں سے ترقی کر کے اوپر آ گئے ہیں، اسلام آباد اور بڑے شہروں کی رنگینیاں ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیتی ہیں اور وہ اپنے ماضی سے جان چھڑاتے نظر آتے ہیں۔

صحافت میں پاکستانی معاشرے میں موجود یہ طبقاتی مسائل ہمیشہ رہے ہیں۔ مگر اب فرق یہ ہے کہ سیاست سے نابلد صحافیوں کی ایک پوری نسل ایسے عہدوں پر براجمان ہو چکی ہے کہ وہ رائے عامہ کو ایک اندھیری گلی میں دھکیلتی نظر آتی ہے۔

ٹیلی ویژن کی آمد سے یہ رجحان مزید خطرناک ہو گیا ہے۔ اینکرز کا ایک طبقہ اسلام آباد کے ڈرائنگ روم کی گپ شپ، ایجنسیوں کی پھیلائی ہوئی سازشی افواہوں اور مراعات یافتہ مافیا کے پراپیگنڈے کو سیاسی تجزیے کے طور پر روزانہ پیش کرتا نظر آتا ہے۔

اکثر اینکرز کا صحافتی تجربہ کچھ سالوں یا مہینوں پر محیط ہے جس میں اچھے زمانوں میں صحافیوں کو سیاسی رپورٹنگ کی بمشکل اجازت ملتی تھی۔ انہیں نہ نیوز روم کی ڈانٹ ڈپٹ کا تجربہ ہے نہ فیلڈ رپورٹنگ کا۔ یہ ایسے ادوار کی پیداوار ہیں جس میں سیاسی عمل یا تو ناپید تھا یا اس کی لولی لنگڑی شکل سیاست کے طور پر موجود تھی۔ اس کی وجہ سے یہ نومولود صحافی سیاست اور سیاستدان کے خلاف بڑی جلدی تعصب قائم کر لیتے ہیں۔ اس سے نہ صرف ملک میں جمہوریت کے پروان چڑھنے میں دشواری ہوتی ہے بلکہ ہم ایک باشعور اور متبادل خیالات کو برداشت کرنے والے معاشرے کو قائم کرنے سے قاصر ہیں۔ آئے دن پاکستانی ٹی وی چینلز پر سیاسی موضوعات پر ایسی بھونڈی بحث نظر آتی ہے کہ انسان کا سر پیٹنے کو دل کرتا

ہے۔ ایک بھیڑ چال ہے جس میں جھوٹی خبر بغیر تناظر کے اس طرح اچھال دی جاتی ہے کہ اس سے حکومت اور ملک کا پورا جمہوری نظام خطرے میں پڑ جاتا ہے۔

مہذب معاشرے میں سیاستدان ناکام ہوتے ہیں۔ حکومتیں گرتی ہیں۔ آئینی تبدیلیاں ہوتی ہیں اور ادارے اختیارات پر لڑتے بھی ہیں مگر اس سے نظام ریاست یا قومی سلامتی پر کوئی آنچ نہیں آتی۔ اٹلی میں پچھلے 25 سال میں پاکستان کے مقابلے میں دوگنا حکومتیں گر چکی ہیں۔ امریکہ میں سپریم کورٹ نظریاتی بنیاد پر استوار ہے۔ ججوں کے نظریات، زندگی اور فیصلوں پر عام تنقید ہوتی ہے۔ فرانس کے صدر کی ایلیان کی تیسری بیوی بننے سے پہلے ننگے جسم کی ماڈلنگ کرتی تھی۔ جاپان اور برطانیہ میں آئے دن سیاستدان مالی اور جنسی سکینڈلز میں پکڑے جاتے ہیں۔ مگر ان واقعات سے ان ملکوں کی قومی سلامتی پر کوئی حرف نہیں آتا۔ کوئی یہ راگ نہیں الاپتا کہ یہ ناکام ریاست ہے یا یہ ملک ٹوٹ جائے گا بلکہ اس طرح کی بحثیں ملک، جمہوریت اور صحتمند معاشرے کے لیے بہت مفید ہیں۔ یہ تب ہی ممکن ہے اگر سیاست اور سیاستدانوں کو صحیح تناظر میں دیکھا جائے۔

پاکستان میں تو ویسے ہی سیاست کو سات خون معاف کر دینے چاہئیں۔ جس ملک میں اس کی تاریخ کے آدھے وقت فوج حکمران رہی ہو، وہاں سیاست کو کیسے گالی دی جا سکتی ہے۔ جنہیں ہم سیاستدان کہہ کر تھوکتے ہیں، زیادہ تر وہ لوگ ہیں جنہیں مختلف ادوار میں ایجنسیوں نے بڑی محنت کے بعد چنا ہوتا ہے تاکہ وہ ان کے ایجنڈے پر کاربند رہیں اور سیاسی عمل کو پنپنے نہ دیں۔ ان میں سے کچھ لوگ جب نیک بننے کی کوشش کرتے ہیں تو ہم صحافی ان کو ان کا مکروہ ماضی یاد دلا کر اتنے پتھر مارتے ہیں کہ وہ بیچارے یا تو سیاست چھوڑ دیتے ہیں یا دوبارہ اسٹیبلشمنٹ کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں۔ تینوں بڑی جماعتیں، مسلم لیگ ن اور ق اور پیپلز پارٹی یا تو فوج کی تخلیق شدہ ہیں یا ان کے قائدین نے مارشل لاء کی کوکھ سے جنم لیا ہے، مگر اس کے باوجود مختلف ادوار میں سب نے اپنی بساط، عقل اور حالات کے مطابق ملک و معاشرے کی بھلائی کے لیے کاوشیں کی ہیں۔

اس سب کے لیے سیاست کی افادیت کے بنیادی فلسفے پر اعتقاد ضروری ہے۔ ضروری نہیں کہ ہمارے ہاں عمومی طور پر پائی جانے والی سیاست اور اس سے وابستہ کردار اور جماعتوں کے متعلق جو آراء پائی جاتی ہیں وہ صحیح ہوں۔ ضروری نہیں کہ سیاست کا مطلب مال بنانا اور طاقت کا حصول ہو۔ ضروری

www.freepdfpost.blogspot.com

!!all!!urdupdf!!novels!!blogspot!!com!!

[illegible]

ہیں کہ یہ سیاستدان [illegible]

[illegible] اور پرچموں سے وفاداریاں بدلتا ہے۔

سیاست کی ایک بنیادی صفت یہ ہے کہ وہ ایسا نظام مہیا کرے جس میں عوام کو شراکت کا احساس ہو۔ ان کو لگے کہ جو کچھ ہو رہا ہے ان کی مرضی سے ہو رہا ہے۔ سیاستدان وہ شخص ہے جس نے اپنے آپ کو عوام کے سامنے پیش کیا ہے کیونکہ ان سے کردار اور اہلیت میں بہتر ہے اور ان کی دی ہوئی طاقت کو ان کی بھلائی کے لیے استعمال کرے گا اور ہر انسان کو یہ حق ہے کہ اس کے کردار کے متعلق جانچ پڑتال کر سکے۔ سیاسی عمل یہ نہیں ہے کہ کس سیاستدان نے کس وقت کیا اور کیوں کیا بلکہ یہ ہے کہ اس کے کام سے عوام کے مسائل کا کیا تعلق ہے۔ سیاست عوامی مسائل کے متعلق ہے نہ کہ سیاسی بیانات سے!

ہم پر یہ لازم ہونا چاہیے کہ ہم سیاسی جماعتوں اور سیاستدانوں کو یہ موقع دیں جس میں سیاسی عمل اور ارتقا جاری رہے۔ ایسا سیاسی کلچر پروان چڑھے جس میں ہم سیاستدانوں پر جائز تنقید بھی کرتے رہیں اور سیاسی نظام بھی نہ لڑھکے۔ جس میں سیاستدانوں اور جماعتوں کو عوام ووٹ کے ذریعے ہی لے کر آئیں اور ووٹ کے ذریعے ہی تبدیل کریں۔ جس میں رائے عامہ اتنی مضبوط ہو کہ سیاسی جماعتیں وراثتی اور موروثی امیدواروں کی جگہ سیاسی کارندوں کو فروغ دیں اور اپنی جماعت کے اندر بھی جمہوری کلچر نافذ کریں۔ جس میں کاروباری اور کرپٹ مافیا کا کردار کم ہو اور عام آدمی بھی سیاست میں ترقی کر سکے۔ جس میں آزاد الیکشن کمیشن سب کے لیے مساویانہ موقع فراہم کر سکے اور عوام میں ووٹ کی طاقت کا ادراک بڑھ سکے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ایسی بحث و مباحثہ یا Informed public discourse ہو جس میں عوام اچھے اور برے کا بہتر تعین کر سکیں۔

ایسی پڑھی لکھی Debate تب ہی ممکن ہے جب ہمارے سیاسی رپورٹر یا تجزیہ نگار (جو کہ آج کے تجزیہ باز صحافیوں سے مختلف ہیں) کو اپنے موضوع کا بہتر ادراک ہو اور یہ سب تب ہی ممکن ہے جب نئے تجزیہ نگاروں کو وہ مواد مہیا ہو جس سے وہ کل کے واقعات جان کر آج اور آنے والے کل کے متعلق بہتر بات کہہ سکیں۔ رؤف کلاسرا کی یہ کاوش آج کے ان تجزیہ نگاروں کے لیے بہت مفید ہے جن کے پاس رائے عامہ کو تبدیل کرنے کی طاقت تو بہت ہے مگر سیاست کو سمجھنے کا تجربہ، جماعتوں کے اسرار و رموز، مقامی سیاست کے مسائل اور علاقائی تفریقوں سے آگاہی بہت کم ہے۔

رؤف نے یہ سیاسی خاکے لکھ کر ان شخصیات کے اندر جھانکنے کا جو موقع فراہم کیا ہے وہ [illegible] نہیں ہے کہ ہم رؤف کے تجزیے سے اتفاق کریں مگر رؤف نے سیاست کے [illegible] میں [illegible] کے لیے چیلنج دیا ہے۔ جس کسی میں [illegible] میں شریک ہو سکتا ہے۔

مجھے یہ خاکے پڑھ کر احساس ہوا کہ جو چوہدری نثار یا چوہدری شجاعت رؤف کے خاکوں میں ابھرے ہیں ان کو تو میں جانتا ہی نہیں تھا کیونکہ مصنف نے ان کو اپنے زاویے سے دیکھا ہے۔ شاید سیاسی صحافت کا بھی سب سے بڑا سچ یہ ہے کہ ایک ہی منظر اور کردار کی کئی کہانیاں ہوتی ہیں۔ اسی لیے ان خاکوں کا عنوان "ایک سیاست کئی کہانیاں" بہت موزوں ہے۔ کسی کے پاس سچائی کی ٹھیکیداری نہیں اور یوں ہی چھوٹی کہانیوں سے ایک بڑی کہانی ابھرتی ہے جو حقیقت کے قریب تر ہوتی ہے۔

عامر متین

ڈی ایچ اے، اسلام آباد

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

چوہدری شجاعت حسین

مجھے چوہدری شجاعت حسین سے ملنے کا شوق اس وقت ہی پیدا ہو گیا تھا جب اڈیالہ جیل میں قید یوسف رضا گیلانی اور اسلام آباد کے سب سے مہنگے ترین علاقے ای سیون سیکٹر میں واقع اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں بات بات پر مسکراتے اور قہقہے لگاتے سید مشاہد حسین نے مجھے ایک ہی بات بتائی کہ جب ان دونوں کو 12 اکتوبر 1999ء کی فوجی بغاوت کے بعد گرفتار کیا گیا تو جو شخص ان کے گھر سب سے پہلے اپنی جیبوں میں پیسے ڈال کر ان کے بیوی بچوں کی خیریت دریافت کرنے گیا تھا وہ اور کوئی نہیں چوہدری شجاعت تھا۔

پتہ نہیں کیوں میرے ذہن میں چوہدری شجاعت کا امیج ایک ایسے سیاسی گاڈ فادر کا سا بن گیا تھا جو مشکل وقت میں اپنے دوستوں اور دشمنوں کی مدد کرنے کے لیے ہر وقت تیار تھا۔ شاید چوہدری صاحب بھی ماریو پوزو کے ناول گاڈ فادر کے ڈان کورلیون کی طرح اپنے اندر ایک ایسی جبلت لے کر پیدا ہوئے تھے جس کو اس بات کا احساس تھا کہ اپنے سیاسی مخالفین کو جیتنے کا سب سے بہتر موقع وہ تھا جب وہ کسی بہت بڑی مصیبت کا شکار تھے۔ کہنے کو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ انہیں یوسف رضا گیلانی کے گھر والوں کی مصیبتوں کا اس لیے بھی علم تھا کیونکہ وہ خود پرویز الٰہی کے ساتھ اسی اڈیالہ جیل میں قید و بند کی صعوبتیں اٹھا چکے تھے۔ یہ بھی تو کہا جا سکتا ہے کہ جنرل مشرف کے ساتھ مل کر تو انہوں نے گیلانی کو

www.freepdfpost.blogspot.com

!!!allurdupdfnovels!!!blogspot!!!com!!!

جیل بھجوایا تھا لہٰذا ان سے بہتر کون جانتا تھا کہ ان کے قیدی کے گھر میں اب پیسوں کی کمی تھی۔

جب 23 اپریل 2003ء کو میں ایف ایٹ مرکز میں واقع چوہدری شجاعت کی رہائش گاہ کے باہر پہنچا تو وہاں قیمتی گاڑیوں کی لمبی قطاریں دیکھ کر کسی بھی شخص کا پہلا تاثر یہی ہوتا کہ اس ملک کا اصل حکمران جنرل مشرف نہیں بلکہ جو اس گھر میں رہتا تھا۔ بہت بڑے ڈرائنگ روم میں ہر قسم کے سیاسی چہرے دیکھے جاسکتے تھے۔ وہاں کوئی وزیر بننا چاہ رہا تھا تو کوئی پارلیمانی سیکرٹری اور کچھ نہیں تو اسٹینڈنگ کمیٹی کا چیئرمین ہی لگ جائے۔ چوہدری شجاعت کی توجہ حاصل کرنے کے لیے ہر پانچ منٹ بعد اس سیاسی مجمعے میں سے کوئی اچانک آگے نکل کر اپنے نتھنے پھلائے زور سے اپوزیشن کے خلاف تقریر کرنا شروع کر دیتا کہ بھلا جنرل مشرف کے لیگل فریم ورک آرڈر کی مخالفت کرنے کی کیا تک تھی۔

میں خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھا ان سیاسی لوگوں کی مضحکہ خیز باتیں سن رہا تھا کہ کسی نے آ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور مجھے اپنے ساتھ لے کر ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گیا اور بولا کہ میں چوہدری شجاعت کا انتظار کروں۔ ابھی مجھے بیٹھے کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور چوہدری شجاعت اندر داخل ہوئے۔ میں کھڑا ہوا تو وہ بڑی عزت و احترام سے ملے۔ ان کا خیال تھا کہ میں شاید موجودہ سیاسی صورتحال پر ان کا کوئی روٹین میں انٹرویو کرنا چاہ رہا تھا۔ میں مسکرایا اور انہیں بتایا کہ چوہدری صاحب یہ انٹرویو تو چلتے رہتے ہیں اور مجھ سے بہت بہتر صحافی یہ کام زیادہ اچھے طریقے سے کر رہے تھے۔ میرے ذہن میں کچھ اور بات تھی۔ میرے خیال میں لوگ جاننا چاہتے ہوں گے کہ آخر آپ ایک عام سیاسی خاندان سے ایک سیاسی گاڈ فادر کیسے بنے۔ وہ شخص جس کے گھر کو 12 اکتوبر کی رات فوج نے [illegible] گھیرے میں لے لیا تھا اور [illegible] آمیز انداز میں گھر کے مکینوں کی تلاشی لی گئی تھی وہ بعد میں کیسے اس پوزیشن میں آ گیا تھا کہ جنرل مشرف جیسا بندہ اس سے مشورے کے بغیر [illegible]

چوہدری شجاعت مسکرائے اور انہوں نے اپنے بارے میں [illegible] بات تھی کہ مجھے [illegible] انہوں نے اس [illegible]

چوہدری شجاعت تھوڑی دیر کے لیے چپ ہوئے اور بولے کہ اس کا مطلب ہے آپ کو خصوصی ٹائم دینا پڑے گا اور یہ گفتگو تو پھر یہاں بیٹھ کر نہیں ہو سکتی۔ تو کیا خیال ہے کل سے کسی اور جگہ نہ ملا جائے۔ ابھی میں کوئی جواب دینے ہی والا تھا کہ اس وقت پیپلز پارٹی کے ایک باغی ایم این اے رضا حیات ہراج کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ مجھے نہیں پہچانتے تھے لہٰذا انہوں نے کھل کر چوہدری شجاعت کو بتایا کہ کیسے پیپلز پارٹی والوں کو ڈنڈا دے رکھا تھا۔ چوہدری شجاعت نے ہاں ہوں میں جواب دیا۔

اگلے دن جب میری ملاقات چوہدری شجاعت سے منسٹرز انکلیو میں رہائش پذیر وزیر صحت نصیر خان کے گھر پر ہوئی تو پھر چوہدری شجاعت نے اپنی زندگی کے اہم رازوں سے پردہ اٹھانا شروع کیا اور ایک نئی کہانی کی ابتدا ہوئی۔

چوہدری شجاعت نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایک دن وہ بھی سیاست کے میدان میں داخل ہوں گے۔ ان کے باپ چوہدری ظہور الٰہی اور ان کے خاندان کی جتنی بھی فیکٹریاں تھیں وہ ذوالفقار علی بھٹو نے 1970ء میں نجکاری کے نام پر اپنے قبضے میں لے لی تھیں۔ یوں بھٹو اور چوہدری خاندان میں دشمنی کی بنیاد پہلے ہی پڑ چکی تھی۔ جب جنرل ضیاء نے بھٹو کا تختہ الٹا تو چوہدری خاندان نے آگے بڑھ کر اس فوجی ڈکٹیٹر کو اپنے گلے سے لگایا کیونکہ دشمن کا دشمن ہمیشہ آپ کا دوست ہوتا ہے۔ ان تینوں یعنی بھٹو، ضیاء اور چوہدری ظہور الٰہی کو پتہ نہیں تھا کہ بہت جلد ان کے خاندانوں میں ایک ایسی مستقل دشمنی کی بنیاد پڑنے والی تھی جس کی بازگشت 27 سال بعد بھی اکتوبر 2007ء میں اس وقت سنی گئی جب بے نظیر بھٹو نے یہ الزام لگایا کہ چوہدری پرویز الٰہی 18 اکتوبر کی رات کراچی میں ہونے والے بم دھماکے میں ملوث تھے جس میں [illegible] پیپلز پارٹی [illegible]

[illegible]

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

[illegible] میں رکھا گیا جس میں ہماری [illegible] بھی تھی اور [illegible]
[illegible] کہ [illegible] بات [illegible]
[illegible] نواز شریف [illegible] اور [illegible] چوہدری شجاعت نے [illegible] اپنے [illegible]
کر لی تھی [illegible] جب [illegible] جیل میں گرفتار تھے سابق [illegible] آصف زرداری کا ایک پیغام لے کر ان کے پاس آئے کہ آپ نواز شریف کا ساتھ چھوڑ دیں اور اس کے بدلے میں پورا پنجاب ہم سے لے لیں۔ انھیں [illegible] ایک افسر بھی ان سے ملنے کے لیے آیا تھا جو یہ کہتا کہ آپ اپنی پارٹی کے اندر ایک فارورڈ بلاک بنا لیں۔ چوہدری شجاعت کو یہ بھی پیغام دیا گیا کہ آصف زرداری ان سے جیل میں آ کر ملاقات کر کے ڈیل کرنے کو تیار تھے لیکن شجاعت اور پرویز الٰہی نے پیپلز پارٹی کی حکومت سے جیل میں بیٹھ کر ڈیل کرنے سے انکار کر دیا۔

اس پر میں نے شجاعت سے پوچھا کہ اگر وہ نواز شریف کے اتنے ہی وفادار تھے تو انہوں نے 12 اکتوبر 1999ء کے بعد نواز شریف کا ساتھ چھوڑ کر جنرل مشرف کے ساتھ ڈیل کیوں کر لی تھی۔

شجاعت نے بڑی سختی سے میری اس بات کو مسترد کیا کہ نواز شریف کے دور اقتدار میں مزے لینے کے بعد انہوں نے برے دنوں میں ان کا ساتھ چھوڑ کر جنرل مشرف سے ہاتھ ملا لیا تھا۔

ان کے بقول نواز شریف نے جیل سے ہی انہیں، میاں اظہر، اعجاز الحق اور چند دوسرے لوگوں کو پارٹی سے نکال دیا تھا۔ اس لیے یہ کہنا غلط تھا کہ انہوں نے پارٹی چھوڑی تھی بلکہ حقیقت یہ تھی کہ انہیں پارٹی سے نکالا گیا تھا۔ شجاعت نے الٹا مجھ سے سوال کیا کہ لوگ یہ بات کیوں بھول جاتے ہیں کہ دراصل ان سب کو دھوکہ تو نواز شریف نے دیا تھا جو ایک فوجی جنرل سے ڈیل کر کے ملک چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

اپنے اور نواز شریف کے درمیان اندرونی اختلافات کی کہانی سناتے ہوئے شجاعت نے کہا کہ دراصل 1997ء کے بھاری مینڈیٹ نے ان کی شخصیت پر بڑا برا اثر ڈالا تھا۔ ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ وہ کوئی بہت بڑا کام کرنے کے لیے پیدا ہوئے تھے اور اس چکر میں انہوں نے ایسے کام شروع کیے تھے جن کا نتیجہ [illegible] تھا۔ جب 1997ء کے الیکشن کے فوراً بعد ایک ملاقات ہوئی [illegible] شجاعت [illegible] جس نے [illegible] ہو کر نواز شریف کو یہ بات

[illegible] شجاعت نے [illegible] کہا کہ [illegible] نواز شریف نے [illegible] ان کے [illegible] نواز شریف کی [illegible] شخصیت کی وجہ سے [illegible] اور احترام کرتے تھے۔ [illegible] جب وہ دوسری مرتبہ وزیراعظم بنے تو وہ [illegible] ہو چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ نومبر 1998ء میں نواز شریف کی سربراہی میں ایک میٹنگ اٹینڈ کرنے کے بعد شجاعت نے چوہدری پرویز الٰہی کو بتایا تھا کہ پی ایم ایل (ن) کی حکومت زیادہ دیر تک نہیں چلے گی۔

میرے تجسس پر چوہدری شجاعت نے انکشاف کیا کہ اس میٹنگ کے شروع ہونے سے پہلے نواز شریف نے وہاں موجود تمام لوگوں سے جن میں انٹیلی جنس ایجنسی کے سربراہان موجود تھے قرآن پر حلف لیا تھا کہ وہ اس میٹنگ کی کسی بات کو باہر نہیں بتائیں گے۔ اس میٹنگ میں بہت ہی خوفناک قسم کے فیصلے کیے گئے تھے۔

میں بڑا حیران ہوا کہ بھلا ایسے وہ کون سے فیصلے تھے جنہوں نے چوہدری شجاعت حسین جیسے بندے کو بھی ہلا کر رکھ دیا تھا۔

چوہدری شجاعت کچھ دیر سوچتے رہے کہ وہ مجھے بتائیں یا نہ بتائیں۔ خاصی دیر بعد انہوں نے محض ایک اشارہ دیا کہ اس میٹنگ کے فوراً بعد پنجاب اور کراچی میں ماورائے عدالت قتل ہونا شروع ہو گئے تھے۔

شجاعت جو اس وقت وزیر داخلہ تھے، ان کے بقول انہوں نے غیر قانونی فیصلوں کے خلاف مزاحمت کی تھی۔ ان کا یہ خیال تھا کہ چاہے مجرم ہی کیوں نہ ہو، اس کو بھی عدالت میں اپنے آپ کو دفاع کرنے کا حق دینا چاہیے۔ شجاعت کو اس بات کا دکھ تھا کہ وہ حافظ قرآن کو جیل سے نکال کر ایک جعلی پولیس مقابلے میں گولی مار دی گئی تھی۔

یہ علیحدہ بات ہے کہ چوہدری شجاعت ان فیصلوں کے خلاف تھے، لیکن ان کی وزارت ان فیصلوں کی [illegible] بھی کر رہی تھی۔

جب میں نے چوہدری شجاعت کی آواز میں افسردگی محسوس کی تو پھر میں نے ان سے پوچھ لیا کہ اگر وہ سارے فیصلے انہیں غلط لگتے تھے تو انہوں نے بطور احتجاج وزارت داخلہ سے استعفیٰ کیوں

www.freepdfpost.blogspot.com

!!!allurdupdfnovels!!!blogspot!!!com!!!

کہیں سے ہوا تھا؟

چوہدری شجاعت نے سیدھا میری آنکھوں میں دیکھا اور بولے کہ رؤف صاحب ایسا ممکن نہیں تھا۔ میں نواز شریف کی سربراہی میں ہونے والی میٹنگز میں واحد شخص ہوتا تھا جو کھل کر نواز شریف کے اس طرح کے غلط فیصلوں کے خلاف مزاحمت کرتا تھا۔ یہ میری وجہ سے ہی ہوا کہ کبھی پھر اس طرح کے فیصلے نہ ہو سکے جن سے ان کی اپنی حکومت اور ملک کو شدید نقصان ہوتا۔ شجاعت کے بقول اب نواز شریف ملک میں اپنی مرضی سے عدالتیں قائم کرنا چاہ رہے تھے اور یہ بات کیبنٹ کے سامنے لائی گئی تو انہوں نے اس کو سارے ایجنڈے سے ہی ہٹا دیا۔ تاہم نواز شریف ڈٹے رہے اور انہوں نے اگلی کیبنٹ میٹنگ میں اس کی منظوری لے لی۔ اس پر چوہدری شجاعت نے نواز شریف کو خبردار کیا تھا کہ ایک دن ہم سب کو ان عدالتوں کا سامنا کرنا پڑے گا لہٰذا بہتر ہے کہ ہم ان کے قیام سے گریز کریں اور پھر ایک دن جنرل مشرف نے نواز شریف کی پیشی ہوئی اسی ایک عدالت سے انہیں عمر قید دی تھی۔

شجاعت کے بقول 12 اکتوبر کی بغاوت سے پہلے نواز شریف جو خوفناک فیصلہ کرنا چاہ رہے تھے وہ یہ تھا کہ جو بھی سرعام اسلحہ کی نمائش کرے گا اسے سزائے موت دی جائے گی۔ اس کام کے لیے انہوں نے فوجیوں کو استعمال کرنا تھا اور 14 اکتوبر 1999ء کو ڈیفنس کی کیبنٹ کمیٹی کی میٹنگ طلب کر لی گئی تھی جس میں یہ فیصلہ کیا جانا تھا۔ تاہم دو دن پہلے ہی ان کا اپنا تختہ الٹ دیا گیا۔ شجاعت کے ذمے ایک کام لگایا گیا تھا کہ وہ اس میٹنگ میں تمام ملٹری کمانڈروں کو اس منصوبے کے بارے میں بریف کریں گے اور آرمی سے کہا جائے گا کہ وہ نہ صرف اس معاملے میں ان سے تعاون کریں بلکہ سرعام اسلحہ کی نمائش کرنے والے لوگوں کو پکڑ کر ان کو سزائیں دی جائیں۔ شروع میں چوہدری شجاعت نے اس پلان کی بڑی مخالفت کی۔ ان کے بقول نہ صرف اس قانون کا غلط استعمال ہوگا بلکہ یہ حکومت کے لیے بھی بہت مشکلات پیدا کرے گا۔ تاہم، شجاعت کو کہا گیا کہ وہ 12 اکتوبر کو یہ سارا پلان کیبنٹ کمیٹی برائے دفاع میں پیش کرنے سے پہلے وزیراعظم سے ڈسکس کر لیں۔ اس میٹنگ میں جنرل پرویز مشرف نے بھی شرکت کرنی تھی اور چاروں صوبوں کے وزرائے اعلیٰ کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ تاہم سب لوگ اس وقت بڑے حیران ہوئے جب غیر متوقع طور پر سندھ کے وزیراعلیٰ غوث علی شاہ نے وزیراعظم کے حکم کے باوجود اس میٹنگ میں شرکت نہیں کی تھی کہ آج بھی غوث علی شاہ پر یہ الزام لگتا ہے کہ انہوں نے فوجی بغاوت کی توقع کر لی تھی اور وہ اس میٹنگ میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ شجاعت کے بقول ان کے لیے حیرانی کی بات یہ تھی کہ اس دن نواز شریف بہت خاموش تھے اور پریشانی واضح طور پر ان کے چہرے پر عکس ہوئی تھی جیسے ان کے ذہن پر کوئی بہت بڑا بوجھ ہو۔ یہ میٹنگ کوئی دو بجے کے قریب ختم ہوئی اور تمام لوگ نواز شریف کے ساتھ پرائم منسٹر ہاؤس چلے گئے تاہم چوہدری شجاعت وہاں سے نکل گئے کیونکہ انہوں نے جاپانی سفیر کے ساتھ لنچ کرنا تھا۔

اس مرحلے پر چوہدری شجاعت تھوڑی دیر کے لیے رکے، ایک بڑا گہرا سانس لیا اور بولے کہ اگر 12 اکتوبر والے دن وہ وزیراعظم کے ساتھ چلے جاتے تو وہ بھی وہاں بہت سارے دوسرے لوگوں کی طرح فوجیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو جاتے جو وہاں جنرل ضیاء الدین بٹ کو نیا آرمی چیف بنانے کی تقریب میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے۔

میں نے چوہدری شجاعت سے یہ پوچھ ہی لیا کہ آخر نواز شریف نے جنرل مشرف کو آرمی چیف کے عہدے سے ہٹانے کا فیصلہ کیوں کیا تھا؟

بغیر کسی ہچکچاہٹ کے شجاعت نے جواب دیا کہ نواز شریف ان دنوں غیر سیاسی لوگوں کے گھیرے میں آئے ہوئے تھے اور انہوں نے ہی ان سے وہ احمقانہ فیصلے کروائے تھے۔ کیبنٹ کے کسی ایک ممبر کو بھی اس فیصلے کی بھنک نہیں پڑنے دی گئی تھی۔ اور تو اور، شجاعت بھی جنرل مشرف کو ہٹائے جانے کے اس فیصلے سے لاعلم تھے۔ شجاعت کے بقول شریف برادران کا کچھ مزاج ہی ایسا تھا کہ وہ بڑے بڑے فیصلے بغیر سوچے سمجھے یا اپنے قریبی سیاسی ساتھیوں سے مشورہ کیے بغیر کر گزرتے تھے۔ چوہدری شجاعت کا خیال تھا کہ اگر نواز شریف نے مشرف کو ہٹانا ہی تھا تو اگر وہ اپنے قریبی ساتھیوں سے مشورہ کرتے تو اس سارے کام کو بڑے بہتر انداز میں کیا جا سکتا تھا۔ شجاعت کا اپنا خیال تھا کہ سری لنکا سے واپسی پر اگر مشرف کو بلا کر یہ کہا جاتا کہ انہیں آرمی چیف کے عہدے سے ہٹا دیا گیا ہے تو کوئی آسمان نہ گر پڑتا۔ شجاعت کے ذہن میں کوئی ذرہ برابر بھی شک نہیں تھا کہ جنرل مشرف کے پاور میں آنے کا ذمہ دار اور کوئی نہیں، نواز شریف خود تھے۔ شجاعت اکثر نواز شریف کو بتایا کرتے کہ آپ فوجی

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

[illegible] زیادہ عمل دخل ہو گیا کریں۔ ایسی بات [illegible] پیدا کر سکتے ہیں

شجاعت نے مجھے 1993ء کا ایک واقعہ بتایا جب نواز شریف جنرل آصف نواز کی اچانک موت کے بعد نئے آرمی چیف لانے کی کوشش کر رہے تھے۔

چوہدری شجاعت کو پرائم منسٹر ہاؤس بلایا گیا جہاں چوہدری نثار علی خان اور جنرل مجید ملک پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے اور نئے آرمی چیف کے بارے میں گفتگو جاری تھی۔ لیفٹیننٹ جنرل رحمان کو بھی آرمی چیف بنانے کی بات ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ عبدالوحید کاکڑ اور جنرل اشرف کو بھی ممکنہ امیدوار سمجھا جا رہا تھا۔ جب باری آنے پر چوہدری شجاعت کی رائے طلب کی گئی تو شجاعت نے وزیراعظم کو کہا کہ آپ بلا سے آرام سے پانچوں نام لکھ کر غلام اسحٰق خان کو بھیج دیں اور آخری فیصلہ ان کو کرنے دیں۔ شجاعت نے نواز شریف کو بتایا کہ جو بھی آرمی چیف بنے گا وہ سیدھا ان کو سلیوٹ مارنے کے لیے وزیراعظم ہاؤس ضرور آئے گا اس لیے انہیں اس بات پر پریشان نہیں ہونا چاہیے کہ اگلا آرمی چیف کون ہوگا۔

میں نے شجاعت سے پوچھ لیا کہ انہوں نے نواز شریف اور شہباز شریف دونوں کے ساتھ مل کر کام کیا ہوا تھا۔ ان کے خیال میں دونوں بھائی کس مزاج اور طبیعت کے آدمی تھے۔

شجاعت کے بقول نواز شریف زیادہ مہذب اور ہر ایک کے ساتھ بڑی عزت سے پیش آتے تھے۔ تاہم ان کی ساری شخصیت 1997ء کے الیکشن میں بھاری مینڈیٹ لینے کے بعد بدل گئی تھی۔ نواز کے برعکس شہباز شریف بہت سخت اور بیشتر آفیسرز کی بڑی توہین کرتے تھے۔ تاہم، چوہدری شجاعت کا میاں شریف کے بارے میں بڑا مختلف نقطۂ نظر تھا۔ ان کے خیال میں شریف برادران کے والد صاحب ان دونوں بھائیوں کے فیصلوں میں سمجھداری لانے کے لیے بڑا اہم کردار ادا کرتے تھے۔ کئی اہم موقعوں پر میاں شریف نے چوہدری شجاعت کی بڑی مدد کی جب انہوں نے ان دونوں بھائیوں کے غلط فیصلوں کو رکوانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ورنہ ان کی حکومت کے لیے بڑے شدید مسائل پیدا ہو سکتے تھے۔ میاں شریف خاندان کے بڑے کی طرح اپنی ایک رائے دیا کرتے اور یہ دونوں بھائی ان کا احترام کرتے تھے۔

تاہم مجھے اس کی طرف پر بات کھٹکتی رہی تھی کہ شریف خاندان کے کافی قریب ہونے کے باوجود بھی چوہدری شجاعت اور جنرل مشرف میں دوستی کیسے ہو گئی تھی اور دونوں 12 اکتوبر کے بعد اس ملک کے سیاہ و سفید کے مالک بن گئے۔

شجاعت نے اس راز سے بھی پردہ اٹھایا۔

دراصل چوہدری شجاعت ڈیفنس کمیٹی آف کیبنٹ کی میٹنگز میں بطور وزیر داخلہ شریک ہوتے تھے۔ یہ کئی دفعہ ہوا کہ جنرل مشرف اور چوہدری شجاعت کے نیشنل سکیورٹی کے معاملات پر خیالات تقریباً ایک جیسے پائے گئے جس کی وجہ سے ان دونوں میں فطری طور پر ہم آہنگی بڑھی، خصوصاً کارگل کے معاملے میں!

جونہی چوہدری شجاعت نے کارگل کا ذکر کیا تو میرے ذہن میں جنرل مشرف اور نواز شریف کی جاری لفظوں کی جنگ سامنے آ گئی۔ نواز شریف یہ مسلسل کہتے تھے کہ جنرل مشرف نے ان کو بتائے بغیر کارگل کا محاذ شروع کیا جس سے ہندوستان اور پاکستان کی فوجیں تقریباً جنگ لڑنے کے قریب آ گئی تھیں۔ سب سے بڑھ کر پاکستان اور انڈیا کے درمیان جاری امن مذاکرات کو شدید دھچکا لگا اور پوری دنیا میں پاکستان اکیلا رہ گیا جبکہ جنرل مشرف ہمیشہ یہ دعویٰ کرتے رہے کہ کارگل کی جنگ باقاعدہ نواز شریف سے اجازت لے کر شروع کی گئی تھی۔ میں نے اس کو بہترین موقع جانا اور شجاعت سے پوچھ لیا کہ کیا ان کے خیال میں نواز شریف کو کارگل کے مسئلے پر اندھیرے میں رکھا گیا تھا اور ان کو بتائے بغیر ہندوستان سے اتنی بڑی جنگ چھیڑنے کی کوشش کی گئی۔

چوہدری شجاعت نے فوراً اس تاثر کی تردید کی اور بولے کہ نہیں، نواز شریف کو اس معاملے کا سب پتہ تھا۔ اس بات کا ثبوت دینے کی غرض سے شجاعت نے مجھے بتایا کہ ایک دفعہ ایک بریگیڈیئر کارگل پر بریفنگ دے رہے تھے۔ ایک مرحلے پر جنرل مشرف، جو اس میٹنگ میں شریک تھے، نے یہ محسوس کیا کہ نواز شریف کو اس بریگیڈیئر کی باتیں سمجھ نہیں آ رہی تھیں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور بریگیڈیئر کے ہاتھ سے اسٹک لے کر جنرل مشرف نے کارگل آپریشن کی تمام تفصیلات بتانا شروع کر دیں۔

اچانک نواز شریف نے بڑی اونچی آواز میں کہا کہ جنرل تم نے تو یہ ساری باتیں مجھے کبھی نہیں

www.freepdfpost.blogspot.com

!!!allurdupdfnovels!!!blogspot!!!com!!!

یہ کہیں۔ اس پر جنرل مشرف رک گئے۔ انہوں نے اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی ڈائری نکالی اور ان تمام میٹنگز کی تفصیل پڑھنا شروع کر دی جن میں انہوں نے نواز شریف کے ساتھ کارگل پر تفصیل سے گفتگو ہوئی تھی۔ نواز شریف کا خیال تھا کہ اس میٹنگ میں موجود اس کے تمام وزراء ان کا ساتھ دیں گے۔ سرتاج عزیز اس وقت خارجہ منسٹر تھے اور شجاعت وزیر داخلہ ان کے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔ سب لوگ چپ رہے۔

تاہم جب وہاں میں گرما گرمی ہوئی تو شجاعت نے کہا کہ اب چونکہ مسئلہ بہت بگڑ گیا ہے لہٰذا اس میں بیٹھے تمام شرکاء کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے اختلافات بھلا دیں اور پریس کو ایک مشترکہ بیان جاری کریں جس سے یہ لگے کہ کارگل پر سول اور عسکری لیڈرشپ کا مشترکہ پلان تھا۔

تاہم نواز شریف نے چوہدری شجاعت کی یہ بات نہیں مانی بلکہ شجاعت کی اس بات سے نواز شریف ناراض ہو گئے اور جب وہ میٹنگ سے اٹھ کر جانے لگے تو انہوں نے شجاعت سے ہاتھ ملانا بھی مناسب نہ سمجھا۔ یہ چوہدری شجاعت کے لیے بڑا واضح پیغام تھا کہ وہ کارگل کے مسئلے پر جنرل مشرف کی حمایت کرنے پر ان سے خفا تھے۔

اس موقع پر میں نے شجاعت سے پوچھا کہ جنرل مشرف کی حکومت کا سب سے بڑا فائدہ تو ان کے خاندان کو ہوا تھا اور جس طرح وہ وزیر اعظم نواز شریف کی مخالفت کر کے جنرل مشرف کی حمایت کرتے رہے تھے اس کا انہوں نے بعد میں پورا پورا فائدہ بھی اٹھایا تھا۔

تاہم چوہدری شجاعت میری اس بات سے متفق نہیں ہوئے اور بولے کہ جب اس ملک میں مارشل لاء لگا تو جنرل مشرف کے دور حکومت میں انہیں اور ان کے خاندان کو سب سے زیادہ سیاسی انتقام کا نشانہ بنایا گیا۔ وہ بتانے لگے کہ جونہی بغاوت ہوئی، ایک آرمی میجر لاہور میں واقع ان کے گھر پر پہنچا۔ اس نے ان کی خواتین کے ساتھ بدتمیزی کی اور ان سب کو ایک کمرے میں بند کر دیا۔ شجاعت حسین کی فیملی کو تنگ کرنے کی غرض سے ایک بہت بڑے لیول کی ٹیم ان کے گھر بھیجی گئی تھی کہ وہ جا کر ان کے باتھ روم تک چیک کریں تاکہ یہ اندازہ لگایا جائے کہ وہ کتنے امیر لوگ تھے۔ اس پر اکتفا نہ کیا گیا اور انتہائی احمقانہ قسم کے سوالات کے جواب دینے کے لیے کہا گیا کہ ان کا کچن، باتھ روم، فلش اور اس طرح کی دیگر چھوٹی موٹی چیزیں کیسے اور کیوں کر بنی تھیں۔ باتھ روم میں پڑی ہوئی چیزوں کی تفصیلات فراہم کرنے کو کہا گیا تھا۔ چوہدری شجاعت نے بڑے تحمل سے کام لیتے ہوئے ان سوالات کے جواب دیے۔ تاہم اگلے روز ایک اور ٹیم وہاں پہنچ گئی جس کے ہاتھ میں وہ فارم موجود تھا اور انہوں نے باتھ روم اور کچن چیک کرنا شروع کر دیے کہ کیا واقعی ان کو صحیح جواب دیے گئے تھے۔

جب چوہدری شجاعت کے گھر پر اس طرح کا چھاپہ مارا گیا تو انہوں نے پہلی دفعہ طارق عزیز کو ٹیلی فون کیا جو اس وقت جنرل مشرف کے ساتھ تھے۔ طارق عزیز نے مشرف سے پوچھا تو جنرل نے کہا کہ انہوں نے اس طرح کے کوئی آرڈرز جاری نہیں کیے۔ تاہم چوہدری شجاعت کی فیملی کے خلاف اس طرح کے ایکشن ہوتے رہے حتیٰ کہ ان کے بعد انہوں کاروبار و ملکیت پر۔

جب شجاعت نے طارق عزیز کا نام لیا تو میں نے ان سے پوچھا کہ اس کا مطلب یہ تھا کہ انہوں نے طارق عزیز کو استعمال کرتے ہوئے جنرل مشرف سے اپنے تعلقات استوار کر کے آنے والے دنوں میں اس ملک کے پہلے سیاسی گاڈ فادر کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔

طارق عزیز چوہدریوں کے اس وجہ سے بھی بڑے ممنون تھے کہ جب ایک سول سرونٹ کی حیثیت سے آصف علی زرداری ان سے شدید ناراض ہوئے اور انہوں نے ان کے گرد گھیرا تنگ کرنے کی کوشش کی تو ان کی چوہدریوں نے جان بچائی تھی۔ اب وقت آ گیا تھا کہ طارق عزیز چوہدریوں کے ان احسانات کا بدلہ چکاتے۔ تاہم چوہدری شجاعت اس بات سے انکاری تھے کہ طارق عزیز نے ان کو کوئی سیاسی رول دلوانے میں کوئی اہم کردار ادا کیا تھا۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے شجاعت نے انکشاف کیا کہ آپ طارق عزیز کی کیا بات کرتے ہیں۔ وہ تو میری جنرل امجد سے ایک میٹنگ بھی کرانے میں ناکام رہے تھے۔ یہ میٹنگ جنرل مشرف کے کہنے پر ہونی تھی کیونکہ مشرف چاہتے تھے کہ میں ان سے مل کر اپنے خلاف نیب میں رجسٹرڈ کیے گئے تمام کیسز کی وضاحت پیش کروں۔ طارق عزیز کی تمام تر کوششوں کے باوجود جنرل امجد سے ان کی میٹنگ نہیں ہو سکی تھی۔ شجاعت کے بقول جنرل مشرف کی حکومت نے دراصل The Most Wanted کے نام سے سیاستدانوں کی ایک فہرست تیار کی تھی جس کا نام 'Big Heads' رکھا گیا تھا۔ چوہدریوں کے خلاف مقدمات قائم کر کے انہیں ہراساں کرنے کا

www.freepdfpost.blogspot.com

!!!allurdupdfnovels!!!blogspot!!!com!!!

مقصد دراصل یہ تھا کہ ہم سے یہ ... [illegible] ... سمجھا جائے کہ اگر حکومت کے خلاف تحریک چلانے ... کی گئی تو حکومت کو معلوم ہونا چاہیے کہ انہیں بھی نہیں چھوڑا جائے گا۔

میں یہ جاننے میں دلچسپی رکھتا تھا اور اسی حیرانی کے عالم میں شجاعت حسین سے پوچھا کہ ان کی جنرل مشرف سے ملاقات کب ہوئی تھی؟ وہ بتانے لگے کہ دراصل انہوں نے 12 اکتوبر کے بعد جنرل مشرف سے ملنے کے لیے پیغام بھجوایا تھا کہ وہ اپنے خلاف بنائے گئے کیسز کی وضاحت کرنا چاہتے تھے۔ اس میٹنگ کے بعد ہی جنرل مشرف نے انہیں یہ کہا تھا کہ وہ جا کر جنرل امجد سے ملیں اور ساری باتیں ان کو بتائیں۔ جب جنرل امجد نے چوہدری شجاعت حسین سے ملنے سے انکار کر دیا تھا اور انہیں یہ پیغام دیا گیا کہ وہ عدالتوں کے ذریعے ہی اپنے آپ کو کلیئر کروائیں۔

اگرچہ چوہدری شجاعت حسین یہ بات چھپا گئے لیکن مجھے میرے قابل اعتماد ذرائع نے بتایا تھا کہ ان کی بار بار درخواستوں کے باوجود جنرل مشرف انہیں وقت دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ آخر طارق عزیز نے ان کی مشرف سے ملاقات کا ایک طریقہ ڈھونڈ نکالا۔ راولپنڈی کے پی سی ہوٹل میں کسی بڑے آدمی کے بچے کی شادی تھی جہاں جنرل مشرف نے بھی آنا تھا۔ طارق عزیز نے چوہدری پرویز الٰہی اور شجاعت کو چپکے سے وہیں بلوا لیا اور ان دونوں کو عین اس جگہ پر بٹھا دیا جہاں سے مشرف نے گزر کر جانا تھا۔ جونہی شادی کا فنکشن ختم ہوا مشرف اپنے باڈی گارڈز کے ساتھ وہاں سے نکلے تو یہ دونوں اچانک ان کے سامنے آ گئے۔ مجبوراً جنرل مشرف کو ان سے ملنا پڑا اور ان کے اصرار پر انہیں ملاقات کا وقت بھی دے دیا۔ تاہم جنرل مشرف نے انہیں یہ کہا کہ وہ جا کر جنرل امجد سے ملیں۔ یہ علیحدہ کمال ہے کہ جنرل مشرف نے جنرل امجد کو بھی فون کر کے نہیں کہا کہ وہ ان دونوں کو ملنے کا وقت دے دیں۔ ان کی اپنی مرضی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ چوہدری شجاعت اور پرویز الٰہی کی بار بار درخواستوں کے باوجود جنرل امجد نے بھی انہیں ملنے کا وقت نہیں دیا۔ جنرل امجد کا ان سے ملاقات سے انکار کر دینا ایک اتفاقیہ نہیں تھا کیونکہ چوہدری شجاعت اور پرویز الٰہی کے لیے ابھی مصیبت کھڑی ہونا اور امتحان آنا باقی تھا۔

ابھی ان دونوں کو NDFC کے قرضے [illegible] میاں آصف سعید کا یہ پیغام ملا کہ وہ ان کے گھر تشریف لائیں ... [illegible] ... وہ دونوں جب وہاں پہنچے [illegible]

آصف نے انہیں بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہا اور بڑے غرور سے بیچ میں انہیں بتایا کہ جناب یا تو آپ کاروبار کریں یا پھر سیاست۔ چوہدری شجاعت کی زندگی میں یہ دن بھی آنا تھا کہ انہیں ایک سرکاری افسر نے ایک آپشن دیا کہ سیاست اور کاروبار میں سے ایک کا فیصلہ کریں۔ چوہدری شجاعت نے اپنے آپ کو زندگی میں کبھی اتنا ذلیل محسوس نہیں کیا تھا۔ ایک لمحے کے بغیر وہ دونوں الٹے پاؤں میاں آصف سعید کے گھر سے باہر نکل آئے۔ میاں آصف سعید میں اتنا تکبر بھرا ہوا تھا کہ وہ ان کو گھر سے باہر چھوڑنے بھی نہیں آئے۔

چوہدری شجاعت نے ایک دفعہ پھر میری آنکھوں میں دیکھا اور مجھے کہا کہ ہم دونوں اتنی بڑی بے عزتی اس لیے برداشت کر گئے کیونکہ ہمیں پتہ تھا کہ یہ آصف سعید نہیں بلکہ ان کے پیچھے بیٹھے جنرل محمود اور جنرل امجد بول رہے تھے۔

اگرچہ چوہدری شجاعت نے تو مجھے یہ بات نہیں بتائی لیکن مجھے ان کے لہجے سے یہ احساس ضرور ہو گیا تھا کہ یہ وہ لمحہ تھا جب چوہدری شجاعت اور پرویز الٰہی نے سوچا ہو گا کہ میاں آصف سعید جیسے چھوٹے افسر کے ہاتھوں ذلیل ہونے سے بہتر تھا کہ جنرل محمود اور جنرل امجد کے اصل باس جنرل مشرف کے دربار میں حاضری دے کر اس ملک کا ایک بار پھر حصہ بنا جائے۔ اگر بندے نے ذلیل اور بے عزت ہونا ہی ہو تو آصف سعید، جنرل محمود اور جنرل امجد جیسے لوگوں سے کیوں ہوا جائے اور یوں شجاعت اور پرویز الٰہی نے بالکل صحیح فیصلہ کیا اور پھر کچھ عرصے بعد میاں آصف سعید جیسے لوگ اپنی پوسٹنگ اور ٹرانسفر کرانے کے لیے چوہدری شجاعت کے دربار میں ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔

چوہدری شجاعت ابھی بھی نواز شریف سے گلے شکوے کر رہے تھے کہ وہ کیسے اپنے تمام ساتھیوں کو چھوڑ کر رات کے اندھیرے میں ڈیل کر کے ملک سے باہر چلے گئے تھے۔

میں نے چوہدری شجاعت سے پوچھا کیا انہیں وہاں پہنچ کر نواز شریف نے انہیں فون کیا تھا کیا انہوں نے یہ کہا کہ 2002ء کے الیکشن میں اپنے پرانے سیاسی ساتھیوں کے ساتھ کیسا کیا تھا ان کے ساتھ پی ایم ایل کیو میں شامل ہونے ... [illegible] ... ان کو الیکشن میں ... چوہدری [illegible]

[illegible] ... شجاعت سے چاہتی تھیں

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

چوہدری شجاعت بڑے حیران ہوئے اور مجھ سے پوچھا کہ کس کی بات کر رہے ہیں۔ میں نے کہا اور انہیں کہا کہ پنجاب میں فخر امام، عابدہ حسین، انور سیف اللہ، سلیم سیف اللہ اور میاں اظہر جیسے بہت سارے سیاسی لیڈروں کی بات کر رہا ہوں جنہوں نے یہ الزامات لگائے تھے کہ انہیں جان بوجھ کر الیکشن میں ہرایا گیا تھا تاکہ چوہدری شجاعت اور پرویز الٰہی کی راہ ہموار ہو سکے اور وہ اپنی مرضی کی گیم کھیل سکیں۔ شجاعت نے میری بات بڑے دھیان سے سنی اور پھر بولے کہ یہ بالکل غلط بات تھی کیونکہ اگر وہ الیکشن جیتے تو آج وہ بھی حکومت کا حصہ ہوتے۔ شجاعت کا خیال تھا کہ ان سیاسی لوگوں میں سے کوئی ایک بھی اس کے لیے کوئی بہت بڑی تھریٹ نہیں تھا لہٰذا انہیں ہرانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

تاہم یہ بات بڑی واضح تھی جس کا اقرار اب چوہدری شجاعت نہیں کر رہے تھے کہ اگر میاں اظہر الیکشن جیت جاتے تو پھر یقیناً وہ پی ایم ایل کیو کے صدر ہونے کی حیثیت سے وزارت عظمیٰ پر اپنا حق جتاتے اور یوں چوہدری پرویز الٰہی کے لیے پنجاب میں وزارت اعلیٰ کا عہدہ لینے میں جہاں دقت پیش آتی وہاں اگر وہ وزیراعلیٰ بن بھی جاتے تو پنجاب سے ایک اور وزیراعظم جس کا تعلق بھی لاہور سے تھا، اس کی موجودگی میں شاید وہ اتنی آزادانہ حکومت نہ کر سکتے جو انہوں نے بعد میں کی۔ لہٰذا اس بات میں بڑی حد تک سچائی ہو سکتی ہے کہ چند لیڈروں کو جان بوجھ کر ہرایا گیا تاکہ پنجاب سے کسی وزیراعظم کو روکا جا سکے اور چوہدریوں نے بڑی خوبصورتی سے اپنی سیاسی گیم کھیلی اور ظفر اللہ جمالی جیسے کمزور شخص کو وزیراعظم بنا کر پنجاب پر اپنی گرفت مضبوط کی۔ یہی نہیں بلکہ جب ظفر اللہ جمالی کا کام ختم ہوا اور ان کی جگہ ہمایوں اختر خان نے آئی ایس آئی اور طارق عزیز کی مدد سے وزیراعظم بننے کی کوشش کی تو آخری لمحے میں چوہدری شجاعت جیسے زیرک سیاستدان نے میزان پر الٹ دی اور شوکت عزیز کو وزیراعظم بنوا دیا کیونکہ چوہدری برادران کسی قیمت پر یہ افورڈ نہیں کر سکتے تھے کہ پنجاب سے کوئی وزیراعظم بنے۔ ان کی یہ حکمت عملی بڑی کامیاب رہی اور 15 نومبر 2007ء کو جب قومی اور صوبائی اسمبلیوں کو توڑ کر نئے الیکشن کرانے کے لیے نئی نگران حکومت بنائی گئی تو اس وقت تک پرویز الٰہی اپنے آپ کو بڑی کامیابی سے ملک کا اگلا وزیراعظم ثابت کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ لیکن تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ بینظیر بھٹو ماری گئیں اور یوں ساری گیم پلٹ گئی۔

چوہدری شجاعت ابھی بھی باتیں کر رہے تھے اور میرا ذہن ان کا سیاسی کھیل سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے یہ بات سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ایک طرف تو چوہدری شجاعت یہ دعویٰ کر رہے تھے کہ 12 اکتوبر کے بعد ان کی فیملی کے ساتھ انتہائی توہین آمیز رویہ اختیار کیا گیا تھا۔ ان کے گھروں کے باتھ روم تک چیک کیے گئے۔ جنرل امجد جیسے لوگوں نے ان سے ملنے سے انکار کیا اور اگر کوئی کسر رہ گئی تھی تو میاں آصف جیسے بیوروکریٹ نے انہیں ذلیل کر کے پوری کر دی اور وہ پھر بھی جنرل مشرف کے حامی بن گئے۔ میرا اپنا ذاتی خیال ہے کہ یہ سارا کام جنرل مشرف کی ہدایت پر کیا جا رہا تھا تاکہ ان چوہدری برادران کے گلے میں رسی اس طرح ڈالی جائے کہ نہ صرف وہ خود جنرل مشرف کے لیے کام کرنے پر تیار ہو جائیں بلکہ اپنے جیسے سیاستدانوں کا ایک پورا ریوڑ ہانک کر ان کی شکارگاہ میں لے جائیں جنہیں استعمال کر کے وہ اس ملک پر حکومت کریں۔ بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ جنرل مشرف نے نیب کو استعمال کر کے نہ صرف چوہدری شجاعت بلکہ دیگر تمام سیاستدانوں کو نکیل ڈال کر اپنے اقتدار کے لیے استعمال کیا۔

چوہدری شجاعت نے شاید میرے ذہن میں گردش کرتے ان سوالوں کو پڑھ لیا تھا لہٰذا انہوں نے خود ہی مجھے کہا کہ میں نے جنرل مشرف کے اقتدار کی اس لیے حمایت کی تھی کیونکہ ان میں اور مشرف میں ایک چیز بڑی مشترک تھی کہ دونوں نیشنل سیکیورٹی کے بارے میں ایک ہی رائے رکھتے تھے۔ چوہدری شجاعت نے مشرف کے لیے کی جانے والی اپنی حمایت کے جواز ڈھونڈنے جاری رکھے اور مجھے بتایا کہ ماضی کے جرنیلوں کے برعکس جنرل مشرف نے مارشل لا نہیں لگایا تھا بلکہ انہیں یہ کام کرنے پر مجبور کیا گیا۔ تاہم، چوہدری شجاعت مجھے یہ بتانا نہیں بھولے کہ وہ ملک میں فوجی حکومت کے خلاف تھے۔ چوہدری صاحب کے خیال میں ماضی میں جتنے بھی مارشل لاء لگائے گئے وہ سب غلط تھے اور ان کے لیے ان تمام جرنیلوں کو ذمہ دار سمجھنا چاہیے جنہوں نے اپنے ذاتی مفادات کے لیے جمہوریت کی گاڑی کو پٹڑی سے اتارا۔ تاہم، ایک سمجھدار سیاستدان کی طرح چوہدری شجاعت میں بھی اتنی عقل باقی تھی کہ انہوں نے جنرل مشرف کو ہرگز اس فہرست میں شامل نہیں کیا جس میں جنرل ایوب، جنرل یحییٰ اور جنرل ضیاء کے نام تھے۔ چوہدری شجاعت کو یہ پتہ تھا کہ وہ تینوں جنرل تو مر چکے تھے لہٰذا وہ ان کا کچھ

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

نہیں پا سکتے تھے۔ تاہم جنرل اشرف نہ صرف زندہ تھے بلکہ چوہدریوں کے ساتھ مستقل رابطہ میں تھے۔ تاہم جنرل کی زندگی اور وردی کے ساتھ منسلک تھا۔

چوہدری کی ان جنرل کی زندگی اور وردی کے ساتھ منسلک تھا۔

پہلی دفعہ نہیں ہوا تھا کہ چوہدری شجاعت وردی میں ملبوس آرمی جرنیلوں سے متعارف ہو کر سیاست میں ترقی کی منزلیں طے کر رہے تھے کیونکہ انہوں نے باتوں باتوں میں یہ انکشاف کیا کہ کیسے ایک دن جنرل اسلم بیگ نے انہیں ملنے کی دعوت دی۔ جب وہ چوہدری الٰہی کے ساتھ وہاں ان سے ملنے کے لیے پہنچے تو بیگ صاحب نے ان دونوں کو کروڑوں روپے دینے کی پیشکش کی۔ یہ بیکرٹ رقم انہیں مہران بینک کے اکاؤنٹ سے ملی تھی۔ یہ وہی مہران بینک اسکینڈل ہے جس کے بارے میں اصغر خان نے سپریم کورٹ آف پاکستان میں ایک درخواست دائر کی تھی کہ کیسے جنرل اسلم بیگ اور ریٹائرڈ ڈی جی آئی ایس آئی اسد درانی نے سیاستدانوں میں چودہ کروڑ روپے کی رشوت بانٹی تھی۔ جن سیاستدانوں کو مہران بینک سے پیسے دیے گئے تھے ان میں نواز شریف، فاروق لغاری، سندھ کے سابق وزیر اعلیٰ جام صادق، ایم کیو ایم کے الطاف حسین، یوسف میمن، جاوید ہاشمی، لیاقت جتوئی، ایم کیو ایم کے آفاق احمد، امتیاز شیخ، جام معشوق، افضل خان، دوست محمد فیضی، عدنان ولد سرتاج عزیز وغیرہ شامل تھے۔

چوہدری شجاعت کے بقول جب وہ اسلم بیگ کے گھر پہنچے تو وہ بغیر بازوؤں کی شرٹ پہنے بہت ریلیکس نظر آ رہے تھے۔ جنرل بیگ نے ان دونوں چوہدریوں کو بتایا کہ انہوں نے ایک پلان بنایا ہے جس کے تحت آئی جے آئی کے پلیٹ فارم سے لڑنے والے تمام سیاستدانوں کو ان کے الیکشن کے لیے پیسے دیے جائیں گے۔ چوہدری شجاعت حسین ایک سرونگ آرمی چیف کے منہ سے اتنی بڑی بات جو اتنے آرام سے کی گئی تھی سن کر ششدر رہ گئے۔ تاہم، چوہدری شجاعت نے جنرل بیگ سے وہ پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ جنرل اسلم بیگ کو چوہدریوں کا یہ انکار سن کر بڑا دھچکا لگا کیونکہ اب تک ان سے آرمی ہاؤس میں جو بھی ملنے آیا تھا اس نے پیسے لینے سے انکار نہیں کیا تھا۔ مرزا اسلم بیگ نے یہ سمجھا کہ شاید چوہدری صاحبان اپنے نام پر پیسے لینے کے لیے تیار نہیں تھے لہٰذا یہ ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ چنانچہ جنرل بیگ نے انہیں یہ آفر کی کہ وہ اپنے نام سے اکاؤنٹ کھولنے کے بجائے اپنے کسی قریبی دوست کے نام سے جس کے نام پر کراچی میں اکاؤنٹ کھول کر اس میں پیسے ڈلوا کر دیے جائیں گے۔ چوہدریوں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے جنرل بیگ نے یہ بھی پیشکش کی کہ اس چیف اکاؤنٹ میں کتنے بھی پیسے ڈالے جائیں گے اور وہ پیسے آئی جے آئی پارٹی کو الیکشن جیتنے کے لیے استعمال کریں گے۔ تاہم، چوہدری شجاعت نے ایک سمجھدار سیاستدان کی طرح ایک بیوقوف مچھلی بننے سے انکار کر دیا جو پانی میں کیچڑا کھانے کے چکر میں دریا کے کنارے ایک شکاری کا پھندا نگل لیتی ہے اور پھر اس کی قسمت کا فیصلہ وہ شکاری کرتا ہے۔ چوہدری شجاعت نے جنرل بیگ کو بتایا کہ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی اس طرح کی گھٹیا سیاست کرنے کا سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ فوجی جرنیلوں سے پیسے لے کر الیکشن لڑیں گے۔ ایک حیران اور پریشان آرمی جنرل کو چوہدری شجاعت نے بتایا کہ وہ کیا بات کر رہے تھے کیونکہ وہ تو اپنی پارٹی کے بہت سارے لوگوں کو الیکشن لڑنے کے لیے خود پیسے فراہم کرتے ہیں۔ بھلا انہوں نے یہ کیسے سوچ لیا کہ اب وہ ان سے پیسے لے کر الیکشن لڑیں گے۔ انہوں نے جنرل بیگ کو بتایا کہ وہ ان سے ایک روپیہ بھی نہیں لیں گے اور اپنی جیب سے سارا الیکشن لڑیں گے۔

چوہدری شجاعت نے مجھے بتایا کہ جب جنرل بیگ نے یہ محسوس کیا کہ وہ ان سے پیسے لینے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں تو یکدم آرمی جنرل کا لہجہ بہت سخت ہو گیا۔ چہرے پر کچھی ناراضگی صاف نظر آ رہی تھی۔ جنرل بیگ نے چوہدری شجاعت پر زور ڈالا کہ وہ پیسے لے لیں۔ تاہم، آخری حربے کے طور پر جنرل بیگ نے چوہدری شجاعت کو کہا کہ ٹھیک ہے، اگر وہ خود پیسے لینے کے لیے تیار نہیں ہیں تو وہ ایم این ایز اور ایم پی ایز کا الیکشن لڑنے والے ان لوگوں کی ایک ایسی فہرست تیار کریں جو پیپلز پارٹی کے امیدواروں کے خلاف الیکشن لڑ رہے تھے۔ جنرل بیگ کے بقول ان تمام امیدواروں کو مہران بینک سے پیسوں کی ادائیگی کی جائے گی۔

چوہدری شجاعت نے اس بات کا میرے سامنے اعتراف کیا کہ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ وہ ایک آرمی چیف کو ناراض کرنے کی جرأت کر رہے تھے جس کا نتیجہ کوئی اچھا نہیں نکلتا تھا۔ لہٰذا انہوں نے بڑی سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جنرل اسلم بیگ سے کچھ وقت مانگا اور کہا کہ بہت جلد وہ ایک فہرست بنا کر ان کے حوالے کر دیں گے جو ان سے پیسے لے کر الیکشن لڑنے پر راضی ہو جائیں۔ تاہم، چوہدری شجاعت نے کہا کہ وہ اس کے بعد کبھی بھی جنرل بیگ سے ملنے نہیں گئے اور نہ ہی انہوں نے اس

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

فرح کی کمانڈ انسٹ بالآخر ان کے حوالے کی گئی کیونکہ وہ اس طرح کی تحقیقی رپورٹس کرنے کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔

جب 24 اپریل 2009ء کو چوہدری شجاعت کا یہ تہلکہ خیز انٹرویو دی نیوز میں Shujaat makes startling disclosures کے عنوان سے چھپا تو ہر طرف ایک ہنگامہ سا مچ گیا کیونکہ کسی نے پہلی دفعہ یہ سوچا بھی نہیں کر سکتا تھا کہ چوہدری شجاعت جیسا بندہ اپنے اندر کی کہانیاں باہر لے آئے گا۔ اسی شام مجھے چوہدری شجاعت کا فون آیا اور اپنے مخصوص پنجابی لہجے میں وہ میرا شکریہ ادا کرنے لگے۔ ان کی آواز سے بڑا جوش اور خوشی جھلک رہی تھی۔ وہ مجھے کہنے لگے کہ آپ نے تو پورے شہر کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ہر طرف سے انہیں فون آ رہے تھے۔ تاہم میں نے ایک بات بڑی شدت سے محسوس کی کہ کارگل کے بارے میں جنرل مشرف کی حمایت کر کے انہوں نے اپنے باس کو بہت خوش کر دیا تھا۔ وہ مجھے کہنے لگے کہ آپ کے اس انٹرویو کا کارگل والا حصہ کسی اردو اخبار میں نہیں چھپ سکتا۔ میں نے کہا بالکل چھپ سکتا ہے اور میں نے انہیں طریقہ بتایا کہ یہ کیسے چھپ سکتا ہے۔ اگلے دن روزنامہ جنگ میں جنگ کے ایک رپورٹر کے نام سے چوہدری شجاعت کا وہ انٹرویو پھر چھپا۔ بعد میں پتہ یہ چلا کہ جنرل مشرف نے چوہدری شجاعت کا میرا لیا ہوا وہ انٹرویو پڑھ کر انہیں فون کر کے بہت سراہا تھا اور انہیں شاباش دی تھی کیونکہ اس انٹرویو سے جنرل مشرف کے اس بیان کی تصدیق ہوتی تھی کہ انہوں نے کارگل آپریشن نواز شریف کی مرضی سے شروع کیا تھا۔ اس کے بعد ہر انٹرویو اور گفتگو میں چوہدری شجاعت نے کارگل والے مسئلے پر یہی لائن لینا شروع کی۔

اس سے پہلے جب میں چوہدری شجاعت کا انٹرویو ختم کر چکا اور اٹھ کر دفتر آنے لگا تو ایک روایتی میزبان کی طرح چوہدری شجاعت نے مجھ سے بھی پوچھا کہ آپ بتائیں میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ میں دوبارہ بیٹھ گیا اور ان سے کہا کہ میرا ایک بڑا ضروری کام ہے۔ اگر آپ وہ کرا دیں تو میں بہت مشکور ہوں گا۔ چوہدری شجاعت نے کہا کہ بالکل! آپ حکم کریں۔ میں نے انہیں بتایا کہ ان کے پاس جنرل ضیاء کے طیارے کی ایک ایسی انکوائری رپورٹ پڑی تھی جو آج تک کبھی نہیں چھپی اور اس کی اکلوتی کاپی ان کے قبضے میں تھی۔ اگر وہ مہربانی کر کے وہ کاپی مجھے دے سکیں تو میرے لیے بہت

بڑا تحفہ ہوگا اور اس سے بڑی خبر کسی رپورٹر کو نہیں مل سکتی۔ یہ چوہدری شجاعت نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ کوشش کریں گے۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ بہت جلد وہ کاپی مجھے فراہم کر دیں گے۔ اس کے بعد چوہدری شجاعت سے میری کئی ملاقاتیں ہوئیں اور وہ ہر دفعہ مجھے یہی کہتے کہ مجھے بس دو گھنٹے نہیں ملتے کہ میں بیٹھ کر وہ رپورٹ کی کاپی آپ کے لیے ڈھونڈ سکوں۔ جس دن مجھے دو گھنٹے مل گئے میں وہ کاپی ڈھونڈ کر آپ کو ضرور دوں گا۔ میں ہمیشہ ان سے یہی کہتا کہ چوہدری صاحب اس سے تو آپ کی دریا دلی اور سخاوت کا پتہ چلتا ہے لیکن میں نے آپ سے ایک چھوٹے سے کام کی درخواست کی تھی وہ بھی آپ نہیں کر سکے۔ چوہدری شجاعت کے اس وعدے کو سات سال سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا ہے اور چوہدری صاحب میرے لیے اب تک دو گھنٹے نہیں نکال سکے۔ پچھلے دنوں پاکستان کے بہت بڑے صحافی عامر متین کے گھر پھر ملاقات ہوئی جہاں وہ ظفر عباس کے لیے ہونے والی تقریب میں شریک تھے۔ مجھے دیکھا تو خود ہی انہیں یاد آ گیا اور بولے یار وہ لیٹ ایاں اے۔ ابھی رحمن ملک ادھر تھا۔ میں اسے کہتا کہ یہ رپورٹ شاید وزارت داخلہ میں پڑی ہو۔ میں مسکرا پڑا۔

اس سے پہلے میری چوہدری شجاعت سے ملاقات 2008ء میں ہوئی جب میں نے اپنے اخبار دی نیوز میں ایک سنسنی خیز خبر چھاپی کہ کیسے چوہدری شجاعت اور پرویز الٰہی نے صدر آصف زرداری کے معتمد خاص ڈاکٹر قیوم سومرو کے گھر جا کر خفیہ ملاقاتیں کی تھیں۔ یہ ملاقاتیں اس وقت ہوئیں جب آصف زرداری صاحب نے بینظیر بھٹو کے چہلم کے اگلے دن نوڈیرو میں بیٹھ کر اپنی پہلی پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے پی ایم ایل کیو کو قاتل لیگ قرار دیا تھا۔ اس کا مطلب بڑا واضح تھا کہ آصف زرداری اس پارٹی اور اس کے لیڈروں کو بینظیر بھٹو کا قاتل سمجھتے تھے۔ یہ بات چوہدری شجاعت اور پرویز الٰہی کے لیے خطرے کی گھنٹیاں بجا رہی تھی کہ کہیں اقتدار میں آ کر ان دونوں پر بینظیر بھٹو کے قتل کا مقدمہ نہ درج کر لیا جائے۔ اسی اثناء میں شہباز شریف نے بھی چوہدری مونس الٰہی کے گرد گھیرا تنگ کرنا شروع کیا، خصوصاً بینک آف پنجاب کے 9 ارب روپے کے اسکینڈل کی کہانیاں اخبارات میں چھپنے لگیں۔ اپنے آپ کو چاروں طرف سے گھیرے میں پا کر سمجھدار سیاستدانوں کی طرح چوہدری شجاعت

www.freepdfpost.blogspot.com

!!!allurdupdfnovels!!!blogspot!!!com!!!

اور پرویز الٰہی نے آصف زرداری سے قربتیں بڑھانے کا فیصلہ کیا اور اس کام کے لیے ڈاکٹر قیوم سومرو کو انتخاب کیا گیا۔ قدرت نے یہ دن دکھانے تھے کہ چوہدری شجاعت اور پرویز الٰہی جن کی مرضی کے بغیر اس ملک میں آٹھ سال تک کوئی پتہ نہیں ہلتا تھا، آج ڈاکٹر قیوم سومرو کے گھر چھپ کر جا رہے تھے تاکہ اپنی اور اپنے بیٹے کی جان بچائی جا سکے۔

اپنے اخبار میں یہ کہانی لکھتے ہوئے مجھے اپریل 2005ء کی ایک صبح یاد آ گئی جب میں بھی دیگر صحافیوں کے ساتھ آصف علی زرداری کے ساتھ دبئی سے آ کر لاہور ایئرپورٹ پر اترا تھا۔ زرداری صاحب کا استقبال کرنے کے لیے ملک بھر سے آئے ہوئے پارٹی ورکرز پرویز الٰہی کی پنجاب پولیس کے ہاتھوں ڈنڈے کھا کر جہاں ایئرپورٹ پر پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ آصف زرداری کو ایجنسیوں نے یقین دلایا تھا کہ اگر وہ لاہور فتح کر لیں تو ملک میں نئے انتخابات کرا لیے جائیں گے اور ان کی پارٹی کو حکومت حوالے کر دی جائے گی۔ آصف علی زرداری صاحب بھی ایجنسیوں کے جھانسے میں آ گئے۔ ہم لاہور ایئرپورٹ پر جہاز کے لینڈ کرنے سے پہلے ہی انہیں پتہ چل چکا تھا کہ گیم ختم ہو چکی ہے۔ یہی وجہ تھی جب جہاز کے اندر لاہور کے ایس پی نے آ کر آصف زرداری کو سلیوٹ مارا تو انہوں نے اپنی روایتی مسکراہٹ سے اس نوجوان آفیسر کو کہا کہ تمہارے پاس میری گرفتاری کے وارنٹ ہوں گے تو مجھے لے چلو۔ ہم سب صحافی بڑے حیران ہوئے کہ یہ صاحب تو لاہور فتح کرنے آئے تھے لیکن وہ چپکے سے اس ٹیم کے ساتھ سیدھے گاڑی میں بیٹھ کر زرداری ہاؤس چلے گئے اور پرویز الٰہی کی کمانڈوز نے ہم صحافیوں کو [illegible] کر کے بٹھا دیا۔ ہمارا قصور یہ تھا کہ ہم نے زرداری صاحب کے ساتھ دبئی سے آنے کی جرأت کیسے کی تھی۔

آج وہی وقت تھا کہ چوہدری پرویز الٰہی اپنے بیٹے کی جان بچانے کے لیے ڈاکٹر قیوم سومرو کے [illegible]

کے گرد منڈلاتے تمام خطرات بھی دور ہو گئے۔ اس کے بعد چوہدری شجاعت اور پرویز الٰہی نے آصف زرداری کے صدر بننے کے بعد ایوان صدر میں رات کے اندھیرے میں کئی کھانے کھائے جہاں یہ منصوبے بنائے گئے کہ پنجاب میں نواز شریف اور شہباز شریف کی کمر کیسے توڑی جائے۔ ان ملاقاتوں کے نتیجے میں ہی پنجاب میں گورنر راج لگا۔ پھر جو کچھ ہوا وہ سب لوگوں نے دیکھا کہ کیسے ان سب لیڈروں کو اپنا تھوکا ہوا چاٹنا پڑا۔ نہ صرف نواز شریف اور شہباز شریف عدالتوں سے بحال ہوئے بلکہ پنجاب حکومت بھی واپس کر دی گئی۔

اپنے ایف ایٹ کے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے چوہدری شجاعت اور پرویز الٰہی مجھے یہی سمجھا رہے تھے کہ مجھے اس طرح کی خبریں نہیں چھاپنی چاہئیں۔ ایک بات کی میں یقیناً داد دوں گا کہ میں نے چوہدری شجاعت اور پرویز الٰہی کے خلاف ان کے قرضے معاف کرانے سے لے کر فیصل آباد کی سونیا ناز کے ساتھ پنجاب میں ہونے والے ریپ کیس اور اب قیوم سومرو کے ساتھ خفیہ ملاقاتوں کی کئی ایسی خبریں چھاپی تھیں جو یقیناً کوئی بھی حکمران پسند نہیں کرتے۔ لیکن کسی ایک دن بھی چوہدری شجاعت یا پرویز الٰہی نے میرے ساتھ تنگی یا تلخی سے بات نہیں کی بلکہ جب اور جہاں ملے بڑی عزت اور احترام سے ملے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں تمام سیاسی لیڈروں کے برعکس چوہدری شجاعت اور پرویز الٰہی میں ہم صحافیوں کو اپنے خلاف لکھنے کے باوجود برداشت کرنے کی بہت بڑی خوبی ہے۔

یہی وجہ ہے میں چپ چاپ چوہدری شجاعت اور پرویز الٰہی کی باتیں سنتا رہا اور جب اٹھنے لگے تو ان سے ایک ہی بات کی کہ چوہدری صاحب! آپ نے مجھ سے پانچ سال پہلے جنرل ضیاء کی انکوائری رپورٹ دینے کا وعدہ کیا تھا اور آپ نے آج تک میرا وہ کام نہیں کیا۔ چوہدری شجاعت تھوڑے جھینپ سے گئے اور بولے کہ جس دن انہیں [illegible] انکوائری رپورٹ [illegible] نکالیں گے۔ ان پانچ سالوں میں نہ چوہدری صاحب [illegible] اور نہ ہی انہوں نے جنرل ضیاء کے [illegible] رپورٹ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ [illegible]

www.freepdfpost.blogspot.com

!!!allurdupdfnovels!!!blogspot!!!com!!!

چوہدری نثار علی خان

اکتوبر 2002ء کے الیکشن کے بعد نئی پارلیمنٹ وجود میں آ چکی تھی۔ چوہدری نثار علی خان کا میں نے اب تک صرف نام سنا تھا۔ ان سے ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی۔ بدلتے حالات و واقعات کے مطابق میں نے بھی اپنا آپ کو بدلنے کا فیصلہ کیا تھا اور پارلیمنٹ کی رپورٹنگ کے لیے اپنا نام اپنے ایڈیٹر ملیحہ لودھی کو پیش کیا تھا۔ ہم بھاری اور دی نیوز کے چیف رپورٹر شکیل شیخ کی مہربانی سے میرا نام پارلیمنٹ کو رپورٹ کرنے والے رپورٹروں میں شامل کر دیا گیا تھا۔ یہ بات بتاتے ہوئے بڑا عجیب سا لگ رہا ہے کہ پارلیمنٹ جانے سے قبل مجھے سیاست اور سیاسی لیڈروں سے بڑی چڑ تھی اور میں حیران ہوتا تھا کہ سیاسی رپورٹر کیا جھک مارتے رہتے ہیں۔ بھلا سیاسی رپورٹنگ کرنا بھی کوئی رپورٹنگ ہے۔ سارا دن سیاستدانوں سے گپیں ماریں اور شام کو اپنا دو چار اپنی عقل لگا کر اسی گپ شپ کو اخبار میں چھاپ دیں۔ تاہم پارلیمنٹ کی رپورٹنگ کرنے کے کچھ عرصے بعد مجھے احساس ہوا کہ سیاسی رپورٹنگ کا اپنا ایک لطف ہوتا ہے۔ جو اس میں ڈوب جائے وہی سکندر ٹھہرتا ہے۔ جب میں نے چوہدری شجاعت کا پہلا سیاسی تفصیلی انٹرویو کیا جو اپنے اخبار میں چھپا تو میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ یہ سلسلہ رکنا نہیں چاہیے اور ملک کے کچھ بڑے اہم لوگوں کا بھی انٹرویو کرنا چاہیے تاکہ ایک پوری سیاسی تاریخ مرتب کی جا سکے۔ میرا خیال ہے کہ وہ پاکستان مسلم لیگ نواز کے خواجہ محمد آصف ہی تھے جنہوں نے مجھے دو تین دفعہ یہ تجویز دی کہ میں چوہدری نثار علی خان سے ملوں اور ان کا انٹرویو کروں۔ خواجہ صاحب کے بقول نثار کے پاس بہت بڑے بڑے راز تھے۔ ایک دن قومی اسمبلی کا اجلاس ختم ہوا تو پارلیمنٹ کیفے ٹیریا میں چوہدری نثار اور خواجہ آصف صحافیوں کے ساتھ ایک میز پر بیٹھے تھے۔ میں اس سے پہلے چوہدری نثار سے کبھی نہیں ملا تھا اور نہ ہی وہ مجھے شکل سے پہچانتے تھے۔ تاہم، میں خواجہ صاحب کے قریب گیا، ان سے علیک سلیک ہوئی۔ چوہدری نثار علی خان سے بھی ہاتھ ملایا اور وہیں اسی میز کے گرد بیٹھ گیا۔ اچانک خواجہ آصف نے مجھ سے پوچھا کہ رؤف اور کیا نئی تازی ہے۔ میرا نام سن کر چوہدری نثار تھوڑا سا چونکے اور میری طرف دیکھ کر کہا کہ آپ رؤف کلاسرا ہیں۔ میں نے کہا جی بالکل۔ ان کی بڑی مہربانی کہ وہ فوراً کھڑے ہو گئے اور دوبارہ مجھ سے ہاتھ ملایا۔ وہ مجھے بتانے لگے کہ کیسے جب وہ جنرل مشرف کے مارشل لاء کے بعد فیض آباد میں واقع اپنے گھر پر قید تھے تو انہوں نے پہلی دفعہ دی نیوز میں میرا نام خبروں کے ساتھ پڑھنا شروع کیا تھا۔ ان کے لیے میری تحریریں حیرانی کا سبب تھیں کیونکہ مارشل لاء کے باوجود جنرل مشرف کی حکومت کے خلاف نہ صرف سخت تحریریں میرے نام سے چھپ رہی تھیں بلکہ بہت سارے سکینڈلز بھی اخبار کی زینت بن رہے تھے۔ چوہدری نثار کے لیے یہ بات بڑی حیرانی کا سبب تھی کہ اچانک ایک نیا رپورٹر اتنا بڑا رسک لیتے ہوئے جنرل مشرف کے مارشل لاء کے خلاف خبریں تحریر کر رہا تھا۔

بعد میں مجھے چوہدری نثار نے بتایا کہ ان کی بیگم بھی میری تحریروں کی گرویدہ تھیں۔ ان کے خیال میں میں سندھی تھا کیونکہ پنجابی رپورٹر اتنے سخت طریقے سے فوجی مارشل لاء کے خلاف نہیں لکھ سکتے تھے۔ تاہم، میں نے چوہدری نثار کو بتایا کہ میں سندھی نہیں بلکہ سرائیکی ہوں۔ اس پہلی ملاقات کے بعد چوہدری نثار سے گپ شپ بڑھتی گئی۔ وہ ان چند سیاستدانوں میں سے ہیں جو جب چاہیں اور جس سے چاہیں دوستی قائم کر سکتے ہیں اور جب یہ محسوس کریں کہ اب اس دوستی کی ضرورت نہیں ہے تو بھی وہ ایک لمحے میں اس بندے کو اپنے آپ سے دور کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مجھے خود بھی چوہدری نثار کی شخصیت کے اس پہلو کا تجربہ ہوا ہے جسے میں بعد میں بیان کروں گا۔

چوہدری شجاعت کے انٹرویو کے بعد ماحول بڑا سازگار تھا اور بہت سارے سیاستدان مجھ سے بات چیت کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ تاہم، میں نے چوہدری نثار علی خان سے درخواست کی کہ میں ان کا انٹرویو کرنا چاہتا ہوں۔ آپس کی بات یہ ہے کہ مجھے نثار کے بارے میں زیادہ پتہ نہیں تھا اور

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

مجھے اندازہ بھی نہیں تھا کہ ان کے پاس کس طرح کے راز ہو سکتے ہیں اور وہ کس حد تک ان رازوں سے پردہ اٹھا سکتے تھے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے جتنے پروفائل اب تک کیے ہیں چوہدری نثار کا پروفائل سب سے زیادہ پاورفل اور رازوں کے انکشافات سے بھرا ہوا تھا۔ چوہدری نثار سے کی ملاقاتیں ان کے گھر پر ہوئیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک اچھے میزبان ہیں اور کوئی لمحہ ایسا نہیں تھا جب انٹرویو کے دوران کوئی چیز کھانے پینے کے لیے آ جا نہ رہی ہو۔ میں ان کے بڑے پیارے بچوں تاشہ اور تیمور کا بھی شکرگزار ہوں جنہوں نے ان دنوں میں جب میں ان کے والد صاحب سے انٹرویو کرنے گھر جاتا تھا، مجھے بڑی اچھی کمپنی دی اور گپ شپ کی۔ تیمور کو کرکٹ کھیلنے کا بہت شوق ہے اور وسیم اکرم ان کے بڑے فیورٹ کھلاڑی تھے اور مجھے امید ہے کہ چکری کے چوہدریوں کا یہ بیٹا شاید اپنے باپ دادا کے فوجی اور سیاسی خاندان سے بغاوت کر کے کسی دن کرکٹ میں نام روشن کرے۔

جب میں چوہدری نثار کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تو نثار نے چھوٹتے ہی پہلی بات یہی کی کہ وہ ان دنوں جس جگہ آپ بیٹھے ہیں اسی جگہ آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل محمود ان کی منتیں کرتے تھے کہ وہ نواز شریف کو چھوڑ کر جنرل مشرف کے ساتھ مل جائیں تو وہ کون سا بڑا عہدہ ہے جو انہیں نہیں دیا جا سکتا۔ جس پر وہ نواز شریف کے وفادار رہنا چاہتے تھے۔ یہ علیحدہ کہانی ہے کہ بعد میں کلثوم نواز کی وجہ سے ان کے اختلافات نواز شریف سے اس حد تک بڑھ گئے تھے کہ ایک مرحلے پر وہ بڑی سنجیدگی سے علیحدگی اختیار کرنے پر غور کر رہے تھے۔ اس کام کے لیے بینظیر بھٹو کی قریبی ساتھی آمنہ پراچہ سے رابطے میں تھے اور معاملات قریب قریب طے ہو چکے تھے کہ چوہدری نثار نواز شریف کو چھوڑ کر اب بینظیر بھٹو کے ساتھ پیپلز پارٹی میں شامل ہوں گے۔

چوہدری نثار پاکستان کے مشہور ہیں اور میں ہمیشہ ان کے چہرے کو دیکھتا رہا کہ ایک کے بعد دوسرا راز جیسے فلم کی طرح میری آنکھوں کے سامنے کھلتے چلے گئے۔

چوہدری نثار کے والد چوہدری فتح علی خان انڈین آرمی میں آفیسر تھے اور چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا بھی ایک فوجی بنے۔ اپنے گھر والوں کی خواہش کے باوجود چوہدری نثار نے سیاستدان بننے کا فیصلہ کیا۔ جب ۱۹۸۵ء میں وہ پہلی دفعہ قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے تو انہیں کوئی اندازہ نہیں تھا کہ ایک دن وہ سیاست میں اس مقام پر پہنچیں گے جہاں وہ آج کھڑے تھے۔ چوہدری نثار کو

نواز شریف اور محمد خان جونیجو میں سے کسی ایک لیڈر کا انتخاب کرنا تھا اور نثار نے نواز کا کیا۔ نثار کو اس بات کا اندازہ تھا کہ ان کا مزاج سیاسی نہیں تھا لیکن پتہ نہیں کیوں انہیں یہ لگتا تھا کہ وہ ایک پیدائشی سیاستدان تھے۔ جب وہ پہلی دفعہ قومی اسمبلی کی تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تو ان کی ٹانگیں نیچے سے کانپ رہی تھیں۔ جب نثار نے اپنی پہلی تقریر ختم کی تو اس وقت کے وزیر خزانہ محبوب الحق نثار کی سیٹ کے پاس آئے اور انہیں کہا کہ نثار آج کے بعد تم میرے پارلیمنٹری سیکرٹری کے طور پر کام کرو گے۔ ڈاکٹر محبوب الحق نے چوہدری نثار کو تمام مالی معاملات پر کھلی آزادی دی۔ نثار نے ڈاکٹر محبوب الحق سے بہت کچھ سیکھا جو ان کی آنے والی سیاسی زندگی کا بہت بڑا اثاثہ ثابت ہوا۔ تاہم، بہت جلد جنرل ضیاء اور جونیجو کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے اور ڈاکٹر محبوب الحق کو استعفیٰ دے کر گھر جانا پڑ گیا۔ یاسین وٹو کو نیا وزیر خزانہ بنا دیا گیا۔ ایک دن جونیجو نے نثار کو بلایا اور اس کے کام کی تعریف کرنے کے بعد یہ انکشاف کیا کہ اسے وزیر بنایا جا رہا تھا۔ نثار نے جونیجو کا شکریہ ادا کیا اور یہ درخواست کی کہ اسے اگر وزیر بنانا ہی ہے تو وزیر مملکت برائے فنانس بنایا جائے۔ جونیجو صاحب مان گئے۔ تاہم، چوہدری نثار کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جب وہ حلف لینے کے لیے گئے تو انہیں پتہ چلا کہ انہیں وزارت پٹرولیم کا وزیر بنایا گیا تھا۔ بعد میں نثار کو پتہ چلا کہ یاسین وٹو اپنی وزارت میں ڈپٹی منسٹر نہیں چاہتے تھے۔ تاہم، نثار نے نئی وزارت میں دلچسپی لینا شروع کی۔ وہ وزارت انہیں اتنی اچھی لگی کہ اس کے بعد جب بھی نثار کے پاس یہ چوائس آئی وہ ہمیشہ پٹرولیم کے وزیر ہی بنے۔

میں چوہدری نثار سے یہ پوچھنے کے لیے بے تاب تھا کہ آخر جنرل ضیاء اور محمد خان جونیجو کے درمیان ایسے کون سے اختلافات پیدا ہو گئے تھے جن کی بنیاد پر پوری پارلیمنٹ توڑ دی گئی تھی۔ چوہدری نثار نے انکشاف کیا اور بولے کہ محمد خان جونیجو کو تمام سیکرٹ ایجنسیوں نے بڑی محنت اور کوشش کے بعد ڈھونڈ کر اور یہ کہہ کر جنرل ضیاء کے سامنے پیش کیا تھا کہ اس سے اچھا اور بے ضرر لیڈر وزیر اعظم کے عہدے کے لیے کوئی اور نہیں مل سکتا ہے۔ تاہم محمد خان جونیجو نے جنرل ضیاء کی ساری خوشی کو اس وقت کرکرا دیا جب وزیر اعظم بنتے ہی جونیجو نے جنرل ضیاء کے قریبی ساتھی اور اس وقت کے دفاعی سیکرٹری لیفٹیننٹ جنرل حبیب الرحمن کو برطرف کر دیا۔ آنے والے دنوں میں بات مزید بڑھ گئی جب جونیجو نے ان جرنیلوں کو پروموشن دینے سے انکار کر دیا جنہوں نے سیاچن پر بھارت کو قبضہ کرنے دیا تھا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

تاہم چوہدری نثار یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھے کہ محمد خان جونیجو اور فخری کیپ ... کے بعد ... وزیراعظم بن رہے تھے۔ نثار نے کہا کہ دراصل یہ بھی ایک ڈس انفارمیشن تھی جس کا مقصد ... ایک سیاسی حکومت کو ڈس مس کرنا تھا۔

ایک دم مجھے یاد آیا کہ جن دنوں نثار جونیجو حکومت میں وزیر تھے انہی دنوں بینظیر بھٹو بھی واپس لوٹی تھیں۔ میرے سوال پر نثار نے کہا کہ جنرل ضیاء، بینظیر بھٹو کی وطن واپسی کے اتنے زیادہ خلاف نہیں تھے۔ تاہم ضیاء کا یہ خیال تھا کہ پاکستان کا سیاسی اور جمہوری سلسلہ جو ابھی نیا نیا چلا تھا وہ اتنا پختہ نہیں ہوا تھا کہ بینظیر بھٹو کے جارحانہ حملوں کا سامنا کر سکے۔ تاہم، جونیجو نے جنرل ضیاء کو اس بات پر راضی کر لیا کہ بینظیر بھٹو کے وطن واپس آنے سے ضیاء کے اقتدار کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ جونیجو کا یہ بھی خیال تھا کہ بہتر ہوگا کہ بینظیر بھٹو کا سیاسی طور پر سامنا کیا جائے۔ کچھ دنوں بعد بینظیر بھٹو وطن واپس آئیں اور جیسا کہ جونیجو نے کہا تھا اس سے ملک میں فوری طور پر کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی اور سیاسی حکومت بینظیر بھٹو کی وجہ سے نہیں، جنرل ضیاء کی وجہ سے ختم ہوئی تھی۔

29 مئی 1988ء کو جب جونیجو حکومت ختم کی گئی تو لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ بہت سارے وزیر جنہیں جنرل ضیاء نے برطرف کیا تھا وہ دوبارہ حلف لے کر ان کی نگرانی میں قائم کی گئی کابینہ میں بیٹھ گئے تھے۔ چوہدری نثار بھی ان وزیروں میں شامل تھے جبکہ پنجاب میں نواز شریف نے نگران وزیراعلیٰ کا حلف اٹھایا تھا۔ تاہم، نثار نے میرے سامنے اس بات کا اعتراف کیا کہ نواز اور انہوں نے خود جونیجو کے خلاف جنرل ضیاء کی حمایت کر کے غلطی کی تھی۔ تاہم، نثار نے کہا کہ شاید اس فیصلے کے پیچھے یہ وجہ تھی کہ پنجاب میں پیر پگاڑا صاحب مسلسل نواز شریف کے خلاف ایک سیاسی گروپ کو اپنی حمایت کا یقین دلا رہے تھے۔ یوں ہمارے پاس ایک بڑی وجہ بن گئی تھی کہ ہم اسلام آباد میں پیر پگاڑا کے امیدوار وزیراعظم کا ساتھ نہ دیں۔ تاہم، نثار نے یہ بات مان لی کہ چاہے وجہ کچھ بھی ہو، سب کچھ ہونا چاہیے تھا اور سیاسی قوتوں کو ایک سیاسی وزیراعظم کا ساتھ دینا چاہیے تھا نہ کہ وردی میں بیٹھے ہوئے ایک جنرل کا۔ یوں جنرل ضیاء نے نواز شریف اور جونیجو کے درمیان اختلافات کا بڑا فائدہ اٹھایا اور آسانی سے حکومت تحلیل کر دی۔

تاہم چوہدری نثار کے اندر ابھی بھی ایک سیاسی ورکر زندہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب ضیاء نے جونیجو کی حکومت توڑی تو نثار نے اس ایکشن کے خلاف ایک بڑا زوردار بیان دیا۔ یہ بیان پڑھ کر نواز شریف نے نثار کو فون کیا اور یہ ہدایت کی کہ وہ اس طرح کے بیان دینا بند کر دیں اور نثار چپ ہو گئے۔

میں نے نثار سے پوچھا کہ جنرل ضیاء کی شخصیت کس طرح کی تھی۔ وہ بولے ضیاء بڑے ٹھنڈے مزاج کے تھے اور بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ تاہم، جونیجو حکومت برطرف کرنے کے بعد وہ دوبارہ ایک نارمل زندگی شروع نہیں کر سکے تھے۔ جونیجو حکومت کی برطرفی سے لے کر اپنی موت تک نثار نے شاید ہی جنرل ضیاء کو اچھے موڈ میں دیکھا ہو۔ نثار نے کہا کہ ایک دن کابینہ میٹنگ سے پہلے پی ٹی وی کے کیمرہ مین کے آنے سے قبل جنرل ضیاء نے اپنے تمام وزیروں سے کہا کہ وہ باری باری کیمرے کے سامنے مسکرائیں تاکہ عام پبلک میں یہ تاثر جائے کہ جنرل ضیاء اور اس کے ساتھی ہرگز پریشان نہیں ہیں۔ اس ایک بات سے جنرل ضیاء میں پچھلی ٹینشن اور پریشانی کا اندازہ ہوتا تھا جس کا وہ سامنا کر رہے تھے۔

باتوں باتوں میں نثار نے اس بات کا بھی انکشاف کیا کہ جنرل ضیاء کا طیارہ کریش ہونے سے کچھ دن قبل جنرل ضیاء کے سینئر وزیر اسلم خٹک نے انہیں یہ مشورہ دیا تھا کہ ان کی زندگی کو خطرہ ہے لہٰذا وہ ہوائی جہاز کا سفر ترک کر دیں۔ جنرل ضیاء نے اپنے سینئر وزیر کو بتایا کہ خدا اس کی حفاظت کرے گا۔ نثار کے بقول جنرل ضیاء نے اپنے سینئر وزیر کی بات کو زیادہ سیریس نہیں لیا تھا حالانکہ اسلم خٹک کی بات سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے پاس کوئی اندر کی انفارمیشن موجود تھی کہ جنرل ضیاء کو قتل کرنے کا منصوبہ بن چکا تھا۔ پھر ہمیں یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ جنرل ضیاء، پاکستان کی اندرونی اور بیرونی قوتوں کے لیے اب ایک بہت بڑا بوجھ بن چکے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جنرل ضیاء اپنی موت سے قبل یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ وہ ملک میں نئے انتخابات نہیں کروائیں گے اور مختلف آپشنز پر غور ہو رہا تھا۔ ایک دن جنرل ضیاء نے کابینہ میٹنگ بلائی اور اپنے تمام وزیروں سے یہ پوچھا کہ کیا ملک میں نئے الیکشن ہونے چاہئیں۔ وزیروں کی اکثریت نے ملک میں نئے انتخابات نہ کروانے کا مشورہ دیا اور یہ تجویز دی کہ ملک میں صدارتی نظام حکومت رائج کر دیا جائے۔ ان وزیروں نے جنرل ضیاء کو بتایا کہ وہ ابھی بھی ملک میں بہت زیادہ پاپولر تھے اور بینظیر بھٹو کو صدارتی انتخاب میں شکست دے سکتے تھے۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے ان وزیروں نے یہ بھی بتایا کہ لوگ ایک عورت کو ووٹ نہیں دیں گے۔ نثار نے جب یہ

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

[illegible] جنرل ضیاء سے ملاقات کے لیے [illegible]
[illegible]
[illegible] پالیسی [illegible] ملک میں انتخابات کرائے گئے تو ان کے تمام سیاسی [illegible]
اب جنرل ضیاء [illegible] ملک میں انتخابات [illegible] چوہدری نثار کی بات [illegible]
[illegible] جنرل ضیاء [illegible] پاکستان کے [illegible]
جنرل ضیاء [illegible] ملک میں انتخابات کرا دیں [illegible]
کے بارے میں ملک [illegible] پہنچ رہے ہیں۔

جونہی چوہدری نثار کی تقریر ختم ہوئی تو جنرل ضیاء نے فوراً کابینہ میٹنگ ختم کرنے کا اعلان کیا۔ اسی وقت جنرل ضیاء کے اے ڈی سی [illegible] خان (م 2003ء میں اس [illegible] کے روز راولپنڈی میں ٹریفک حادثے میں [illegible]) ایک چٹ نثار کے پاس لائے جس میں جنرل ضیاء نے لکھا ہوا تھا کہ وہ کمرے میں بیٹھے رہیں اور اس پیغام کے متعلق کسی کو نہ بتائیں۔ چوہدری نثار کے ذہن میں فوراً یہ خیال آیا کہ شاید ان کی 25 منٹ کی لمبی تنقیدی گفتگو سے جنرل ضیاء ناراض ہو گئے تھے۔ جنرل ضیاء نے چوہدری نثار کو اپنے ساتھ لیا اور ساتھ والے کمرے میں لے گئے۔ جہاں چاروں صوبائی وزراء اعلیٰ ملک میں نئے انتخابات کے مسئلے کو ڈسکس کرنے کے لیے بیٹھے تھے۔ جنرل ضیاء نے ان سب کو بتایا کہ ان کے اس نوجوان وزیر نے انہیں اور ان کی پالیسیوں کو آج کابینہ کی میٹنگ میں شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ جنرل ضیاء یہ چاہتے تھے کہ چوہدری نثار ایک دفعہ پھر اپنی ساری گفتگو ان کے سامنے دہرائیں۔ اس سے پہلے کہ چوہدری نثار کوئی بات کہتے، جنرل فضل حق بول پڑے اور کہا کہ نثار مجھے امید ہے کہ تم ہمیں آدھے گھنٹے تک اپنی باتوں سے بور نہیں کرو گے۔ چوہدری نثار نے فوراً جواب دیا کہ نہیں جنرل

صاحب آپ لوگوں کو بور کرنے کا اختیار تو صرف جرنیلوں کے پاس ہے۔ جنرل ضیاء نے محفل کو ایک بہت بوجھل [illegible] اپنے [illegible] نثار کے [illegible] جنرل ضیاء کو [illegible] ہے [illegible]

جنرل ضیاء کی موت واقع ہو چکی تھی اور اب ملک کی باگ ڈور غلام اسحاق خان اور جنرل اسلم بیگ کے ہاتھوں میں تھی۔ ملک میں نئے انتخابات کرانے کا فیصلہ کر لیا گیا تھا جس میں [illegible] کر [illegible] بینظیر بھٹو [illegible] کے [illegible] پیپلز پارٹی کے خلاف تھے۔ چوہدری نثار [illegible] جنرل اسلم بیگ اور غلام اسحاق خان بینظیر بھٹو کے [illegible] الیکشن میں [illegible] نہیں کی گئی تھی۔ تاہم جب الیکشن کے نتائج سامنے آئے اور اس بات کا انکشاف ہوا کہ بینظیر بھٹو کی قیادت میں پیپلز پارٹی نے بھی [illegible] پارٹی نے [illegible] پارٹی مخالف حکومت بن گئی ہے۔ تاہم بعد میں بینظیر بھٹو [illegible] کے اقتدار ان کے حوالے کر دیا گیا۔ نثار نے اس بات کا اعتراف کیا کہ جنرل بیگ اور غلام اسحاق خان بینظیر حکومت کو غیر مستحکم کرنے کے لیے مسلسل اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ نواز شریف کے کہنے پر چوہدری نثار اکثر جنرل بیگ اور غلام اسحاق خان سے ملاقاتیں کرتے رہتے تھے۔ ایک دن غلام اسحاق خان نے نواز شریف کو بلایا اور کہا کہ انہوں نے بینظیر بھٹو حکومت کو ڈس مس کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ غلام اسحاق خان نے چوہدری نثار سے نگران گورنر اور پنجاب کے لیے وزیر اعلیٰ کا نام مانگا۔ جونہی جب نثار نے یہ پیغام نواز شریف کو دیا تو نواز شریف نے چوہدری نثار کا نام پنجاب کے قائم مقام وزیر اعلیٰ اور میاں اظہر کا گورنر کے طور پر دیا۔ تاہم، غلام اسحاق خان نے یہ کہہ کر چوہدری نثار کا نام مسترد کر دیا کہ وہ ابھی بہت کم عمر ہیں۔ غلام اسحاق خان دراصل [illegible] کو پنجاب کا وزیر اعلیٰ بنانا چاہتے تھے۔ تاہم، نواز نے چوہدری نثار کے نام پر اصرار جاری رکھا۔ جب نثار کو اس بات کا پتہ چلا تو انہوں نے نواز شریف سے کہا کہ وہ کسی اور کا نام دے دیں۔ پھر چوہدری نثار نے خود ہی غلام حیدر وائیں کا نام دے دیا جسے قبول کر لیا گیا۔

بینظیر بھٹو حکومت کے خاتمے کے بعد الیکشن ہوئے اور نواز شریف وزیر اعظم بن چکے تھے۔ پھر [illegible] وزیر اعظم نواز شریف اور غلام اسحاق خان میں اختلافات پیدا

www.freepdfpost.blogspot.com

!!!allurdupdfnovels!!!blogspot!!!com!!!

رہے تھے۔ نثار کے بقول جب نواز شریف نے 1991ء میں اپنی کابینہ کے ارکان کی تعداد بڑھانی چاہی تو غلام اسحاق خان نے انکار کر دیا کہ نئے وزیروں سے حلف لیں۔ تمام وزیروں کو انتظار میں کھڑا کر دیا گیا۔ نئے وزیر اور صحافی ایوان صدر میں غلام اسحاق خان کا انتظار کر رہے تھے کہ وہ آ کر وزیروں سے حلف لیں گے۔ رات گئے جا کر یہ پتہ چلا تھا۔ تاہم غلام اسحاق خان نے وہاں آ کر وزیروں کو یہ کہہ کر حلف دینے سے انکار کر دیا کہ جب تک ان کے داماد انور سیف اللہ خان کو وزیر نہیں بنایا جاتا وہ حلف نہیں لیں گے۔ اس اچانک مطالبے سے نواز شریف بڑے حیران ہوئے اور انہوں نے صدر کی یہ بات ماننے سے انکار کر دیا۔ جواباً غلام اسحاق خان نے بھی نئے وزیروں کو حلف دلوانے سے انکار کر دیا۔ مسلسل ایک گھنٹے تک نواز شریف اور غلام اسحاق خان میں بحث ہوتی رہی۔ آخر تنگ آ کر نواز شریف انور سیف اللہ کو وزیر مملکت بنانے پر تیار ہو گئے لیکن غلام اسحاق خان نے یہ اصرار جاری رکھا کہ ان کے داماد کو پورا وزیر بنایا جائے۔

اسی دوران میں بینظیر بھٹو اور نواز شریف کے درمیان بڑھتی ہوئی سیاسی دشمنی پاکستان آرمی کے لیے بھی پریشانی کا سبب بن رہی تھی۔ اس وقت کے چیف آف آرمی سٹاف جنرل آصف نواز جنجوعہ نے وزیراعظم نواز شریف اور بینظیر بھٹو کے درمیان ایک ملاقات کروائی تاکہ وہ بیٹھ کر اپنے اختلافات دور کر سکیں۔ تاہم جب غلام اسحاق خان کو یہ پتہ چلا تو انہوں نے یہ میٹنگ نہیں ہونے دی۔ نثار نے بتایا کہ غلام اسحاق خان یہ چاہتے تھے کہ نواز شریف بینظیر بھٹو کو کرپشن کے الزامات پر سیاست سے باہر کرنے کی کوشش کریں۔ غلام اسحاق خان نے بینظیر بھٹو کے خلاف بہت سارے ریفرنس تیار کیے ہوئے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ نواز شریف انہیں عدالتوں میں دائر کریں۔ غلام اسحاق نواز شریف سے اس بات پر ناخوش تھے کہ ان کی حکومت بینظیر بھٹو کے خلاف کیسز میں دلچسپی نہیں لے رہی تھی۔ وہ بینظیر بھٹو کے خلاف اپنی ذاتی دشمنی پوری کرنے کے لیے نواز شریف کو استعمال کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ 1990ء میں بینظیر بھٹو کے خلاف جام صادق کی حکومت کے اقدامات کو پوری طرح تحفظ فراہم کرتے تھے۔ نثار کے بقول اس میں کوئی شک نہیں کہ غلام اسحاق خان بہت محنتی اور ذہین شخص تھے اور حکومتی معاملات پر ان کی بڑی سخت گرفت تھی۔ تاہم وہ ایک بہت ضدی شخص تھے۔ غلام اسحاق کی ساری جنگ بینظیر بھٹو اور زرداری کے خلاف ذاتی تھی اور وہ اس معاملے پر نواز شریف کی کوئی بھی بات سننے کو تیار نہیں تھے۔ نواز شریف اور غلام اسحاق کے درمیان اصل مسئلہ اس دن پیدا ہوا جس دن جنرل آصف نواز کی اچانک موت واقع ہو گئی۔ ایوان صدر میں ایک میٹنگ کال کی گئی جس میں جنرل آصف نواز کے مرنے کے بعد نئے آرمی چیف کے نام پر غور کیا گیا۔ نواز شریف چاہتے تھے کہ جنرل رحیم دل بھٹی جو اس وقت سب سے سینئر جرنیل تھے انہیں پاک فوج کا نیا چیف بنایا جائے جبکہ غلام اسحاق خان جنرل فرخ کو بنانا چاہتے تھے۔ صدر اور وزیراعظم کے درمیان بہت تلخی ہو گئی۔ نواز شریف اس میٹنگ کو درمیان چھوڑ کر واپس آ گئے۔

حالات اچانک خراب ہو گئے تھے۔ بات یہاں تک جا پہنچی کہ جنرل آصف نواز کے جنازے میں غلام اسحاق خان اور نواز شریف ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے تھے لیکن دونوں نے بات چیت نہیں کی۔ اس ڈیڈ لاک کو توڑنے کے لیے چوہدری نثار نے کوششیں شروع کر دیں اور انہوں نے روئیداد خان سے ایک ملاقات کی جن کا غلام اسحاق خان پر بڑا اثر و رسوخ تھا۔ آخر جنرل وحید کاکڑ کے نام پر معاملہ طے ہو گیا۔ اگرچہ نواز شریف جنرل کاکڑ کے نام پر بھی راضی نہیں تھے کیونکہ ان کے خیال میں ابھی ان کی عمر چیف آف آرمی سٹاف بننے کی نہیں تھی۔ تاہم چوہدری نثار نے نواز شریف کو سمجھایا کہ صدر اور وزیراعظم کے درمیان جاری اس جنگ کو ختم کیا جائے۔ اسی دوران میں نواز شریف تک یہ خبر پہنچی کہ غلام اسحاق خان اور پیپلز پارٹی کے لیڈروں کے درمیان ملاقاتیں بڑی تیزی سے ہو رہی تھیں۔ پختون قوم پرست لیڈر محمود خان اچکزئی اور افتخار گیلانی نے چوہدری نثار اور شہباز شریف کو بتایا کہ وہ ان دنوں کچھ ایسی رپورٹس سن رہے تھے کہ غلام اسحاق خان اور پیپلز پارٹی کسی قسم کی سازش میں مصروف ہیں۔ محمود اچکزئی یہ چاہتے تھے کہ بینظیر بھٹو اور نواز شریف اپنے اختلافات بھلا کر اسٹیبلشمنٹ کو شکست دیں۔ چوہدری نثار نے نواز شریف سے بات کی۔ تاہم وہ بینظیر بھٹو پر بھروسہ کرنے کو تیار نہیں تھے۔

چوہدری نثار نے محمود خان اچکزئی کی بڑی تعریف کی اور کہا کہ وہ پاکستان کے ایک ایسے لیڈر تھے جنہیں ہمیشہ انڈر ریٹ کیا گیا۔

چوہدری نثار نے اس بات کا بھی انکشاف کیا کہ اس موقع پر اپنے قریبی ساتھیوں سے ایک میٹنگ میں نواز شریف نے انہیں بتایا کہ وہ قومی اسمبلی کو تحلیل کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ تمام لوگوں نے اس بات کی مخالفت کی۔ تاہم نواز شریف نے کہا کہ وہ اسٹیبلشمنٹ کی طاقتوں کے آگے نہیں جھکیں گے

www.freepdfpost.blogspot.com

!!!allurdupdfnovels!!!!!blogspot!!!com!!!

[illegible]

[illegible] نواز شریف کو یہ مشورہ دیا کہ وہ ملک کے قائم مقام وزیر اعظم بن جائیں [illegible] شریف نے کہا کہ وہ چاہتے تھے کہ ان کے ساتھ غلام اسحاق خان بھی استعفیٰ دے کر گھر جائیں۔ جنرل کاکڑ نے نواز شریف کو یقین دلایا کہ غلام اسحاق خان بھی اپنے گھر جائیں گے اور انہوں نے [illegible] اس بات کو یقینی بنائیں گے کہ وہ ایوان صدر چھوڑ دیں۔

میں نے چوہدری نثار سے پوچھا کہ ایم کیو ایم کے خلاف فوجی آپریشن کی کیا حقیقت تھی تو انہوں نے ایک لمبی کہانی سنائی۔ وہ کہنے لگے کہ میں 1992ء میں ہونے والے ملٹری آپریشن کی بات بعد میں بتاؤں گا اس سے پہلے میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ پاکستان سیکرٹ ایجنسیاں اور فوجی اسٹیبلشمنٹ پہلے جس ایم کیو ایم کو ملک دشمن، غدار اور بھارت کا ایجنٹ قرار دیتی تھیں اسے 2002ء کے الیکشن کے بعد سندھ اور مرکز میں خود ہی اقتدار میں لے کر آئیں۔ چوہدری نثار نے 1999ء کے اوائل میں ایک ایسی میٹنگ کا ذکر کیا جس میں نواز شریف اور چیف آف آرمی سٹاف جنرل پرویز مشرف موجود تھے۔ آئی ایس آئی کے اس بریگیڈیئر نے ان دونوں کی موجودگی میں کہا کہ چوہدری نثار کی الطاف حسین سے لندن میں ملاقاتیں ان کے لیے پرابلم پیدا کر رہی ہیں۔ نواز نے بڑے غصے میں اس بریگیڈیئر کو جواب دیا کہ ملک کے لیے پالیسی بنانا آئی ایس آئی کے آفیسر کا کام نہیں ہے۔ اس کا کام محض احکامات پر عملدرآمد کرنا تھا۔ اسی میٹنگ میں ہی 72 سیاستدانوں کے نام پیش کیے گئے تھے جو ادارے کی سرپرستی کر رہے تھے۔

چوہدری نثار کو یہ بات سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ جب وہ ایم کیو ایم کو قومی دھارے میں لانے میں مصروف تھے اس وقت نواز شریف کو یہ بتایا گیا کہ ایم کیو ایم ایک ملک دشمن جماعت تھی اور یہ بھارت کی خفیہ ایجنسی را کے اشاروں پر چل رہی تھی۔ آج وہی فوج اور سیکرٹ ایجنسیاں الطاف حسین کی اسی [illegible] اقتدار میں لے آئی تھیں۔ نثار کے بقول انہوں نے ہمیشہ ایم کیو ایم کی وجہ سے [illegible]

ساری بات [illegible] سیکرٹ ایجنسیوں [illegible] اور اس کی [illegible] تھے۔ نثار کو یہ بات [illegible] سے کہا کہ وہ پہلے ان سے معافی مانگیں [illegible] ورکروں سے [illegible] نثار نے کہا کہ [illegible] ایم کیو ایم کی لیڈر شپ نے [illegible] آباد میں حکومت جوائن کرنے سے پہلے سیکرٹ ایجنسیوں اور جی ایچ کیو سے اس طرح کی معافیاں کیوں نہیں منگوائیں اور بڑے پیچھے سے آ کر جنرل مشرف کی حکومت کو جوائن کر لیا۔

میں اب بھی چوہدری نثار سے 1992ء کے ملٹری آپریشن کے بارے میں پوچھنا چاہ رہا تھا۔ نثار کو ابھی تک یاد تھا کہ جنرل آصف نواز پاکستان ٹیلی ویژن پر بھی یہ دباؤ ڈال رہے تھے کہ وہ ایم کیو ایم کے خلاف ہونے والے آپریشن کی تفصیلات ٹیلی ویژن کے ذریعے پوری قوم کو دکھائیں۔ نواز شریف اس وقت لندن میں الطاف حسین سے ملاقات کرنے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ تاہم نثار نے پی ٹی وی کو آپریشن کی ویڈیو دکھانے سے منع کر دیا۔ جب نواز شریف لندن سے پاکستان لوٹے تو انہوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک ملاقات کی اور اس میں فوجی قیادت کے خلاف خاصی سخت زبان استعمال کی۔ فوج کے خلاف ہونے والی اس تنقید کو کسی نے اخبارات کو لیک کر دیا اور جنرل آصف نواز نے اس کا سخت برا منایا۔ چوہدری نثار نے اس برے وقت میں نواز شریف کے ساتھ کھڑے ہونے کا فیصلہ کیا جس پر غصے میں آ کر جنرل آصف نواز نے سیکرٹ ایجنسیوں کو ان کے پیچھے لگا دیا۔ چوہدری نثار علی کے بھائی جنرل افتخار علی خان اور ان کے ایک اور عزیز پر بڑا دباؤ ڈالا گیا۔ کچھ دنوں بعد چند مشترکہ دوستوں نے جنرل آصف نواز اور چوہدری نثار کے درمیان ایک ملاقات کا اہتمام کیا۔ جنرل آصف نے چوہدری نثار سے شکایت کی کہ ان کے خاندانوں کے تعلقات بہت پرانے تھے، پھر بھی وہ شخص ایک تاجر (نواز شریف) کے لیے ان تعلقات کا خیال بھی نہیں کر رہے تھے۔ نثار نے جنرل آصف کو جواب دیا کہ جناب کس میں اتنی جرأت ہے کہ کوئی آرمی چیف کے خلاف اپنی توپوں کا رخ کر سکے۔ جہاں تک ان کی نواز شریف کے ساتھ دوستی کا تعلق ہے تو وہ اسے نہیں چھوڑیں گے۔

میں نے نثار سے پوچھا کہ فاروق لغاری اور نواز شریف کے درمیان بینظیر بھٹو کے خلاف محاذ

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

[illegible]

کے ممبران سے ہوتا ہے۔

چوہدری نثار کی یہ باتیں سن کر نواز شریف ہکا بکا رہ گئے۔ ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ نواز شریف نے اپنے ہاتھ سے ایک چٹ لکھی اور چوہدری نثار کو تھمائی جس میں اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے نواز شریف نے یہ لکھا تھا کہ وہ یہ ساری باتیں ان سے تنہائی میں بھی کر سکتے تھے۔ نواز شریف نے [illegible] کابینہ کے تمام وزیروں کے سامنے بے عزت کیا ہے۔

[illegible]

[illegible] ان کا انجام ہوا تھا۔

یہ سوال میں نے چوہدری نثار سے پوچھا۔ نثار نے میری طرف دیکھا اور بڑے اعتماد سے [illegible] غلطیاں ہوئی تھیں جس کی وجہ سے ہم سب کو آج [illegible]

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

ریٹائرمنٹ کے بعد وہ فوج میں جائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی مقرر کرنا چاہتے تھے۔ تاہم، عام توقعات کے برعکس جنرل کرامت کا نیشنل سیکیورٹی کونسل بنانے کا متنازعہ بیان ہی ان کے نواز شریف کے ساتھ اختلافات کی کوئی ایک وجہ نہیں تھا۔ نواز شریف کے علم میں یہ بات لائی گئی تھی کہ جب جنرل کرامت اپنے ہی کے ایک ایسے دوست سے ملے جو نواز شریف کے بھی دوست تھے تو انہوں نے وزیراعظم کے بارے میں کچھ ایسے ریمارکس دیے جنہیں پسند نہیں کیا گیا۔ نواز شریف نے جنرل جہانگیر کرامت سے اپنے بارے میں کیے گئے ریمارکس کے بارے میں وضاحت طلب کی تو وہ اپنی بات سے مکر گئے۔ نواز شریف اور جنرل کرامت میں بات اتنی بڑھ گئی کہ متحدہ عرب امارات کے شاہی خاندان کے ایک فرد کو باقاعدہ مداخلت کر کے دونوں میں صلح کرانی پڑی۔

نواز شریف اور جنرل جہانگیر کرامت کے درمیان ٹینشن کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ جنرل جہانگیر کرامت اپنی مرضی کے ایک جنرل علی قلی خان کو اپنے بعد آرمی چیف لگوانا چاہتے تھے اور اس کام کے لیے وہ دن رات لابنگ بھی کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں وزیراعظم نواز شریف کو سیکرٹ ایجنسیوں نے کچھ ایسی رپورٹس بھی بھیجی تھیں جو متوقع آرمی چیف کے خلاف تھیں۔ اس وقت کے ڈی جی آئی ایس آئی جنرل نسیم رانا بھی نواز شریف کے پاس نئے چیف آف آرمی سٹاف کے متوقع امیدواروں کے بارے میں کچھ ایسی فائلیں لے کر آئے تھے جو بکیھو تھیں۔ جرنیلوں کی حرکتوں اور ان کے کرتوتوں کے بارے میں سیکرٹ ایجنسیوں کی تیار کی ہوئی وہ رپورٹس دیکھ کر چوہدری نثار پہلی دفعہ بڑے ڈسٹرب ہوئے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سیکرٹ ایجنسیاں اپنے سروِنگ جرنیلوں کے بارے میں بھی اس طرح کی چیزوں کا خفیہ ریکارڈ رکھتی ہیں۔

اس سے پہلے جب نواز شریف اور صدر فاروق لغاری کے درمیان تعلقات خراب ہوئے تھے تو جنرل کرامت نے بھی ایک خط وزیراعظم کو لکھا تھا جس پر نواز شریف خوش نہیں تھے۔ جنرل کرامت نے اونٹ کی کمر پر آخری تنکا اس وقت رکھا جب انہوں نے نیول وار کالج، لاہور میں نیشنل سیکیورٹی کونسل بنانے کی تجویز پیش کی۔ ان کے اس خطاب سے اسلام آباد میں بیٹھے سب لوگ چونک گئے۔ چونکنے کی وجہ یہ تھی کہ جہانگیر کرامت نے نیشنل سیکیورٹی کونسل کا نام اپنی تقریر میں نہیں لیا تھا لیکن جب آئی ایس پی آر نے خصوصی طور پر نیشنل سیکیورٹی کونسل کا لفظ پریس ریلیز میں شامل کر کے پی ٹی وی کو بھجوایا تو اس سے

حکومت کو احساس ہوا کہ معاملہ بہت سیریس ہے۔

نواز شریف نے سوچا کہ اب کافی ہو گیا ہے۔ جنرل کرامت نے اپنی حدود سے تجاوز کر لیا تھا۔ نواز نے ہر قیمت پر جنرل کرامت کو گھر بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ چوہدری نثار اور شہباز شریف نے جنرل جہانگیر کرامت کو ہٹانے کی مخالفت کی لیکن نواز شریف نے یہ کہہ کر ان کی بات مسترد کر دی کہ وقت آ گیا ہے کہ ملک میں اب سویلین لوگوں کی رٹ قائم کی جائے۔ نواز نے جنرل جہانگیر کرامت کو وزیراعظم ہاؤس بلوایا اور غیر متوقع طور پر کرامت نے مستعفی ہونے کی پیشکش کر دی۔ اسی شام ڈی جی آئی ایس آئی رانا نسیم جنرل جہانگیر کرامت کا استعفیٰ نواز شریف کو دے گئے۔

○○○

اب نواز شریف کو ایک دفعہ پھر ایک نئے آرمی چیف کی تلاش تھی جو ان کے خیال میں ایک سویلین حکومت کو جوابدہ ہو اور وہ نہ تو وزیراعظم کو کسی صدر کے حق میں خط لکھے اور نہ ہی اپنی تقریروں میں کھلے عام نیشنل سیکیورٹی کونسل بنانے کی تجویز پیش کرے۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ پیٹھ پیچھے ملک کے وزیراعظم کے خلاف گفتگو بھی نہ کرے۔ جنرل علی قلی خان کے خلاف چوہدری نثار اور جنرل افتخار علی خان پہلے ہی محاذ بنا چکے تھے اور نواز شریف چوہدری نثار سے پوچھے بغیر کوئی نیا آرمی چیف نہیں لگانا چاہتے تھے۔

جب میں نے نثار سے پوچھا کہ جنرل مشرف کو کس نے آرمی چیف بنوایا تھا تو انہوں نے مجھے کہا کہ نواز شریف نے خود ہی مشہور صحافی سہیل وڑائچ کو جدہ میں دیے گئے اپنے ایک انٹرویو میں یہ کہا تھا کہ انہوں نے چوہدری نثار کے کہنے پر انہیں آرمی چیف لگایا تھا۔

چوہدری نثار نے مجھے جنرل مشرف کو آرمی چیف بنوانے کی کہانی سنانا شروع کی۔

جس شام ڈی جی آئی ایس آئی جنرل رانا نسیم جنرل جہانگیر کرامت کا استعفیٰ نواز شریف کے حوالے کر گئے تو نواز شریف نے اپنے ملٹری سیکرٹری سے کہا کہ وہ کور کمانڈر منگلا لیفٹیننٹ جنرل پرویز مشرف کو کال کریں اور اس سے کہیں کہ وہ رات کے نو بجے سے پہلے پہلے انہیں آ کر ملیں۔ جنرل مشرف کو جب یہ ٹیلیفون کال ملی تو وہ بڑے حیران ہوئے کہ ملک کا وزیراعظم جس نے کچھ دیر پہلے آرمی چیف

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!!blogspot!!com!!

نے استعفیٰ لیا تھا وہ انہیں اس طرح بلا کر کیوں ملنا چاہ رہا ہے۔ جنرل مشرف اسے گھبرا گئے اور انہوں نے ملٹری سیکرٹری سے پوچھا کہ کیا میں وزیراعظم سے ملنے یونیفارم میں آؤں یا سادہ کپڑوں میں! جنرل مشرف کے پوچھنے کا مطلب یہ تھا کہ کیا وزیراعظم ان سے سرکاری طور پر ملنا چاہ رہے تھے یا وہ ان سے کوئی نجی میٹنگ کرنا چاہتے تھے جس کا فوج کی اعلیٰ قیادت کو علم نہ ہونے پائے۔ جنرل مشرف کو بتایا گیا کہ وہ باقاعدہ یونیفارم پہن کر وزیراعظم سے ملنے آئیں۔

تاہم، جنرل پرویز مشرف نو بجے کے دیے ہوئے مقررہ وقت پر وزیراعظم ہاؤس نہ پہنچ سکے۔ یوں پی ٹی وی نے نو بجے کی خبروں میں جنرل جہانگیر کرامت کے استعفیٰ کی خبر تو چلا دی تھی اور ساتھ میں جنرل پرویز مشرف کو نیا آرمی چیف بنانے کا بھی اعلان انہی خبروں میں کیا گیا۔ اس وقت جنرل مشرف اسلام آباد ایئرپورٹ چوک پہنچ چکے تھے جب انہیں موبائل پر ان کے کسی دوست کا فون آیا کہ انہیں نیا آرمی چیف بنا دیا گیا ہے۔ اس وقت جنرل مشرف کو یہ احساس ہوا کہ انہیں ایمرجنسی میں وزیراعظم ہاؤس کیوں بلایا جا رہا ہے۔

چوہدری نثار کے بقول فوج میں ہر آرمی جنرل کی اپنی ایک لابی ہوتی ہے۔ اگر جنرل کی لابی پہلے نہ ہو تو آرمی چیف بننے کے بعد خود بخود بن جاتی ہے۔ تقرری نے جنرل مشرف کو آرمی چیف بنانا تھا تاہم یہ بحث اب بیکار ہے کہ ان کا نام نواز شریف کو کس نے دیا تھا۔

نئے آرمی چیف کی تقرری کے وقت نواز شریف کے پاس تین جرنیلوں کے نام موجود تھے جن میں جنرل علی قلی اور جنرل پرویز مشرف بھی تھے۔ تاہم، شارٹ لسٹنگ کے بعد مقابلہ جنرل علی قلی اور پرویز مشرف میں تھا۔ نواز شریف علی قلی خان سے خوش نہیں تھے خصوصاً جب سے جنرل کرامت کے ساتھ ان کی کشمکش شروع ہوئی تھی۔ جنرل قلی نے فوج کی کسی اندرونی میٹنگ میں کچھ ایسی باتیں کی تھیں جو نواز شریف کو پسند نہیں آئی تھیں۔ اس کے علاوہ جنرل جہانگیر کرامت بھی علی قلی خان کے حق میں تھے تو ایجنسیاں بھی ان کے خلاف چلی گئیں اور یوں جنرل مشرف کو آرمی چیف بنا دیا گیا۔

OOO

نواز شریف کو ہرگز یہ اندازہ نہیں تھا کہ جنرل پرویز مشرف جیسا بظاہر بے ضرر نظر آنے والا

جنرل جسے انہوں نے علی قلی خان کو نظر انداز کر کے آرمی چیف بنایا تھا وہ ایک دن ان کے اقتدار کے لیے سب سے بڑا خطرہ بن کر نمودار ہوگا۔ کارگل کا آپریشن نواز شریف کے لیے ایک جھٹکے سے کم نہیں تھا۔ انہوں نے جن دنوں بھارتی وزیراعظم واجپائی کو لاہور بلایا ہوا تھا اس وقت ان کے اپنے آرمی چیف انہیں بتائے بغیر کارگل پر اپنی فوجیں چڑھا بیٹھے تھے۔ نواز شریف کو جنرل مشرف کے اس خفیہ پلان کا اس وقت پتہ چلا جب واجپائی نے ایک رات خود ٹیلی فون پر نواز شریف کو بتایا کہ ان کی آرمی بھارت کے ساتھ کارگل کے محاذ پر باقاعدہ جنگ لڑ رہی ہے۔

جب نواز شریف کے نوٹس میں یہ بات لائی گئی اس وقت اگر وہ چاہتے بھی تو وہ کارگل کی اس جنگ کو نہ تو روک سکتے تھے اور نہ ہی اسے Reverse کر سکتے تھے۔ معاملات ان کے ہاتھ سے نکل چکے تھے اور جنرل مشرف کے اس ایڈونچر کا نواز شریف کی حکومت پر بہت برا اثر پڑنے والا تھا۔

نواز شریف اور ان کی حکومت کو فوجی قیادت نے کارگل آپریشن کے بارے میں صرف اتنا کچھ بتایا جو ان کے خیال میں سیاسی قیادت کو بتانا چاہیے تھا۔ ساری بات اس وقت کھل کر سامنے آئی جب گورنر ہاؤس لاہور میں نواز شریف کو جنرل پرویز مشرف نے کارگل آپریشن پر بریفنگ دی جس میں اس وقت کے نیول چیف فصیح بخاری اور ایئر چیف پرویز مہدی بھی شامل تھے۔ جب جنرل پرویز مشرف نے اس آپریشن کی تفصیلات بتائیں تو اس میٹنگ کے باقی شرکاء کو تو چھوڑیں، وہاں بیٹھے فصیح بخاری اور پرویز مہدی بھی ہکا بکا رہ گئے۔ ان دونوں نے شدید حیرانی کا اظہار کیا اور بولے کہ انہیں تو کبھی بھی اس آپریشن سے پہلے اعتماد میں نہیں لیا گیا تھا۔ بھارت کے ساتھ ایک کھلی جنگ کی صورت میں ان دونوں نے اپنی جو رائے دی اس سے وہاں بیٹھے تمام لوگوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ان دونوں کی باتوں سے سب کو یہ تاثر ملا کہ اگر بھارت نے کارگل کو بنیاد بنا کر پاکستان پر فضائی اور بحری راستوں سے حملہ کیا تو شاید صورتحال بہت خراب ہو جائے۔ اس میٹنگ میں بیٹھے ہوئے تمام شرکاء کو پہلی دفعہ یہ احساس ہوا کہ کارگل کی وجہ سے پاکستان ایک بہت بڑے خطرے میں گھر گیا تھا۔

میں نے چوہدری نثار سے پوچھا کہ جنرل مشرف یہ دعویٰ کرتے آئے تھے کہ انہوں نے کارگل کا آپریشن نواز شریف کی منظوری سے شروع کیا تھا۔ چوہدری نثار ہنسے اور بولے کہ نواز شریف نے [illegible] [illegible]ف تھے کہ وہ ایک طرف کارگل کا آپریشن شروع کراتے اور دو

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

ماہ کے اندر اندر واجپائی کو لاہور بلا لیتے۔

گورنر ہاؤس لاہور میں ہونے والی اس میٹنگ کے بعد چوہدری نثار کو وزیراعظم نواز شریف نے فون کیا اور کہا کہ وہ فوری طور پر ان کے ساتھ امریکہ جانے کے لیے تیار ہو جائیں کیونکہ یہ پاکستانی فوج کی عزت بچانے کا وقت ہے۔ نواز شریف اس وقت حیران رہ گئے جب چوہدری نثار نے انہیں امریکہ جانے سے منع کیا اور کہا کہ میاں صاحب! جن لوگوں نے اپنے سویلین لیڈروں کو اعتماد میں لیے بغیر کارگل کا ایڈونچر شروع کیا ہے انہیں اب اس کے نتائج بھی بھگتنے دیں۔

نواز شریف نے تب یہ جواب دیا کہ چوہدری صاحب انہیں، میں اپنے ملک کی فوج کو بھارتی افواج کے سامنے ذلیل ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔

نثار نے مجھے بتایا کہ انہوں نے جس طریقے سے نواز کے امریکہ جانے کی مخالفت کی تھی اس کے گواہ شہباز شریف خود ہیں۔

نثار نے اس موقع پر گہرا سانس لیا اور مجھے دیکھ کر بولے کہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ جس فوج کو نواز شریف نے ذلت آمیز شکست سے بچایا تھا اسی نے ہی انہیں ایک قلعے میں ڈال دیا۔

نثار مجھے بتانے لگے کہ یہ بڑی عجیب سی بات ہے کہ جس سیاسی وزرائے اعظم نے فوج کے ساتھ اچھائی کی اسی فوج نے انہیں یا تو پھانسی پر چڑھا دیا یا پھر ایک قلعے میں قید کر ڈالا۔

اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے نثار نے کہا کہ یہ بھٹو ہی تھے جو نوے ہزار پاکستانی فوجی بھارتی قید سے واپس لے آئے تھے اور اسی آرمی نے انہیں پھانسی دی۔ ٹھیک ستائیس سال بعد اسی فوج نے یہی کام نواز شریف کے ساتھ کیا۔ اپنی فوج کی عزت بچانے کے لیے نواز شریف اپنے اوپر تمام تر تنقید سہتے ہوئے 4 جولائی 1999ء کو امریکی صدر بل کلنٹن سے ملنے گئے۔ انہوں نے وہاں امریکی مداخلت کے ذریعے ہماری فوج کی عزت بچائی جو اس وقت بھارتی افواج کی وجہ سے نہایت خطرے میں تھی۔ ٹھیک تین ماہ بعد اسی فوج نے نواز شریف کو ہتھکڑیاں لگا کر وزیراعظم ہاؤس سے گرفتار کر لیا۔

نواز شریف اور جنرل مشرف میں بھی تنازعات پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ان اختلافات میں اصل تیزی اس وقت آئی جب یہ خبریں سامنے آنے لگیں کہ جنرل مشرف کوئٹہ کے کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل طارق پرویز کو نواز شریف سے ملاقات کرنے پر برطرف کرنے والے تھے۔

شہباز شریف، چوہدری نثار اور جنرل مشرف ڈنر پر اکٹھے ہوئے۔ جنرل مشرف نے انہیں بتایا کہ وہ جنرل طارق کو برطرف کرنے والے ہیں۔ نثار نے جنرل مشرف کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر ان کے خیال میں جنرل طارق کے خلاف ایکشن لینا بہت ضروری ہے تو انہیں برطرف کرنے کے بجائے ان کا کہیں ٹرانسفر کر دیں۔ جنرل مشرف نے چوہدری نثار کی اس تجویز سے اتفاق کیا۔

نثار نے شہباز شریف سے بھی کہا کہ وہ نواز شریف کو مت بتائیں کہ ان کی جنرل پرویز مشرف سے جنرل طارق کے معاملے پر کیا بات ہوئی تھی کیونکہ وزیراعظم پہلے ہی خاصے ناخوش تھے۔ تاہم، شہباز شریف کے پیٹ میں یہ بات نہ رہ سکی اور انہوں نے جاتے ہی نواز شریف کو یہ بات فوراً بتا دی کہ جنرل مشرف جنرل طارق پرویز کو ان سے ملاقات کرنے کے الزام میں کوئٹہ کے کور کمانڈر کی پوزیشن سے ٹرانسفر کر رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب نواز شریف کی سسرال میں ہونے والی کسی کی موت پر جنرل مشرف ان سے تعزیت کے لیے ان سے ملنے گئے تو وزیراعظم نے جنرل طارق کا معاملہ ان کے سامنے اٹھایا جس سے ان دونوں کے درمیان خلیج مزید بڑھ گئی۔ اگر ابھی بھی کوئی کمی رہ گئی تھی تو اخبار میں یہ خبر چھپ گئی کہ جنرل طارق کو وزیراعظم نواز شریف سے ملاقات کرنے پر جنرل مشرف نے برطرف کر دیا ہے۔ یہ خبر پڑھ کر نواز شریف خاصے اشتعال میں آ گئے۔ وہ چاہتے تھے کہ فوری طور پر آئی ایس پی آر اس کی ایک وضاحت جاری کرے۔ بات اتنی بڑھ گئی کہ کور کمانڈر راولپنڈی جنرل محمود نے یہ تجویز پیش کی کہ آئی ایس پی آر کے بجائے وزارت دفاع اپنی طرف سے ایک وضاحت جاری کر دے۔ تاہم، غصے سے بھرے نواز شریف نے اس تجویز کو مسترد کر دیا۔

اسی اثناء میں فوج میں یہ افواہ بھی پھیل گئی کہ نواز شریف چار جرنیلوں کو کارگل آپریشن کے متعلق وزیراعظم کو بے خبر رکھنے کے الزام میں برطرف کرنا چاہتے ہیں جن میں جنرل محمود، جنرل عزیز، کور کمانڈر ناردرن ایریاز جنرل جاوید حسن اور ڈی جی ملٹری آپریشنز جنرل توقیر ضیاء شامل ہیں۔

نثار نے کہا کہ اس طرح کا تاثر فوج میں جان بوجھ کر پھیلایا گیا تھا تاکہ ایک سیاسی حکومت کو برطرف کر کے مارشل لاء لگایا جائے جیسا کہ جنرل ضیاء نے 1988ء میں جونیجو حکومت کو برطرف کرنے کے لیے اسی طرح کا بہانہ تراشا تھا کہ وزیراعظم جونیجو اوجڑی کیمپ کے ذمہ دار جرنیلوں کے خلاف کارروائی [illegible]

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

جنرل مشرف نے فوری طور پر چوہدری نثار اور شہباز شریف سے رابطہ کیا اور ان سے پوچھا کہ واقعی نواز شریف ان چار جرنیلوں کو برطرف کرنا چاہتے ہیں۔ جس پر ان دونوں نے انہیں یقین دلایا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ مشرف کو مطمئن کرنے کے لیے انہیں نواز شریف سے چیئرمین جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کمیٹی کا عہدہ بھی دلوا دیا گیا۔

اسی دوران میں جنرل مشرف کے قریبی جرنیلوں نے نواز شریف کو برطرف کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ان کا پلان یہ تھا کہ اگر نواز شریف نے جنرل مشرف کو ہٹانے کی کوشش کی تو وہ اس پر ایکشن لیں گے۔ ان جرنیلوں نے سیاسی حکومت کو ایک باقاعدہ پیغام بھی بھیجا تھا کہ اگر جنرل مشرف کو ہٹانے کی کوشش کی گئی تو وہ اس پر شدید ردعمل ظاہر کریں گے۔ نواز شریف کے گرد بیٹھے سازشیوں نے انہیں خبردار کیا کہ اگر انہوں نے جنرل مشرف کو برطرف نہیں کیا تو فوج انہیں برطرف کر دے گی۔ دونوں اطراف نے اپنے تئیں برطرفی سے بچنے کے لیے اپنے اپنے انداز میں اپنا ردعمل ظاہر کیا اور فتح ان کی ہوئی جن کے پاس ٹینک اور توپیں تھیں۔

میں نے نثار سے پوچھا کہ سننے میں تو یہ بھی آیا تھا کہ جنرل مشرف چاہتے تھے کہ نواز شریف وزارت عظمیٰ کا عہدہ اپنے چھوٹے بھائی شہباز شریف کو دے دیں کیونکہ وہ انہیں زیادہ بہتر لیڈر سمجھتے تھے۔

میری بات سن کر چوہدری نثار مسکرائے اور بولے کہ دراصل شہباز شریف کو تھوڑی سی غلط فہمی ہوئی تھی۔ اگر آپ نواز شریف کے اقتدار کے آخری دن یاد کریں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ آرمی قیادت اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ وہ نواز شریف کو کسی بات پر ڈکٹیشن دیتی۔ جنرل مشرف نے دراصل مذاق میں یہ بات کی تھی۔ اصل واقعہ کچھ یوں تھا کہ جنرل مشرف، نثار اور شہباز اکٹھے لنچ کر رہے تھے جب جنرل مشرف نے مذاق کے انداز میں شہباز شریف سے کہا کہ آپ پنجاب پر حکمرانی کرنے کی بجائے اسلام آباد کیوں نہیں آ جاتے۔ مشرف کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اسلام آباد آ کر ایک طرح سے ڈپٹی پرائم منسٹر کا سا رول ادا کریں اور نواز شریف کو ان کے مسائل سلجھانے میں ان کی مدد کریں۔

○○○

12 اکتوبر 1999ء کی شام چوہدری نثار علی خان وزیر اعظم ہاؤس میں موجود تھے جب نواز شریف نے جنرل پرویز مشرف کو برطرف کر کے جنرل ضیاء الدین بٹ کو آرمی چیف مقرر کر دیا۔ اس سے پہلے یکم اکتوبر کو چوہدری نثار علی خان ولی خان سے ملنے کے لیے لندن گئے تھے تا کہ وہ انہیں دوبارہ حکومت میں واپس لا سکیں۔ وہ لندن میں دس دن رہے اور 10 اکتوبر کو پاکستان واپس لوٹے تھے۔ چوہدری نثار نے 11 اکتوبر کو نواز شریف سے ملنے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ وہ ملتان گئے ہوئے تھے۔

12 اکتوبر والے دن شہباز شریف نے چوہدری نثار کو وزیر اعظم ہاؤس لنچ پر بلایا۔ دونوں نے وزیر اعظم ہاؤس میں شہباز شریف کے کمرے میں بیٹھ کر لنچ کیا۔ ان دونوں کو بتایا گیا کہ وزیر اعظم ابھی ملتان سے واپس لوٹے ہیں اور کسی میٹنگ میں مصروف ہیں۔ نثار اور شہباز نے وزیر اعظم کو پیغام بھجوایا کہ وہ ساتھ والے کمرے میں موجود ہیں۔ جب وہ فارغ ہو جائیں تو انہیں بلا لیا جائے۔

اسی اثناء میں شہباز شریف سو گئے اور چوہدری نثار ٹی وی دیکھتے رہے۔ اچانک چوہدری نثار نے پی ٹی وی پر جنرل مشرف کی برطرفی کی خبر سنی اور فوری طور پر شہباز شریف کو جگایا۔ شہباز شریف کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ نواز شریف نے جنرل مشرف کو برطرف کر دیا ہے۔ انہوں نے بڑے غصے میں چوہدری نثار سے کہا کہ وہ ابھی جا کر وزیر اعظم کو پنجاب کی وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ دے دیں گے کیونکہ اگر وہ اپنے سگے بھائی پر بھروسہ نہیں کر سکتے تو اس کے بعد وزیر اعلیٰ رہنے کا کوئی فائدہ نہیں!

نثار نے بپھرے ہوئے شہباز کو ٹھنڈا کیا اور کہا کہ ان کے لیے پہلے ہی بہت بڑے مسائل کھڑے ہو گئے ہیں، وہ اب نئے مسائل نہ کھڑے کریں۔ چوہدری نثار وزیر اعظم ہاؤس سے نکلے اور راولپنڈی میں واقع اپنے گھر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد انہیں شہباز شریف کا فون آیا کہ چند فوجی افسران نے پی ٹی وی پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی، انہیں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ نثار نے دوبارہ اپنی گاڑی نکالی اور وزیر اعظم ہاؤس کی طرف دوڑا دی لیکن اب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ فوجی وزیر اعظم ہاؤس کو گھیرے میں لے چکے تھے اور کسی نے انہیں اندر نہیں جانے دیا۔

چوہدری نثار کو سمجھ آ گئی کہ سارا کھیل ختم ہو گیا ہے۔

○○○

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

چوہدری نثار جب اپنے گھر پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ فوجیوں نے اسے گھیرا ہوا تھا۔ پہلے تو انہوں نے انہیں گھر کے اندر جانے کی اجازت نہیں دی۔ آخر کار بحث کے بعد انہیں اندر جانے دیا گیا اور وہ دو سال تک اسی گھر میں قید رہے۔

ایک رات انہیں اپینڈکس کا شدید درد ہوا۔ وہ ساری رات درد سے تڑپتے رہے لیکن فوجیوں نے انہیں علاج کے لیے باہر نہیں جانے دیا۔ صبح کے وقت کہیں جا کر ان کا آپریشن ہوا۔

یہ چوہدری نثار علی خان کی زندگی کے سب سے مشکل ترین دن تھے۔ انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک دن یہ فوجی ان کے گھر کے گرد گھیرا ڈال کر انہیں اپنے ہی گھر میں قید کر لیں گے۔ یہ فوجی ان کی اور ان کے بچوں کی ڈاک کو چیک کرتے تھے۔

ایک دن میجر اور ایف آئی اے کے دو آفیسرز چوہدری نثار سے ملنے کے لیے گھر آئے۔ ان دونوں نے نثار سے کہا کہ وہ نواز شریف کے خلاف ایک تحریری بیان دیں کہ انہوں نے ان سے رائیونڈ کے لیے جیپس کی منظوری لی تھی۔ نثار نے ان سے کاغذ چھین لیا اور نواز شریف کے حق میں بیان لکھ کر دے دیا۔

جنرل مشرف کو چوہدری نثار کی اہمیت کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ جس دن مشرف نے رفیق تارڑ کو ہٹا کر خود صدر بننے کا فیصلہ کیا، اس سے ایک دن پہلے غیر متوقع طور پر اس وقت کے ڈی جی آئی ایس آئی جنرل محمود ان کے گھر پر تشریف لائے۔ جنرل محمود تین گھنٹے تک چوہدری نثار کے ساتھ رہے۔ وہ دو گھنٹے پچاس منٹ تک بولتے رہے اور جنرل محمود سنتے رہے۔ ان تین گھنٹوں میں جنرل محمود صرف دس منٹ کے لیے بول پائے۔

جونہی جنرل محمود چوہدری نثار سے ہاتھ ملا کر صوفے پر بیٹھے نثار نے ان کے بولنے سے پہلے ہی ان پر تین باتیں بڑی واضح کر دیں۔ انہوں نے جنرل کو بتایا کہ وہ نواز شریف کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے، پی ایم ایل کیو کو جائن نہیں کریں گے اور جنرل مشرف کی حکومت کے حق میں کوئی بیان جاری نہیں کریں گے۔

جنرل محمود نے مسکراتے ہوئے کہا کہ چلیں ٹھیک ہے کہ آپ نواز شریف کو نہیں چھوڑنا چاہتے ہیں لیکن نواز شریف کے بارے میں کیا خیال ہے جو انہیں چھوڑ کر رات کے اندھیرے میں جدہ چلے گئے تھے۔

نثار نے جنرل محمود سے کہا کہ اگر آج انہوں نے نواز شریف سے بے وفائی کر کے اس قید سے رہائی پا بھی لی تو وہ ساری عمر اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکیں گے۔

یہ بات سن کر جنرل محمود واپس چلے گئے۔

فوجیوں کے ہاتھوں اپنے گھر میں ہی دو سال تک قید رہنے کی وجہ سے چوہدری نثار کے بچوں پر بڑا شدید نفسیاتی اثر پڑا۔ اس برے وقت میں چوہدری نثار کے بچوں کو سب سے زیادہ دباؤ کا سامنا کرنا پڑا۔

جب چوہدری نثار اپنے گھر میں قید تھے تو جنرل مشرف نے انہیں اپنے ساتھ ملانے کی کوششیں جاری رکھیں۔ انہیں مختلف قسم کی آفرز دی جاتی رہیں۔ انہیں پی ایم ایل کیو کا صدر بنانے سے لے کر وزیر اعظم بنانے تک کی بھی پیشکش کی گئی۔

اسی اثناء میں پی ایم ایل نواز کے لیڈروں کی طرف سے چوہدری نثار علی خان پر انگلیاں اٹھائی جانے لگیں۔ سب کو اس بات کا پتہ تھا کہ جنرل مشرف کو آرمی چیف بنوانے والے چوہدری نثار تھے لہذا حکومت کی برطرفی کا ذمہ دار ایک لحاظ سے انہیں بھی ٹھہرایا جا رہا تھا۔ ان دنوں کلثوم نواز اور تہمینہ دولتانہ نے جنرل مشرف کی حکومت کو مشکل میں ڈالا ہوا تھا۔ دھیرے دھیرے یہ بات مشہور ہونا شروع ہو گئی کہ جنرل مشرف نے نواز شریف، شہباز شریف، خواجہ آصف، اسحاق ڈار اور پارٹی کے دیگر ٹاپ لیڈروں کو تو جیلوں اور اٹک قلعے میں رکھا ہوا تھا جبکہ چوہدری نثار وہ واحد لیڈر رہتے تھے جنہیں گھر پر قید کیا گیا تھا۔ بہت سارے سوالیہ نشانات چوہدری نثار علی خان کی نواز شریف اور پارٹی سے وفاداری پر اٹھائے جا رہے تھے۔ اور تو اور، کلثوم نواز کی بھی یہی سوچ تھی کہ چوہدری نثار جنرل مشرف کے ساتھ ملے ہوئے ہیں اور اس کے بدلے میں انہیں جیل کے بجائے گھر میں رکھا گیا ہے۔ یہ ساری باتیں کلثوم نواز، نواز شریف کے کانوں میں ڈال رہی تھیں جب وہ ان سے ملنے جیل جاتیں۔ اسی اثناء میں یہ بات بھی مشہور کی گئی کہ کسی نے رات کے اندھیرے میں چوہدری نثار کو باقاعدہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے چکری کی طرف جاتے ہوئے موٹر وے پر دیکھا تھا۔ ان تمام باتوں کا نواز شریف پر بڑا اثر ہو رہا تھا۔ انتہائی غیر محسوس طریقے سے نواز شریف ان باتوں پر قائل ہونا شروع ہو گئے تھے کہ چوہدری نثار علی خان بھی جنرل مشرف کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ نواز شریف کا ان باتوں پر فوراً یقین کرنے کی ایک وجہ اور بھی تھی کہ

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

جنرل مشرف اور چوہدری نثار پچھلے کئی برسوں سے ایک دوسرے کے دوست تھے اور نثار کے کہنے پر ہی انہیں آرمی چیف مقرر کیا گیا تھا۔

چوہدری نثار کو ان باتوں کا علم نہیں تھا۔ انہیں پہلی دفعہ نواز شریف کا ان کی ذات پر شک کرنے کا اس وقت پتہ چلا جب ان کی قید ختم کی گئی۔ چوہدری نثار رہائی کے بعد سیدھے لندن چلے گئے۔ وہاں انہیں نواز شریف کا فون آیا۔ انہوں نے پوچھا کہ انہوں نے رہائی کے بعد جہاں دیگر لوگوں کا نام لے کر شکریہ ادا کیا وہاں انہوں نے ان کا نام کیوں نہیں لیا۔ اس پر چوہدری نثار نے انہیں جواب دیا کہ میاں صاحب! مجھے ان تمام لوگوں نے فون کرکے مبارکباد دی تھی۔ میں آپ کے فون کا انتظار کرتا رہا لیکن آپ نے بھی فون کرکے مبارکباد نہیں دی لہٰذا میں نے بھی آپ کا شکریہ ادا کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

چوہدری نثار اور نواز شریف کے درمیان ٹیلی فون پر ہونے والی اس مختصر گفتگو کے بعد یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ اب دونوں کے سیاسی اور ذاتی تعلقات جو 1985ء میں شروع ہوئے تھے، وہ سترہ سال بعد آخر کار شکوک و شبہات کی نذر ہو گئے تھے۔ چوہدری نثار نے سیاست چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

جب وہ واپس آئے تو انہوں نے اپنے قریبی ساتھیوں کو بتایا کہ انہوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ سیاست کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیں گے۔ چوہدری نثار کے ساتھیوں نے اس پر بڑا شدید ردعمل ظاہر کیا۔ انہوں نے چوہدری نثار کو اپنا فیصلہ تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔ اب نثار کے لیے ایک اور بڑا مسئلہ کھڑا ہو گیا کہ وہ کس پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑیں کیونکہ وہ اپنے تئیں مسلم لیگ نواز کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ چکے تھے جس کی قیادت نے انہیں اس بات پر سراہنے کی بجائے کہ انہوں نے پارٹی سے برے وقتوں میں غداری نہیں کی تھی، ان پر شک کیا تھا کہ وہ شاید جنرل مشرف کے ساتھ ملے ہوئے ہیں اور ان کی کردار کشی کی گئی تھی۔

چوہدری نثار نے مجھے بتایا کہ اپنی سیاسی تاریخ کے اس اہم مرحلے پر میرے پاس دو راستے تھے یا تو میں پی ایم ایل نواز کے ساتھ چمٹا رہوں یا پیپلز پارٹی کو جائن کروں۔

انہوں نے بینظیر بھٹو کی قریبی ساتھی آمنہ پراچہ جو ان کی فیملی فرینڈ تھیں کے ذریعے پیپلز پارٹی جائن کرنے کے لیے خفیہ بات چیت بھی شروع کر دی تھی۔

جب اس بات کا پتہ شہباز شریف کو چلا کہ چوہدری نثار نے سیاست ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو انہوں نے فوری طور پر چوہدری نثار کو اس سے روکا۔ اکتوبر 2002ء کے الیکشن سر پر تھے۔ شہباز شریف نے چوہدری نثار کو اپنی پرانی دوستی کا حوالہ دے کر اپنی پارٹی کی طرف سے الیکشن لڑنے پر راضی کر لیا۔

نواز شریف نے فون کرکے چوہدری نثار علی خان کو جدہ آنے کی دعوت دی۔ جب تین سال بعد نواز شریف اور چوہدری نثار کی ملاقات ہوئی تو نثار نے گلہ کیا کہ جنرل مشرف کی برطرفی سے پہلے ان سے مشورہ کیوں نہیں کیا گیا تھا۔ اس پر نواز شریف نے یہ جواز پیش کیا تھا کہ اگر وہ انہیں اور شہباز شریف کو یہ بات بتاتے تو شاید وہ انہیں جنرل مشرف کو برطرف نہ کرنے دیتے اور وہ ہر قیمت پر جنرل کو گھر بھیجنا چاہتے تھے۔ چوہدری نثار نے نواز شریف سے یہ بھی شکایت کی کہ وہ ان تین سالوں میں اتنے برے حالات سے گزرے لیکن انہوں نے کبھی ان سے یا پارٹی سے بے وفائی نہیں کی لیکن اس کے باوجود بھی پارٹی کے لیڈران کے خلاف پراپیگنڈہ کرنے میں مصروف تھے۔

چوہدری نثار علی خان کا اشارہ کلثوم نواز کی طرف تھا جن سے کئی برسوں سے ان کی بول چال تک بند تھی اور آج تک ہے۔

○○○

جب میں چوہدری نثار علی خان سے 2003ء میں ان کے گھر پر ملا تھا، اس وقت پاکستان کا نیوکلیئر ایشو ایک دفعہ پھر تنازعات میں گھر چکا تھا۔ باتوں باتوں میں چوہدری صاحب نے اس بات کا انکشاف کیا کہ 1991ء میں ایک دن اس وقت کے آرمی چیف چوہدری نثار سے ملے اور انہیں وزیراعظم نواز شریف کے نام ایک بڑا خفیہ پیغام دیا۔ جنرل اسلم کے بقول کہ اگر پاکستان ایک مسلم ملک کو نیوکلیئر ٹیکنالوجی فراہم کرنے پر تیار ہو جائے تو وہ اس کے بدلے میں بارہ ارب ڈالر دینے کو تیار تھا۔

یہ سن کر چوہدری نثار علی خان جو اس وقت وزیر پٹرولیم کے علاوہ نواز شریف کے اسپیشل اسسٹنٹ بھی تھے، ان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ انہوں نے جنرل کو بتایا کہ اس طرح کی

www.freepdfpost.blogspot.com

!!!allurdupdfnovels!!!blogspot!!!com!!!

سودے بازی پاکستان کے مفاد میں ہرگز نہیں ہے۔ حیرانی میں ڈوبے چوہدری نثار نے جنرل سے پوچھا کیا انہیں اس بات کا احساس ہے کہ وہ وزیر اعظم کے نام کس طرح کی تجویز بھیج رہے ہیں اور پاکستان پر مسلم ملک کو نیوکلیئر ٹیکنالوجی ایکسپورٹ کرنے کے الزامات کی بنا پر کس طرح کے سنگین نتائج کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

آرمی چیف چوہدری نثار کی یہ بات سن کر پھر بھی اپنی بات پر ڈٹے رہے اور انہوں نے کہا کہ آپ ایک دفعہ وزیر اعظم نواز شریف سے بات تو کریں۔ وہ اس ڈیل کے ذریعے پاکستان کو بڑی آسانی سے بارہ ارب ڈالر دلوا سکتے تھے۔

جب چوہدری نثار نے نواز شریف کو جنرل کی اس پیشکش کے بارے میں بتایا تو وہ بھی ششدر رہ گئے اور انہوں نے نہایت نفرت بھرے لہجے میں اس تجویز کو نہ صرف مسترد کیا بلکہ کہا کہ کس طرح آرمی چیف کسی بھی ملک کو نیوکلیئر ٹیکنالوجی فروخت کرنے کی اس طرح کی احمقانہ تجاویز اپنے دماغ میں لیے گھوم رہا ہے۔

یہ واقعہ سنا کر چوہدری نثار نے مجھے کہا کہ عمومی طور پر ہمارے یہ فوجی جرنیل سیاسی قیادت کو نااہل سمجھتے ہیں کہ شاید یہ ملک چلانے کے قابل نہیں ہوتے۔ اب بھلا بتائیں کہ ایسے آرمی چیف کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جو محض امریکہ کو سبق سکھانے کے نام پر ایک اسلامی ملک کو بارہ ارب ڈالر کے عوض ایٹم بم فروخت کرنے کا منصوبہ بنائے بیٹھے ہیں۔

میں چوہدری نثار کی یہ بات سن کر یہ سوچتا اور مسکراتا ہوا ان کے گھر سے باہر آ گیا کہ جنرل اسلم بیگ پہلے آرمی چیف نہیں تھے جن کے ذہن میں اتنے بڑے بڑے اعلیٰ خیالات پرورش پا رہے تھے۔ جنرل بیگ سے بڑا کام تو جنرل مشرف نے کر دکھایا تھا جنہوں نے نہ صرف کارگل پر جنگ شروع کی، نواز شریف کے ذریعے امریکہ کو درمیان میں ڈال کر بھارت کو حملہ کرنے سے بچایا اور اسی کارگل کو استعمال کر کے وزیر اعظم [illegible] عرصے سے اس ملک پر نو سال حکومت کی اور سب سے بڑھ کر انہوں نے چوہدری نثار کو استعمال کر کے اپنا آپ کو آرمی چیف بھی لگوایا تھا۔

سیاستدان کتنے ہی چالاک کیوں نہ ہو جائیں وہ ان فوجی جرنیلوں کے مقابلے میں

زیرو ہیں۔ آپ تصور کریں کہ اگر سیاسی طور پر چالاک اور سمجھدار یہ فوجی جرنیل ہمارے سیاستدان ہوتے اور موجودہ اور اوسط درجے کی ذہانت رکھنے والے یہ سیاستدان ان کی جگہ فوجی جنرل ہوتے تو شاید پاکستان آج ایک ترقی یافتہ ملک بن چکا ہوتا!

○○○

میرا چوہدری نثار علی خان کے بارے میں تاثر بڑا اچھا تھا۔ تاہم مجھے اندازہ نہیں تھا کہ مجھ جیسے سیاسی رپورٹنگ کے شوقین بہت جلد ان لیڈروں کی باتوں میں آ جاتے ہیں اور انہیں پتہ نہیں کیا کچھ سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ جونہی چوہدری نثار نے قومی اسمبلی میں اپنے پر پرزے پھیلانا شروع کیے تو یہ وہ شخص نہیں تھے جن سے مل کر میں نے ان کا انٹرویو کیا تھا۔ ان کی آواز اور رویے میں رعونت اور تکبر آ چکا تھا۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ کسی سے ہاتھ بھی ملائیں تو اس کے بعد واش روم جا کر اپنے ہاتھ دھوتے ہیں۔ ایک دن انہوں نے مجھے بلا کر جنرل مشرف کے ایک وزیر کے سکینڈل کے دستاویزی ثبوت دیے۔ وہ وزیر ان کے حلقے میں ان کا روایتی حریف تھا۔ خبر اچھی تھی لہذا میں نے فائل کر دی۔ کچھ دنوں بعد ان کا مجھے پھر فون آیا۔ وہ بڑے پریشان تھے۔ چکری کے قریب واقع ان کے گاؤں سے ملحقہ زمینوں کو فوجیوں نے ایکوائر کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ وہاں کوئی فوجی تنصیب بنانا چاہتے تھے۔ چوہدری نثار کی اپنی زمینیں بھی اس میں آ رہی تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ میں اس پر ایک سٹوری فائل کروں۔ انہوں نے مجھے کچھ کاغذات بھی دیے۔ میں نے اپنے ایڈیٹر سے بات کی تو انہوں نے زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ بہرحال، میں نے میرٹ پر اپنے ایڈیٹر کو راضی کر لیا کہ ہمیں یہ خبر شائع کرنی چاہیے۔ اس کام میں دو تین دن لگ گئے۔ ایک شام مجھے چوہدری نثار کا بڑے غصے میں فون آیا کہ میں نے اب تک وہ خبر کیوں نہیں فائل کی۔ میں ان کی ٹون سن کر بڑا حیران ہوا۔ وہ ایسا ظاہر کر رہے تھے جیسے وہ میرے باس ہوں اور میں کسی سرکاری محکمے کا ملازم۔ اس دن کے بعد میرے ان سے بھی تعلقات ٹھیک نہیں رہے ہیں نہ میں نے بھی ان سے ہاتھ ملانے کا سوچا ہے۔ مجھے احساس ہوا کہ یہ سب سیاستدان صحافیوں کو محض استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ ان کی مرضی کی خبر کر دیں تو آپ بڑے اچھے اور زبردست صحافی ہیں۔ اگر آپ اپنے پروفیشنلزم کو فالو کریں گے تو پھر آپ ایک لمحے میں اپنی اوقات پر آ جاتے ہیں۔ میں نے چوہدری نثار کے اس رویے سے سبق ہی سیکھا اور اس کے بعد میں

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

نے کسی سیاستدان کو اپنا دوست سمجھنے کی حماقت نہیں کی۔ چوہدری نثار سے رہی سہی امیدیں اس وقت ختم ہوگئیں جب ڈان ٹی وی کے رپورٹر اعزاز سید نے اپنے چینل پر یہ خبر بریک کی کہ چوہدری نثار اور شہباز شریف آرمی چیف اشفاق پرویز کیانی سے اب تک چھ خفیہ ملاقاتیں کر چکے تھے۔ اس خبر سے یہ بات ثابت ہوئی کہ جیلوں میں مار کھانے کے باوجود بھی یہ سیاستدان فوج کے ساتھ مل کر اس ملک اور اس کی سیاست کے خلاف سازشیں کرنے سے باز نہیں آتے۔ جنرل مشرف کے دور میں ماضی سے سبق حاصل کرنے کے دعویدار ایک دفعہ پھر سے آرمی چیف کے دروازے پر رات کو چوروں کی طرح دستک دے رہے تھے۔

جنرل علی قلی خان

جس دن میں نے چوہدری نثار علی خان کا انٹرویو کیا تھا اور انہوں نے جنرل علی قلی کے بارے میں کچھ ایسی باتیں کی تھیں جس کے بعد مجھے یہ یقین تھا کہ اس سابق جنرل سے اب گفتگو کرنا شاید اتنا مشکل نہیں رہ گیا ہے۔ ایک دن میں اسلام آباد میں واقع فرانسیسی سفارتخانے کی کسی تقریب میں شامل ہونے کے لیے گیا تو وہاں علی قلی کے بھائی رضا علی خان سے ملاقات ہوئی۔ پتہ چلا وہ پشاور میں فرانسیسی قونصل خانے میں اپنی خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ میرے لیے یہ بڑا سنہری موقع تھا کہ میں جنرل قلی کے بھائی کے ذریعے ان کا انٹرویو کرنے کی کوشش کروں کیونکہ نثار کے انٹرویو کے بعد مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ جنرل علی کے پاس بتانے کو بہت کچھ ہوگا۔

دو تین بعد آخر میرا جنرل علی قلی سے رابطہ ہوگیا۔ میرا اندازہ درست نکلا، انہوں نے چوہدری نثار کا انٹرویو پڑھ لیا تھا اور اب وہ مجھے گفتگو کرنے کا وقت دینے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔

میں جنرل علی قلی سے ملنے کے لیے ان کے راولپنڈی میں جی ایچ کیو کے قریب واقع گھر میں گیا۔ جنرل قلی اس وقت گھر پر اکیلے تھے۔ انتہائی عزت و احترام اور شائستگی کے ساتھ وہ مجھے اندر لے گئے اور بتانے لگے کہ ساتھ والا گھر سابق آرمی چیف جنرل وحید کاکڑ کا ہے۔ جونہی انہوں نے جنرل کاکڑ کا نام لیا تو میرے اندر ایک رپورٹر کا لالچ پھر جاگ پڑا اور میں نے ان سے اسی وقت درخواست کر

www.freepdfpost.blogspot.com

allurdupdfnovels.blogspot.com

[illegible] میں ان کا دل سے مشکور ہوں کہ ابھی میں جنرل علی قلی اور جنرل کاکڑ سے وقت لے کر [illegible] علی قلی سے جنرل کاکڑ کا ذکر شروع کرنے کی بات کر رہا تھا کہ ایک پارٹیشن نوجوان جنرل قلی کے گھر آ گیا۔ جنرل صاحب نے اس سے میرا تعارف کروایا اور بتایا کہ یہ جنرل وحید کاکڑ کے بیٹے ہیں۔ میں دل ہی دل میں بہت خوش ہوا کہ کبھی اتفاق سے قسمت میرے حق میں تھی اور ہو سکتا ہے کہ بہت جلد کاکڑ صاحب سے بھی ملاقات ہو جائے اور 1993ء کے پاکستانی سیاست کے انتہائی اہم سالوں پر سے پردہ اٹھا سکے کہ کیا ہوا کیسے انہوں نے نواز شریف اور غلام اسحاق خان کو گھر بھیجنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ تاہم آنے والے دنوں میں میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا کیونکہ بقول علی قلی وہ ایک ریٹائرڈ زندگی گزار رہے تھے اور کسی صحافی سے ملنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

میں نے باتوں باتوں میں جنرل علی قلی کو تھوڑا سا جذباتی پایا۔ اپنے ساتھ اس ہونے والی ناانصافی پر وہ پانچ سال بعد بھی ناخوش تھے۔ باپ سے بیٹا اور بیٹے سے پوتے تک فوج میں جانے کی روایت ٹوٹ گئی تھی۔ علی قلی کا بیٹا فوج میں چھ سال نوکری کرنے کے بعد کیپٹن کے طور پر ریٹائرڈ ہو کر گھر آ گیا تھا۔ یوں جنرل حبیب اور جنرل علی قلی کی روایت تیسری نسل پر آ کر ختم ہو گئی تھی۔

علی قلی نے مجھے جو کمال بات بتائی وہ یہی تھی کہ انہیں سینئر موسٹ ہونے کے باوجود بھی آرمی چیف نہیں بنایا گیا تھا اور یہ ان کا حق بنتا تھا۔ جب جنرل علی قلی نے یہ خبر سنی کہ جنرل مشرف کو چیف آف آرمی سٹاف بنا دیا گیا تھا تو انہوں نے اسی وقت خدا کا شکر ادا کیا کہ آج ان کا باپ جنرل حبیب یہ خبر سننے کے لیے زندہ نہیں تھا۔

جنرل حبیب ایک پروفیشنل اور قابل جنرل تھے۔ جنرل حبیب اور جنرل موسیٰ دونوں کورس میٹ بھی تھے۔ جنرل موسیٰ ایک رنگروٹ تھے جبکہ اس کے برعکس جنرل حبیب نے باقاعدہ انڈین ملٹری میں کمیشن کے ذریعے آرمی جوائن کی تھی۔ اگرچہ جنرل موسیٰ اس وجہ سے سینئر تھے کہ ان کا پاس آؤٹ جنرل حبیب سے پہلے ہوا تھا لیکن جہاں تک اہلیت اور خوبیوں کا تعلق تھا ان کا جنرل حبیب سے کوئی جوڑ نہیں بنتا تھا۔ جنرل ایوب کو دراصل ایک اوسط درجے کے جنرل کی ضرورت تھی اور جنرل موسیٰ ان کی ذات کے لیے بہت موزوں تھے۔ یوں 1959ء میں صرف 46 سال کی عمر میں جنرل ایوب نے جنرل حبیب کو ریٹائرڈ کر دیا۔

جب جنرل حبیب ایک افسردہ اور ٹوٹے دل کے ساتھ ریٹائرڈ ہو کر گھر آئے تو انہوں نے اپنے بیٹے قلی کو بلایا اور اسے کہا کہ جاؤ آرمی جوائن کرو کہ تم نے ایک دن آرمی چیف بننا ہے۔

اپنے باپ کے بارے میں بات کرتے ہوئے علی قلی تھوڑے سے جذباتی ہوئے اور ماضی میں کھو گئے۔ وہ مجھے بتانے لگے کہ جب ان کی سب سے پیاری بیٹی مس زیب (جو 2003ء میں ایم این اے تھیں۔ وہ گوہر ایوب کی بیوی اور عمر ایوب خان کی والدہ ہیں) ان سے ملنے کراچی گئیں تو وہ اپنے بیٹے علی قلی کے فوج میں مستقبل کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ اگرچہ وہ بستر پر بیمار پڑے تھے لیکن وہ اپنے بیٹے کے فوج میں مستقبل کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ جنرل حبیب نے اپنی بیٹی کو بتایا کہ ان سے انتہائی ضروری بات کرنی ہے۔ اپنے باپ کی یہ بات سن کر زیب ہمہ تن گوش ہو گئیں۔ وہ اپنے باپ کی طرف جھکیں تاکہ وہ سن سکیں کہ وہ ایسی کونسی خاص بات ان سے کرنا چاہتے تھے۔

جنرل حبیب نے اپنی بیٹی کے کانوں میں سرگوشی کی اور بولے کہ زیب دیکھو تمہارا بھائی جنرل علی آج اپنی محنت اور قابلیت کی بنیاد پر اتنے بڑے عہدے پر پہنچا ہے۔ تمہارے شوہر گوہر ایوب خان کی سیاست اس کے آرمی چیف بننے کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننی چاہیے۔ تم لوگوں کی وجہ سے علی قلی کے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہونا چاہیے۔

ایک بیٹی نے اپنے باپ کو حیران بھری نظروں سے دیکھا اور بولی کہ بابا! آپ یہ کیسے سوچ سکتے ہیں کہ ایک سگی بہن اپنے میاں کی سیاست کی وجہ سے اپنے بھائی کو مسائل میں گھرتے دیکھ سکتی ہے۔

زیب نے اپنے باپ کو تسلی دی کہ وہ پریشان نہ ہوں۔ اللہ بہتر کرے گا۔

جنرل قلی اب اپنے باپ کی یادداشتوں میں کھو چکے تھے۔ اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد جنرل حبیب کی زندگی اتنی آسان نہیں رہی تھی۔ وہ نوجوان تھے۔ انہوں نے کاروبار کرنے کا فیصلہ کیا۔ جونہی ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت آئی تو جنرل حبیب پر کرپشن کے الزامات لگا کر انہیں جیل بھیج دیا گیا۔

اصل وجہ کچھ اور تھی۔

دراصل جنرل حبیب اور جنرل یحییٰ خان ایک دوسرے کے بڑے قریب تھے۔ جنرل یحییٰ نے کسی دور میں جنرل حبیب کے ساتھ کام کیا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یحییٰ چاہتے تھے کہ جنرل حبیب نیشنل پولیس [illegible] کو چلائیں۔ شروع میں جب حبیب نے مزاحمت کی تو ان کا خیال تھا کہ ان کے پاس کسی

www.freepdfpost.blogspot.com

!!!allurdupdfnovels!!!blogspot!!!com!!!

اخباری ادارے کو چلانے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ تاہم جنرل بیچ نہیں پائے۔ وہ چاہتے تھے کہ جنرل حبیب اس ادارے کے مالی معاملات کو سنبھال لیں۔ مشہور صحافی اور کالم نگار زیڈ اے سلہری کو ایڈیٹر بنایا گیا۔ انہی دنوں پاکستان ٹائمز میں ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف ایک خبر چھپی۔ اس خبر کا جنرل حبیب سے کوئی تعلق نہیں تھا کیونکہ وہ اخبار کے ایڈیٹر تو نہیں تھے۔ تاہم ذوالفقار علی بھٹو اس خبر سے بڑے شدید ناراض ہوئے اور انہوں نے یہ بات دل میں رکھ لی۔ ان دنوں پاکستان میں نئے الیکشن ہو رہے تھے۔ ایک دن ذوالفقار علی بھٹو اور مصطفیٰ کھر کے ساتھ جنرل حبیب سے ملنے آئے اور ان سے اپنی پارٹی کے لیے چندہ مانگا کیونکہ جنرل حبیب اپنا ذاتی کاروبار کرتے تھے۔

جنرل علی قلی کے لبوں پر ایک مسکراہٹ پھیلی۔ انہوں نے مجھے کہا کہ دراصل ان کے والد کا مزاج ایک فوجی کا تھا کہ ایک بزنس مین کا۔ لہٰذا انہوں نے بھٹو صاحب کو ان کی پارٹی کے لیے چندہ دینے سے انکار کر دیا۔ بات اگر یہیں تک رہتی تو بھی معاملہ ٹھیک تھا۔ جنرل حبیب نے بھٹو صاحب کو یہاں تک کہہ دیا کہ کیونکہ وہ ذاتی طور پر مسلم لیگ کے ساتھ ہیں لہٰذا وہ اس پارٹی کو انتخابات جیتنے کے لیے اپنی جیب سے چندہ دے چکے ہیں۔

جنرل علی قلی کے بقول ان کے والد صاحب کو بھٹو صاحب کے مزاج کا اندازہ نہیں تھا۔ بھٹو صاحب نے ان کے باپ کی اس بات کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا اور جونہی وہ اقتدار میں آئے جنرل حبیب کو گرفتار کر کے ہری پور جیل بھیج دیا گیا۔ جونہی جنرل حبیب کی گرفتاری کی خبر پھیلی تو سب لوگوں نے بھٹو صاحب کے اس فیصلے کی شدید مذمت کی اور صرف چند دن بعد جنرل حبیب کو رہا کر دیا گیا۔

اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ جو نقصان پہنچانا تھا وہ پہنچ چکا تھا۔ بھٹو صاحب نے جنرل حبیب کی تمام فیکٹریاں سرکاری قبضے میں لے لیں۔ اگرچہ جنرل حبیب نے بھٹو صاحب کے ہاتھوں بہت نقصان اٹھایا اور تکلیفیں دیکھیں لیکن انہوں نے کبھی بھٹو صاحب کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

اپنی گرفتاری اور فیکٹریاں کھونے کے بعد جنرل حبیب وہاں سے لندن چلے گئے۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ انہی دنوں میں بھٹو صاحب کو جنرل حبیب کی ضرورت پڑ گئی۔ اصغر خان ان دنوں بھٹو پر بے حد اصل میں تنقید کر رہے تھے۔ بھٹو صاحب وہاں اپنے سیاسی مخالفین کو کوئی سبق سکھانا چاہتے تھے۔ اصغر خان نے بھٹو صاحب کی بات پوری کرنا ماننے سے انکار کر دیا کہ وہ اصغر خان کے ساتھ سودے بازی نہیں کرنا چاہتے تھے جب کہ

انہوں نے ان کے بھائی جنرل حبیب کو جیل میں ڈالا تھا۔

آخر مجبور ہو کر بھٹو صاحب نے لندن جنرل حبیب کو ایک پیغام بھیجا۔ بہت ساری کوششوں کے بعد بھٹو صاحب اور جنرل حبیب میں اختلافات ختم کرائے گئے۔

میں نے جنرل علی قلی سے پوچھا کہ جب ان کے والد جنرل حبیب کو بھٹو کی پھانسی کی خبر ملی تو ان کا اس پر کیا ردعمل تھا؟

جنرل علی نے کہا کہ اب تو اس بات پر سب لوگ متفق ہیں کہ بھٹو صاحب کو پھانسی دینے کا فیصلہ بہت غلط تھا۔ جنرل ضیاء کو انہیں پھانسی نہیں دینی چاہیے تھی۔ جنرل قلی کے خیال میں یہ بھی ایک تکلیف دہ حقیقت تھی کہ جنرل ضیاء اور بھٹو صاحب کے درمیان معاملات اتنی دور تک چلے گئے تھے جہاں ان میں سے صرف ایک ہی زندہ رہ سکتا تھا۔ تاہم، جنرل قلی کے خیال میں جنرل ضیاء نے بھٹو کو پھانسی دے کر بہت بڑی غلطی کی تھی۔

میں نے جنرل علی قلی کو اپنے باپ کے ساتھ جڑی ماضی کی یادوں سے نکالنے کی خاطر ٹاپک چینج کرتے ہوئے ان سے پوچھا کہ وہ پاکستان آرمی میں کیسے آئے تھے؟

جنرل علی قلی نے کہا کہ اس میں کوئی اتنی بڑی نئی بات نہیں تھی کیونکہ وہ ایک فوجی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور وہ شروع سے ہی فوج میں جانے کے خواہش مند تھے۔ انہوں نے 29 پی ایم اے میں کمیشن لیا اور اپنی اچھی پرفارمنس کی وجہ سے انہیں لندن کے Sand Hurst School بھیجا گیا۔ یہ معمولی بات نہیں تھی۔ وہاں بھی جنرل علی قلی نے انتہائی قابلیت کا مظاہرہ کیا اور انہیں بہترین غیر ملکی کیڈٹ کا ایوارڈ دیا گیا۔ بہت کم لوگوں کو پتہ ہوگا کہ جنرل مشرف اور علی قلی کورس میٹ تھے۔ علی قلی خان نے اپنے کورس میں ٹاپ کیا تھا جبکہ جنرل مشرف کی گیارہویں پوزیشن تھی۔ ان کے ایک اور کورس میٹ شبیر شریف تھے۔ وہ بھی ایک شاندار آرمی آفیسر تھے جو بعد میں جنگ میں شہید ہو گئے۔ تیسرے اہم کورس میٹ کرنل افضل تھے جو اس وقت (2003) پاکستان اسٹیل ملز کے چیئرمین تھے۔ لیفٹیننٹ جنرل خالد نواز، جنرل زیدی اور سابق ڈی جی آئی ایس آئی رانا نسیم بھی ان کے کورس میٹ تھے۔

یہی وجہ تھی کہ جب 1998ء میں ایک نئے آرمی چیف کی تقرری کا سوال اٹھا تو اس وقت کی بائی لسٹ پر وہ سرفہرست تھے۔ ان کے بعد جنرل خالد نواز، جنرل پرویز مشرف اور جنرل نسیم رانا

www.freepdfpost.blogspot.com

!!!allurdupdfnovels!!!!!!blogspot.com!!!

تھے۔ جنرل ضیاءالدین بٹ ان سے جونیئر تھے اور فہرست میں پانچویں نمبر پر تھے۔

جنرل قلی مجھے بتانے لگے کہ فوج میں میجر، کرنل، بریگیڈیئر اور میجر جنرل کی ترقی ایک سلیکشن پراسس کے ذریعے ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی جب جنرل جہانگیر کرامت نے جو اس وقت آرمی چیف تھے، چیف آف جنرل سٹاف کی تقرری کرنی تھی تو جنرل علی قلی کو یہ عہدہ دیا گیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت تک ان کے بیچ میٹ جنرل زیدی پہلے ہی ریٹائرڈ ہو چکے تھے۔ اب اس پوسٹ کے لیے مقابلہ جنرل علی قلی، جنرل خالد نواز اور جنرل پرویز مشرف کے درمیان تھا جو تینوں بیچ میٹ تھے۔ جنرل جہانگیر کرامت نے علی قلی کی پروفیشنل قابلیت اور اہلیت کو سامنے رکھتے ہوئے انہیں جنرل پرویز مشرف اور جنرل خالد نواز پر فوقیت دی۔ جنرل نسیم رانا کی ترقی ان سے کچھ دن بعد ہوئی تھی لہٰذا وہ اس دوڑ سے نکل چکے تھے۔ چند دنوں بعد اس وقت کے چیف آف جنرل سٹاف جنرل افتخار علی خان (چوہدری نثار علی خان کے بڑے بھائی) ریٹائرڈ ہونے والے تھے۔ جنرل قلی اس وقت راولپنڈی کے کور کمانڈر تھے۔ اپنی پروموشن پر جنرل جہانگیر کرامت کا شکریہ ادا کرنے وہ ان سے ملنے گئے تو جنرل کرامت نے انہیں کہا کہ انہیں چیف آف جنرل سٹاف بنا کر انہوں نے کوئی احسان نہیں کیا تھا۔ انہوں نے ایک حقدار کو صرف اس کا حق دیا تھا۔

جنرل جہانگیر کرامت سے ملنے کے بعد علی قلی خان اپنے قریبی دوست جنرل افتخار علی خان جن کی جگہ اب ان کی تعیناتی ہوئی تھی سے ملنے کے لیے گئے تاکہ وہ ان کا بھی شکریہ ادا کریں۔ وہ جنرل افتخار کا رویہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ جنرل قلی جنرل افتخار کو اپنا ذاتی دوست سمجھتے تھے۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کا دوست ان کی ترقی پر خوش نہیں ہوگا۔ جنرل افتخار کا یہ رویہ دیکھ کر جنرل علی قلی کو بڑا صدمہ ہوا۔ جنرل قلی کو اس وقت یہ احساس ہو گیا کہ کہیں نہ کہیں کچھ گڑبڑ ہے کیونکہ اگر جنرل افتخار جیسا پرانا دوست بھی ان کے ساتھ اچھے طریقے سے پیش نہیں آ رہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ معاملات درست نہیں ہیں۔ جنرل علی قلی اور جنرل افتخار کی دوستی دو نسلوں سے چلی آ رہی تھی کیونکہ ان دونوں کے والد انڈین آرمی کے دنوں سے ایک دوسرے کے دوست تھے۔

جب جنرل علی قلی جنرل افتخار کے دفتر میں داخل ہوئے تو جنرل افتخار نے کہا کہ ہاں مجھے تمہاری چیف آف جنرل سٹاف کے عہدے پر تعیناتی کی خبر پہلے ہی مل چکی ہے۔ جنرل افتخار نے انتہائی بے مروتی سے کہا کہ میں نے تین ہفتے بعد یہ کرسی چھوڑنی ہے۔ تم صرف اس وقت ہی آ کر میری اس کرسی پر بیٹھ سکتے ہو۔

جنرل علی قلی کو ایک شدید دھچکا لگا کیونکہ وہ تو اپنے اس دوست کے پاس Courtesy call کرنے گئے تھے۔ انہیں بھی پتہ تھا کہ انہوں نے چیف آف جنرل سٹاف کی کرسی پر تین ہفتے بعد بیٹھنا ہے۔

جنرل علی قلی خان کو جنرل افتخار علی خان کے اس سرد رویے کا معمہ فوراً سمجھ میں آ گیا جب انہوں نے جنرل افتخار کے دفتر کی کھڑکی سے باہر جنرل پرویز مشرف کو چلتے پھرتے دیکھا۔ جنرل علی قلی بڑے حیران ہوئے کہ جنرل مشرف جو اس وقت منگلا کے کور کمانڈر تھے وہ وہاں کیا کر رہے تھے؟

جنرل علی قلی نے اپنی حیرانی پر قابو پایا اور جنرل افتخار سے کہا کہ آپ جنرل پرویز مشرف کو اندر بلا لیں اور تینوں بیٹھ کر گپ شپ کریں۔

جب جنرل پرویز مشرف کمرے میں داخل ہوئے تو جنرل قلی بڑے گرم جوش انداز سے آگے بڑھ کر جنرل پرویز مشرف سے ملنے لگے تو انہوں نے محسوس کیا کہ جنرل مشرف کا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔ جنرل مشرف یہ توقع کر رہے تھے کہ انہیں چیف آف جنرل سٹاف بنایا جائے گا۔

جب جنرل جہانگیر کرامت کو غیر معمولی طور پر یہ پتہ چلا کہ جنرل پرویز مشرف چیف آف جنرل سٹاف جنرل افتخار کے پاس اس دن دفتر میں موجود تھے تو انہوں نے جنرل افتخار کو بلایا اور ان سے پوچھا کہ جنرل صاحب! مجھے یہ بتائیں کہ مشرف آپ کے دفتر میں کیا کر رہے تھے؟ آپ نے انہیں بلایا تھا یا پھر وہ چھٹی لے کر آپ سے ملنے آئے تھے۔ جہانگیر کرامت نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جنرل افتخار سے پوچھا کہ آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ نے کور کمانڈر منگلا جنرل مشرف کو اپنے دفتر میں کیوں بلایا تھا؟

جنرل افتخار نے جہانگیر کرامت کو بتایا کہ دراصل جنرل مشرف چیف آف جنرل سٹاف نہ بننے پر خاصے ڈسٹرب تھے۔

یہ بات اتنی آسان نہیں تھی جتنی جنرل قلی سمجھ رہے تھے۔

کھچڑی پکنا شروع ہو چکی تھی۔

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!!blogspot!!com!!

کچھ دنوں بعد جنرل جہانگیر کرامت کو پتہ چلا کہ جنرل محمود نے جنرل پرویز مشرف کے حوالے سے ایک ٹیلیفون کال کا ذکر کیا ہے۔ جنرل کرامت نے جنرل محمود کو بلایا اور ان کی سخت سرزنش کی کہ بھلا کیوں آپ نے قیادت کے بارے میں ایسے الفاظ کہے جن سے جنرل مشرف کو شہ ملی ہے۔ ایک جونیئر جنرل محمود کو جنرل جہانگیر کرامت نے دو ٹوک کہا کہ تمہارے لیے بہتر ہوگا کہ تم اپنے سینئر افسران کے معاملات میں مداخلت نہ کرو۔

جنرل جہانگیر کرامت کی ڈانٹ سن کر جنرل محمود خاصے نروس ہوئے اور رونے لگے کہ دراصل وہ اور جنرل مشرف ایک ہی رجمنٹ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان دنوں مشرف چیف آف جنرل سٹاف نہ بننے پر خاصے اپ سیٹ ہیں لہٰذا وہ محض ان کی دلجوئی کرنا چاہ رہے تھے۔

تاہم جہانگیر کرامت نے بڑے واضح لفظوں میں جنرل محمود کو بتایا کہ آج کے بعد تم اس طرح کے کسی کام میں ملوث نہیں ہو گے کیونکہ اس سے ملٹری کے کمانڈ سسٹم میں شدید مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔

اس واقعے کے ایک ہفتے بعد جنرل جہانگیر کرامت نے مین کور کا دورہ کرنا تھا جہاں انہیں ایک بریفنگ دی جانی تھی۔ جب جنرل جہانگیر کرامت آئے تو بریفنگ روم میں جانے کے بجائے انہوں نے جنرل قلی سے کہا کہ وہ انہیں اپنے دفتر لے کر چلیں۔ وہ ابھی دفتر میں بیٹھے ہی تھے کہ اس وقت کے جنرل رانا نسیم جو ڈی جی آئی ایس آئی تھے، وہ اپنی بغل میں ایک فائل لیے آئے اور جنرل جہانگیر کرامت سے کہا کہ سر فائل کلیئر ہو گئی ہے۔

علی قلی کو کچھ خبر نہیں تھی کہ کیا ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد انہیں پتہ چلا کہ دراصل اس وقت کے وزیراعظم نواز شریف نے جنرل علی قلی کے چیف آف جنرل سٹاف کی تقرری کے احکامات روک لیے تھے۔ جب جنرل جہانگیر کرامت کو اس بات کا پتہ چلا کہ ان کے احکامات پر عمل نہیں ہو رہا ہے تو انہوں نے ڈی جی آئی ایس آئی رانا نسیم کو نواز شریف کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا تھا کہ وہ فوری طور پر اس فائل کو کلیئر کریں۔ ان دنوں نواز شریف کے پاس وزارت دفاع کا عہدہ بھی تھا۔

بعد میں بات کچھ یوں کھلی کہ جنرل افتخار چیف آف جنرل سٹاف کے طور پر اپنی مدت ملازمت میں توسیع چاہتے تھے۔ ان کی مدت ملازمت میں توسیع کرنے کا کیس جنرل جہانگیر کرامت کو بھی بھیجا گیا تھا۔ ایک عام فوجی کے برعکس جہانگیر کرامت ایک سافٹ مین تھے۔ جنرل کرامت نے نواز شریف

کو بتایا کہ اگر انہوں نے جنرل افتخار کو ان کی ملازمت میں توسیع دی تو یہ ان کے جونیئرز کے ساتھ زیادتی ہو گی جو ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی پروموشن کا انتظار کر رہے تھے۔ نواز شریف کو بتایا گیا کہ اگر جنرل افتخار کی خواہش کا احترام کیا گیا تو کم از کم پاکستانی فوج کے دس سے بارہ سینئر آرمی جرنیلوں بشمول جنرل قلی اور جنرل پرویز مشرف کو بغیر پروموشن لیے گھر جانا پڑے گا۔ یوں جنرل جہانگیر کرامت نے جنرل افتخار کو ملازمت میں توسیع دینے سے انکار کر دیا۔ جب چوہدری نثار علی خان اور جنرل افتخار علی خان کو اس بات کا علم ہوا تو ان دونوں نے اپنے دل میں یہ بات بٹھا لی کہ دراصل یہ جنرل قلی ہی تھے جنہوں نے جہانگیر کرامت پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے انہیں مدت ملازمت میں توسیع نہیں لینے دی۔

جنرل قلی مجھے بتانے لگے کہ اگرچہ ان کی پروموشن سے جنرل افتخار، چوہدری نثار اور جنرل مشرف کو تکلیف ہوئی تھی لیکن انہیں میرٹ کی بنیاد پر یہ ترقی دی گئی تھی کیونکہ وہ سینیارٹی لسٹ پر نمبر ون تھے۔

میں نے جنرل قلی سے پوچھا کہ آخر نواز شریف اور جہانگیر کرامت کے درمیان وہ کون سے اختلافات تھے جن کی وجہ سے آخر چیف آف آرمی سٹاف کو استعفیٰ دے کر گھر جانا پڑا تھا۔

جنرل قلی نے آخر اس راز سے پردہ اٹھانا شروع کیا۔

نواز شریف اور جنرل جہانگیر کرامت کے درمیان معاملات اس وقت بگڑ گئے جب چیف آف آرمی سٹاف نے نیول ڈیفنس کالج لاہور میں اپنے خطاب میں نیشنل سیکورٹی کونسل بنانے کی تجویز پیش کی۔ جنرل قلی اس وقت چیف آف جنرل سٹاف تھے۔ آئی ایس پی آر براہ راست ان کے ماتحت تھا۔ ڈائریکٹر جنرل آئی ایس پی آر سلیم اللہ نے جنرل قلی کو چیف کی تقریر کے متن کے بارے میں بتایا۔ تاہم علی قلی اس وقت اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ وہ اس متنازعہ تقریر پر کوئی بات کرتے کیونکہ اس وقت وہ وہاں موقع پر موجود نہیں تھے۔

اگلے دن جنرل جہانگیر کرامت علی قلی کو اعتماد میں لیے بغیر نواز شریف سے ملنے چلے گئے۔ اخبارات میں پہلے ہی وزیراعظم اور چیف آف آرمی سٹاف کے درمیان اس تقریر کے بعد بڑھتے ہوئے اختلافات کی خبریں چھپ چکی تھیں۔ نواز شریف سے ملنے کے بعد جب جنرل جہانگیر کرامت جی ایچ کیو واپس آئے تو جنرل علی قلی چیف آف جنرل سٹاف کی حیثیت سے ان سے ملنے کے لیے آرمی

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

بتا رہے تھے۔ جب جنرل علی قلی نے نواز شریف سے ہونے والی اس میٹنگ کے بارے میں پوچھا تو
جہانگیر کرامت نے انہیں بتایا کہ یہ ملاقات خوشگوار ماحول میں نہیں ہوئی تھی۔ علی قلی نے جب اپنے چیف
کو کافی مضطرب دیکھا تو انہوں نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔

جنرل کرامت نے نواز شریف کے ساتھ ہونے والی اس اہم ملاقات کی تفصیلات جنرل قلی کو نہیں بتائیں۔ جہانگیر کرامت نے صرف اتنا انکشاف کیا کہ نواز شریف ان سے یہ تقریر کرنے پر شدید ناراض تھے۔ جنرل قلی نے واضح طور پر محسوس کیا کہ جہانگیر کرامت کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ وہ نواز شریف سے ملنے کے بعد خاصے اپ سیٹ تھے۔ قلی نے کہا کہ انہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ دو تین دن میں حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔

جنرل جہانگیر کرامت نے کسی بھی مرحلے پر جنرل قلی کو نہیں بتایا کہ وہ دباؤ میں آ کر پہلے ہی آرمی چیف کے عہدے سے استعفیٰ دے چکے ہیں۔

جنرل قلی سے ملنے کے بعد جہانگیر کرامت اس دن اپنے دفتر سے جلدی نکلے اور گھر چلے گئے۔

اسی دن تین چار بجے کے قریب جنرل قلی کو جنرل جہانگیر کرامت کے گھر سے فون کال آئی۔

انہیں بتایا گیا کہ چیف آف آرمی سٹاف ان سے فوراً ملنا چاہتے ہیں۔ جب وہ وہاں پہنچے تو ڈی جی آئی ایس آئی نسیم رانا پہلے سے ہی جنرل جہانگیر کرامت کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ جونہی گفتگو شروع ہوئی جنرل جہانگیر کرامت نے علی قلی کو مخاطب کر کے کہا۔

"Ali it was never like that as I told you earlier."

ایک دفعہ پھر جہانگیر کرامت نے ہچکچاتے ہوئے یہ انکشاف کیا کہ نواز شریف اور ان کے ساتھیوں نے اس ملاقات میں ان سے استعفیٰ کی بات کی ہوئی تھی۔

جنرل قلی نے بے ساختہ [illegible] جنرل جہانگیر کرامت صاحب آپ [illegible] آپ نے استعفیٰ دیا تو [illegible]

"General JK. Do not even think of it. If you did resign, verdict of people will be that you will never live it down."

جنرل قلی کا خیال تھا کہ [illegible] جہانگیر کرامت نے [illegible] علی قلی کی بھی [illegible]

کر دیے ہیں کہ وہ استعفیٰ دے چکے ہیں اور ڈی جی آئی ایس آئی رانا نسیم اس وقت ان سے وہ استعفیٰ لے کر نواز شریف کو پہنچانے کے لیے وہاں موجود ہیں کیونکہ وزیراعظم صاحب بڑی بے تابی سے اس تازہ ترین استعفیٰ کا انتظار کر رہے ہیں۔

جنرل قلی اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے رات کو پی ٹی وی پر نو بجے کا خبرنامہ سن رہے تھے جب یہ اعلان ہوا کہ جنرل جہانگیر کرامت نے استعفیٰ دے دیا ہے۔

اس واقعہ کے پانچ سال گزرنے کے بعد بھی جنرل علی قلی کو اس بات کا دکھ تھا کہ جنرل جہانگیر کرامت نے اتنے اہم ایشو پر انہیں اعتماد میں نہیں لیا تھا۔ ان کا استعفیٰ دینا صرف ان کا ذاتی فعل نہیں تھا کیونکہ اس کے ساتھ جنرل قلی کا اپنا مستقبل بھی داؤ پر لگا ہوا تھا۔ خبروں میں یہ بھی بتایا گیا کہ جنرل علی قلی کو نظر انداز کر کے جنرل پرویز مشرف کو چیف آف آرمی سٹاف لگایا گیا ہے۔

آج کا دن اور آج کی رات جنرل علی قلی کی زندگی کی سب سے زیادہ مایوس کن اور طویل رات تھی۔ ان کے ساتھ بھی وہی کچھ ہوا تھا جو ٹھیک 39 سال قبل ان کے والد جنرل حبیب کے ساتھ جنرل ایوب نے کیا تھا۔ تاریخ نے ایک بار پھر اپنے آپ کو دہرایا تھا۔ ٹھیک 39 سال بعد بیٹے کے ساتھ بھی وہی کچھ ہوا تھا جو باپ کے ساتھ ہوا تھا۔

اس کے بعد جنرل جہانگیر کرامت جنرل قلی اور جنرل خالد نواز سے ملے۔ وہ دونوں جنرل مشرف سے سینئر تھے۔ جنرل جہانگیر کرامت کے منہ سے صرف اتنا نکل سکا۔

"Gentlemen, I am sorry."

جنرل قلی اور خالد نواز خاموش رہے کیونکہ ان دونوں کو پتہ تھا کہ اب ان کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا ہے اب محض چند الفاظ کہہ دینے سے ان کی زندگیوں میں کوئی فرق نہیں پڑنے والا ہے۔

اپنے ساتھ ہونے والی اس زیادتی اور ناانصافی کا ذکر کرتے ہوئے علی قلی کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ نواز شریف نے انہیں اس لیے آرمی چیف نہیں بنایا تھا کہ جنرل جہانگیر کرامت کے جب جہانگیر کرامت وزیراعظم سے مل کر واپس آئے تھے انہوں نے قلی کو اپنے استعفیٰ کے بارے میں بتایا تو انہوں نے نواز شریف کے بارے میں کچھ سخت گفتگو کی تھی۔

قلی نے اس بات کو بڑی سختی سے جھٹلایا اور بولے ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

[illegible]

جنرل قلی نے کہا کہ [illegible]

[illegible] تھے۔ قلی کا خیال تھا کہ [illegible] صورت میں [illegible] دیا جاتا ہے۔

چوہدری نثار کی اس بات کا جواب دیتے ہوئے کہ جنرل مشرف کو ہر حال میں آرمی چیف بننا تھا، جنرل قلی نے کہا کہ ہمارا یہ ایمان ہے کہ خدا کی مرضی کے بغیر اس دنیا میں کچھ نہیں ہوتا۔ تاہم ان کے خیال میں چوہدری نثار نے یہ سچ نہیں بولا تھا کیونکہ وہ دراصل اپنے بھائی جنرل افتخار کو بچانے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ اصل کہانی یہ ہے کہ جنرل افتخار آرمی سے ریٹائر نہیں ہونا چاہتے تھے۔ ان کے دل میں ایک بڑی شدید خواہش پیدا ہو گئی تھی کہ وہ اپنی مدت ملازمت میں توسیع کرا لیں۔ انہوں نے ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں سوچا کہ ان کے اس فیصلے سے آٹھ سے دس سینئر آرمی جنرل متاثر ہوں گے۔ قلی کا خیال تھا کہ آج تک جنرل افتخار اپنی مدت ملازمت میں توسیع نہ ملنے کا ذمہ دار انہیں ٹھہراتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ ان دونوں بھائیوں کے سارے غصے کا رخ ان کی طرف تھا۔ جنرل قلی نے کہا کہ باقی باتیں چھوڑیں، آپ کو میں حیرت کی یہ بات بتاؤں کہ جب جی ایچ کیو سے جنرل افتخار کی ریٹائرمنٹ کے آخری آرڈرز جاری کیے گئے تھے تو وزارت دفاع نے اپنے تئیں پورا کام کوششیں کی تھیں کہ ان آرڈرز پر عمل نہ ہو یا کم از کم عملدرآمد میں تاخیر کی جائے۔

جنرل قلی کے خیال میں یہ وہ باتیں تھیں جن کی وجہ سے انہیں یقین ہے کہ نواز شریف کے

[illegible]

جنرل قلی نے کہا کہ [illegible]

[illegible] لسٹ میں تیسرے نمبر پر تھے انہیں چیف آف آرمی سٹاف بنا دیا گیا۔ [illegible] ترقی دی جاتی ہے اور ایک مستحق فوجی کو اس کے حق سے محروم کیا جاتا ہے تو پھر ان اداروں میں سیاست آجاتی ہے۔

میں نے کہا کہ مجھے پتا نہیں کہ آرمی جنرل چیف آف آرمی سٹاف بننے کے لیے کیوں لابنگ کرتے ہیں تو جنرل قلی بولے کہ کسی نے بھی آرمی چیف بننے کے لیے اس طرح کی لابنگ نہیں کی۔ تمام لوگ فوج کے ادارے کی بہتری اور ترقی چاہتے ہیں۔ علی قلی نے اس بات کا اعتراف کیا کہ جنرل وحید کاکڑ سینیارٹی میں پہلے نمبر پر تھے۔ جب ان کے پانچ سینئر جرنیلوں کو نظر انداز کر کے انہیں آرمی چیف لگایا گیا۔ لیکن آج تک کسی نے بھی اس بات پر اعتراض نہیں کیا کہ ایک غلط جنرل کو آرمی چیف لگایا گیا کیونکہ جنرل کاکڑ ایک شاندار افسر تھے اور ان میں کوئی سیاسی خواہشات نہیں تھیں۔ اسی طرح جنرل فرخ جنرل کاکڑ سے سینئر تھے لیکن جنرل کاکڑ کی نامزدگی پر سوالات نہیں اٹھائے گئے۔ جنرل کاکڑ نے ایک پروفیشنل سپاہی کی طرح اپنے عہدے کے ساتھ انصاف کیا اور بے پناہ عزت حاصل کی۔ لیکن جب سیاستدان جنہوں نے فیصلے کرنے ہوتے ہیں وہ ذاتی پسند ناپسند کا شکار ہو کر آرمی چیف لگاتے ہیں تو پھر مسائل شروع ہوتے ہیں۔ اصل مسئلہ اس وقت کھڑا ہوتا ہے جب سیاسی لیڈر ہر بڑے عہدے پر اپنا وفادار دیکھنا چاہتے ہیں۔

میں نے جنرل علی قلی سے پوچھا کہ آخر نواز شریف نے جنرل پرویز مشرف کو آرمی چیف کیوں

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

بتایا تھا۔

جنرل قلی نے ایک اور نئی کہانی سنائی۔

جنرل جہانگیر کرامت کے استعفیٰ دینے سے کچھ عرصہ پہلے ہی یہ باتیں شروع ہو گئی تھیں کہ ان کے بعد نیا آرمی چیف کون ہوگا۔ ایک دن جنرل علی قلی کی حیرانی کی حد نہ رہی جب نواز شریف کے ایک بڑے قریبی معتمد خاص نے ان سے رابطہ کیا اور یہ پیغام دیا کہ وہ ان کی نواز شریف سے ایک خفیہ ملاقات کرانا چاہتے ہیں تاکہ کل کو وہ آرمی چیف کی تقرری کے وقت زیر غور لائے جا سکیں۔ علی قلی کو یہ بتایا گیا کہ اگر وہ نواز شریف سے خفیہ ملاقات کے لیے راضی ہو جائیں تو پھر انہیں ایک عام سی کار میں بٹھا کر سادہ کپڑوں میں پرائم منسٹر ہاؤس لے جایا جائے گا۔ علی قلی کو تسلی دینے کے لیے یہ بھی بتایا گیا کہ ان سے پہلے جنرل آصف نواز کی بھی اسی طرح خفیہ ملاقات کرائی گئی تھی اور انہیں بھی سادہ کپڑے پہنا کر ایک عام سی گاڑی میں وہاں لے جایا گیا تھا۔ نواز شریف کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے بعد جنرل آصف نواز کو آرمی چیف بنانے کی کلیئرنس دے دی گئی تھی۔ جنرل علی قلی کو بتایا گیا کہ یہ بات ان کے اپنے فائدے میں ہے اور انہیں جہانگیر کرامت کے بعد آرمی چیف بنایا جا سکتا ہے۔

اس پیغام کے کچھ دن بعد ایک اور بڑے سرکاری افسر جو نواز شریف کے قریب تھے، نے ایک دفعہ پھر علی قلی سے رابطہ کیا اور نواز شریف سے ملانے کی پیشکش کی۔ اس بڑے سرکاری افسر نے جنرل علی قلی کو بتایا کہ وہ ذاتی طور پر انہیں چیف آف آرمی سٹاف بنوانے میں ان کی مدد کریں گے۔ وہ پہلے ان کی نواز شریف سے خفیہ ملاقات کرائیں گے اور پھر انہیں آرمی چیف بنانے کا کیس تیار کر کے پیش کریں گے۔

لیکن نواز شریف کیمپ کی توقعات کے برعکس جنرل قلی نے سادہ کپڑے پہن کر نواز شریف سے خفیہ ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔ جنرل قلی نے انہیں بتایا کہ وہ آرمی چیف بننے کے لیے اس طرح کی کوئی حرکت نہیں کریں گے۔ انہوں نے پیغام رساں کو کہا کہ خدا نے انہیں بہت عزت دی ہے اور اگر ان کی قسمت میں آرمی چیف بننا ہوا تو انہیں کوئی نہیں روک سکتا۔ اگر خدا انہیں آرمی چیف نہیں بنانا چاہتا تو پھر نواز شریف سے خفیہ ملاقاتیں کر کے بھی وہ آرمی چیف نہیں بنائے جا سکتے۔

میں نے جنرل قلی سے کہا کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ نواز شریف نے جنرل مشرف کو آرمی

چیف بنانے سے پہلے ان سے بھی خفیہ ملاقاتیں کی ہوں گی۔ جنرل قلی نے میرے اس سوال کا یہ کہہ کر جواب دیا کہ وہ اس طرح کی خفیہ ملاقاتوں پر کوئی تبصرہ نہیں کریں گے۔

میں نے کہا! لیکن جنرل صاحب! شیخ رشید نے تو اپنے انٹرویو میں مجھے بتایا تھا کہ جنرل قلی کو آرمی چیف نہ بنانے کی وجہ ان کے برادر ان لا گوہر ایوب تھے جو اس وقت نواز شریف کی حکومت میں وزیر خارجہ تھے۔ جنرل قلی نے اس بات سے اتفاق کیا۔ قلی نے مجھے کہا کہ وہ یہ بات ماننے کو تیار نہیں کہ گوہر ایوب خان انہیں آرمی چیف بنانے کے لیے کوششیں کر رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ گوہر ایوب خان نے کبھی بھی انہیں آرمی چیف بنانے کے لیے نہ تو لابی کی تھی اور نہ ہی انہوں نے کسی سے اس پر بات چیت کی تھی۔ قلی کے بقول نواز شریف گوہر ایوب خان پر بھروسہ نہیں کرتے تھے۔ جنرل قلی نے بھی گوہر ایوب خان سے یہ بات نہیں کی تھی کہ وہ انہیں آرمی چیف بنوائیں۔ قلی کے بقول اگرچہ وہ اپنی پوزیشن کلیئر کرنے کے لیے ساری باتیں کہہ سکتے ہیں لیکن وہ خاموش رہیں گے کیونکہ ان کی بہن گوہر ایوب کی بیوی ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ ان کے لیے کوئی مسئلہ کھڑا ہو۔

قلی نے کہا کہ مجھے حیرانی ہوتی ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ گوہر ایوب خان شاید میرے لیے لابنگ کر رہے تھے۔ وہ یہ بات کیوں بھول جاتے ہیں کہ ان کے والد جنرل حبیب خان کو آرمی چیف نہ بنانے والے جنرل ایوب خان ہی گوہر ایوب کے ہی والد تھے۔ قلی نے کہا میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گا۔

جنرل قلی نے اس بات کو دہرایا کہ دراصل نواز شریف کو آرمی ہاؤس میں ان کی جہانگیر کرامت کے ساتھ ہونے والی میٹنگ کے بارے میں جان بوجھ کر غلط خبریں دی گئی تھیں۔ علی قلی نے اس بات کو مسترد کیا کہ جب جنرل وحید کاکڑ نے نواز شریف اور غلام اسحاق خان سے ملاقات کی تھی جس کے بعد انہوں نے استعفے دے دیے تھے تو شاید وہ اس میٹنگ میں موجود تھے۔ قلی نے کہا کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس وقت وہ ڈی جی ایم آئی تھے اور انہوں نے نواز شریف کو دھمکی دے کر استعفیٰ دینے پر مجبور کیا تھا۔ جنرل قلی کے بقول یہ بات غلط تھی۔ وہ نہ تو اس میٹنگ میں شریک ہوئے تھے اور نہ ہی انہوں نے نواز شریف کو کوئی دھمکی دی تھی۔ جنرل کاکڑ کے ساتھ اس وقت جنرل جاوید اشرف گئے تھے۔ جنرل قلی نے کہا کہ نواز شریف کو ہر وقت ان کے قریبی لوگ پٹھانوں سے ڈراتے بھی رہتے تھے اور ایک پروپیگنڈہ جاری رہتا کہ پٹھان اچھے لوگ نہیں ہیں اور ان سے ڈیل کرنا بہت مشکل کام ہے۔ پھر سب سے بڑھ کر

www.freepdfpost.blogspot.com

allurdupdfnovels.blogspot.com

[illegible]

کورکمانڈر طارق پرویز کو جنرل پرویز مشرف نے ہٹایا تو کیسے آرمی کو لایا اور سیاسی حکومت کے درمیان اختلافات نواز شریف حکومت کی برطرفی تک جا پہنچے۔

قلی نے مجھے بتایا کہ اصل مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کسی بھی ایکشن کے پیچھے کوئی خاص مقصد چھپا ہوا ہو جیسا کہ ہم نے لیفٹیننٹ جنرل طارق پرویز کے کیس میں دیکھا۔ ورنہ جب جنرل کاکڑ پہلے آرمی چیف جنرل اسد درانی اور جاوید ناصر کے خلاف ایکشن لیتے ہیں تو کسی سے کوئی ایک انگلی بھی نہیں اٹھتی۔ جنرل کاکڑ سویلین معاملات میں آرمی کے استعمال کے شدید خلاف تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے 1994ء میں آرمی کو کراچی سے واپس بلا لیا تھا۔ بینظیر بھٹو کاکڑ کے اس فیصلے سے خوش نہیں تھیں۔ انہوں نے کاکڑ کے اس فیصلے کی شدید مخالفت کی لیکن کاکڑ کا یہ خیال تھا کہ آرمی کو اس وقت ان معاملات میں لایا جائے جب اور کوئی صورت نہ بچے۔ جنرل کاکڑ نے بینظیر بھٹو کو بتایا تھا کہ آرمی کو کراچی میں بلا کر صورتحال بہتر نہیں ہوگی لہٰذا بہتر ہوگا کہ فوج کو ان معاملات سے دور رکھا جائے۔ ان دنوں جنرل قلی ڈی جی ایم آئی تھے۔ حکومت کے کچھ عہدیداران سے ملنے کے لیے آئے اور انہوں نے جنرل کاکڑ کی کراچی سے فوج واپس بلانے کی مخالفت کی۔ جنرل کاکڑ نے پھر بھی اس بات پر اصرار کیا کہ فوج کو اس طرح کے معاملات میں ڈالنے سے اس کا پروفیشنلزم تباہ ہو جائے گا۔

میں نے علی قلی سے پھر پوچھا کہ جب انہوں نے جنرل جہانگیر کرامت کے استعفیٰ اور جنرل مشرف کے آرمی چیف بننے کی خبر سنی تھی تو ان کا پہلا ردعمل کیا تھا۔

جنرل قلی نے اس بات کا اعتراف کیا کہ یہ ان کی زندگی کی سب سے بڑی شاک نیوز تھی۔ تاہم جنرل جہانگیر کرامت ان سے اور خاندان سے ملے تو جنرل جہانگیر کرامت نے انہیں اعتماد میں

[illegible]

[illegible] جنرل علی قلی نے بتایا کہ صدر فاروق لغاری اور بینظیر بھٹو دونوں نے جنرل کاکڑ سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ آرمی چیف کے عہدے میں توسیع قبول کر لیں۔ بینظیر بھٹو اور لغاری نے جنرل کاکڑ کو بتایا تھا کہ ان کے بغیر ان کے لیے پاکستانی آرمی کو چلانا بہت مشکل ہوگا۔

میرا خیال ہے کہ بینظیر بھٹو اور لغاری کی بات اس دن سچ ثابت ہوئی جب 5 نومبر 1996ء کو جنرل جہانگیر کرامت کی مدد سے ہی بینظیر حکومت کو ڈس مس کر دیا گیا۔

جنرل علی قلی نے کہا کہ صرف وزیراعظم اور صدر جنرل کاکڑ کو مدت ملازمت میں توسیع دینا چاہتے تھے بلکہ اس وقت کے امریکن سفیر بھی اس حق میں تھے کہ وحید کاکڑ ریٹائرڈ نہ ہوں۔ یو ایس سنٹرل کمانڈ کے چیف بھی خصوصی طور پر پاکستان آئے تھے اور جنرل کاکڑ سے یہ کہا تھا کہ وہ اپنی مدت ملازمت میں توسیع قبول کر لیں۔ بہت سارے مغربی ملکوں کے سفارتکار بھی جنرل کاکڑ کو یہی بات کہہ رہے تھے کہ وہ ریٹائرڈ نہ ہوں کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس اہم مرحلے پر پاکستان کو ان کی ضرورت تھی۔

جنرل کاکڑ نے سب کو ایک ہی جواب دیا کہ انہیں پاکستان آرمی میں ان سے بھی بہتر پروفیشنل مل جائے گا لہٰذا وہ اس بات پر پریشان نہ ہوں کہ ان کے بعد آرمی چیف کون بنے گا۔

جنرل قلی کے بقول انہیں جنرل کاکڑ جیسے آرمی آفیسروں کی ضرورت تھی۔ یہ کاکڑ ہی تھے جنہوں نے 1993ء میں سیاسی بحران کو توڑنے کے لیے نواز شریف اور اسحاق خان کے درمیان ایک درمیانی راستہ نکالا تھا۔ اسی طرح جنرل کاکڑ نے لیفٹیننٹ جنرل جاوید ناصر کو ڈس مس کرنے میں ایک منٹ کی بھی دیر نہیں کی تھی جب انہیں یہ پتہ چلا تھا کہ وہ نواز شریف کے لیے کام کر رہے تھے اور ان کے لیے

www.freepdfpost.blogspot.com

allurdupdfnovels.blogspot.com

سیٹھی پہلے سے حفاظت کی۔

جنرل علی قلی نے ٹی وی پر خبر سننے کے بعد جنرل پرویز مشرف کو فون کر کے مبارک باد دی۔ جنرل علی قلی نے آگے بتایا کہ جی ایچ کیو جانا ہی نہیں انہوں نے جنرل مشرف کو بتایا کہ شاید وہ کبھی وہاں نہ آ سکیں کیونکہ انہوں نے اپنے دوست یوسف اللہ خان کے بیٹے اور بیٹی کی شادی میں شرکت کرنی تھی۔ اس شادی میں بہت سارے لوگ شریک تھے اور صبح کے اخبارات میں جنرل مشرف کے آرمی چیف بننے کی خبر شائع ہو چکی تھی۔ سب لوگ جنرل قلی سے ایک ہی بات پوچھ رہے تھے کہ اب ان کا ری ایکشن کیا ہوگا۔ جنرل قلی نے سب کو ایک ہی جواب دیا تھا کہ ان کا اس پر کوئی ردعمل نہیں ہے اور نہ ہوگا۔ وہ راولپنڈی واپس جا کر اپنا چارج سنبھال دیں گے۔ جنرل قلی نے اسی رات اپنا استعفیٰ ٹائپ کیا اور وہ اس وقت کے وائس چیف آف آرمی سٹاف جنرل یوسف کو بھیج دیا جو جی ایچ کیو میں ملٹری سیکرٹری تھے۔

اس دن کے بعد جنرل قلی کبھی جی ایچ کیو نہیں گئے۔

کیا جنرل مشرف نے آرمی چیف بننے کے بعد ان سے کبھی رابطہ کیا؟

”نہیں“ علی قلی نے ایک مختصر سا جواب دیا۔

تاہم، کچھ مشترکہ دوستوں کے فنکشن میں آتے جاتے ایک دوسرے سے اتنا پوچھ لیتے ہیں:

"Hello PM, how are you?" یا پھر پرویز مشرف ان سے پوچھ لیتے ہیں:

"Hello Ali, how are you doing?"

اس سے زیادہ ہم دونوں نے کبھی ایک دوسرے سے بات نہیں کی۔

تاہم، جس رات جنرل پرویز مشرف کو آرمی چیف بنانے کا اعلان کیا گیا جنرل افتخار نے ان کے گھر ٹیلی فون کیا اور بولے

"Ali, do not do any thing (resign) now. I am trying something for you."

جنرل افتخار انہیں دراصل چیئرمین جوائنٹ آف سٹاف بنوانا چاہتے تھے۔

قلی نے مجھے بتایا کہ انہوں نے جنرل افتخار سے کہا:

"Leave it General. If the man (Nawaz Sharif) could not see me as Army Chief then how could he see me as Chairman Joint chiefs of Staff committee."

تھوڑی دیر بعد جنرل افتخار نے علی قلی کو دوبارہ فون کیا اور کہا کہ تمہارا اندازہ درست تھا نواز شریف انہیں یہ عہدہ بھی دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔

یوں جنرل علی قلی کا 32 سالہ پروفیشنل فوجی کیریئر اس رات اپنے اختتام کو پہنچا۔

علی قلی نے مجھے نواز شریف کے کسی دوست کا لکھا ہوا ایک مضمون دکھایا جس میں انہوں نے پہلے تسلیم کیا تھا کہ انہوں نے جنرل قلی کو آرمی چیف نہ بنا کر غلطی کی تھی۔ نواز شریف کے الفاظ میں انہیں سب سے بہتر آرمی جنرل (جنرل علی قلی) کو آرمی چیف بنانا چاہیے تھا نہ کہ کسی ایسے جنرل (جنرل مشرف) کو جو سنیارٹی لسٹ میں تیسرے نمبر پر تھے۔

قلی نے کہا کہ دراصل چوہدری نثار علی خان اور جنرل افتخار علی خان نے نواز شریف کو انہیں آرمی چیف نہیں بنانے دیا تھا۔

جنرل قلی چوہدری نثار اور افتخار سے خاصے نالاں تھے۔ قلی نے بتایا کہ وہ ان دونوں بھائیوں سے اس طرح کے سلوک کی توقع نہیں رکھتے تھے کیونکہ ان دونوں کے خاندانی تعلقات دو نسلوں سے چلے آ رہے تھے۔ ان سے پہلے ان دونوں کے والد انڈین آرمی کے دنوں سے ایک دوسرے کے دوست تھے۔

میں نے جنرل قلی سے کہا کہ یہ بڑی حیرانی کی بات ہے کہ آپ نے ریٹائرمنٹ کے بعد کوئی طاقتور سویلین عہدہ نہیں لیا جیسے آجکل دیکھنے میں آتا ہے کہ ہر دوسرا فوجی یہی کچھ کرتا ہے۔ قلی نے کہا کہ انہوں نے اس طرح کے عہدوں کے لیے کبھی بھیک نہیں مانگی۔ دوسرے، کراچی میں ان کا اپنا بزنس تھا جس کی دیکھ بھال انہوں نے کرنی تھی۔

میں نے علی قلی سے پوچھا کہ ان کے خیال میں جنرل مشرف اور نواز شریف کے درمیان کونسی ایسی بات ہوئی تھی جس سے ان میں ٹکراؤ ہوا تھا۔ قلی نے بتایا کہ دراصل کارگل آپریشن کے بعد معاملات سویلین اور فوجی قیادت کے ہاتھوں سے نکل گئے تھے۔ پوری دنیا کو وزیر اعظم اور آرمی چیف کے درمیان انتہائی خوفناک اختلافات کا پتہ چل گیا تھا۔ پھر قلی نے کہا کیونکہ وہ اس وقت فوج میں نہیں تھے لہٰذا وہ بہت ساری باتوں پر تبصرہ نہیں کر سکتے۔

قلی نے ایک بات ضرور کہی کہ جس طریقے سے جنرل مشرف کو برطرف کیا گیا تھا وہ صحیح طریقہ نہیں تھا۔ سیاسی قیادت سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ جب آرمی چیف ملک سے باہر ہو تو اس وقت اسے

www.freepdfpost.blogspot.com

!!!allurdupdfnovels!!!blogspot!!!com!!!

برطرف کیا جائے۔

قلی نے اس بات کا بھی انکشاف کیا کہ ان کے پاس اس طرح کی رپورٹس بھی تھیں کہ جب جنرل مشرف آرمی چیف بنے اور انہوں نے مختلف کور کے دورے کیے تو بہت سارے فوجی افسران نے انہیں یہ کہا تھا کہ وہ نواز شریف کو اپنے ساتھ وہ سب کچھ کرنے کی اجازت نہ دیں جو انہوں نے جنرل جہانگیر کرامت کے ساتھ کیا تھا۔ یہی وجہ تھی جب 12 اکتوبر کو جنرل مشرف کو ڈس مس کیا گیا تو ان کے ذہن میں اپنے ان فوجی افسروں کا یہ مطالبہ ضرور ہوگا۔

میں نے جنرل قلی سے پوچھا کہ آخر فوج سیاست میں کیوں مداخلت کرتی آئی تھی تو وہ بولے کہ ان کی اپنی ذاتی رائے یہ ہے کہ فوج کو سیاست میں نہیں پڑنا چاہیے چاہے اس کے پیچھے کتنی بڑی وجہ ہی کیوں نہ ہو۔ تاہم قلی نے کہا کہ جب بھی فوج نے کسی بھی سویلین حکومت کو گرایا تو اس وقت کی سیاسی لیڈرشپ نے باقاعدہ طور پر انہیں اس کے جواز پیش کیے۔ جو مسائل سیاسی انداز میں حل ہو سکتے تھے وہ سیاسی لوگ فوجی لیڈروں کے سامنے لے کر آتے تھے اور یہ بہت غلط اپروچ تھی۔ جنرل قلی کا خیال تھا کہ سیاستدان اپنے مقاصد کے لیے فوج کو استعمال کرتے تھے جس سے فوجیوں کو بھی یہ بہانہ ملتا تھا کہ وہ سیاسی معاملات میں دخل اندازی کریں۔ قلی نے انکشاف کیا کہ جب وہ ڈی جی ایم آئی تھے تو بہت سارے سیاستدان ان سے ملنے جی ایچ کیو آتے اور وہ چاہتے تھے کہ فوج اس وقت کی حکومت کو گرانے میں رول ادا کرے۔ تاہم قلی کے بقول سویلین حکومتوں کو گرانے کے لیے یہ وجوہات مناسب نہیں تھیں۔ قلی کا خیال تھا کہ اگر فوجی قیادت کے پاس کسی سیاسی حکومت کو ہٹانے کی کتنی ہی ضروری وجوہات کیوں نہ ہوں پھر بھی فوری طور پر ملک میں نئے الیکشن کرا کے اقتدار منتخب نمائندوں کے حوالے کر دینا چاہیے کیونکہ ملک پر حکمرانی کرنا فوج کا کام نہیں ہے۔ جنرل وحید نے بالکل یہی کام 1993ء میں کیا تھا جب انہوں نے نئے انتخابات کرا کے اقتدار منتخب نمائندوں کے حوالے کر دیا۔ یوں ملک میں جمہوریت چلتی رہی۔ قلی نے کہا کہ پاکستان میں فوجی مداخلتوں سے نہیں بلکہ جمہوریت کے مسلسل چلتے رہنے سے ہی جمہوریت آئے گی۔ جمہوریت ایک مکمل نظام ہے اور اسے چلتے رہنا چاہیے۔ آرمی کو سویلین حکمرانوں اور پارلیمنٹ کے پیچھے ہونا چاہیے کیونکہ اس وقت دنیا میں جمہوریت ہی ایک ایسا نظام ہے جس کے تحت کسی بھی ملک کو چلایا جا سکتا ہے۔

شاہد حامد

یہ چھ اگست 2003ء کا دن تھا۔ اس دن میری سالگرہ تھی۔ میں نے گھر پر رہ کر سالگرہ منانے کی بجائے نتھیا گلی جانے کا فیصلہ کیا۔ دو دن قبل اسلام آباد میں واقع فرانس کے سفارتخانے میں میری پنجاب کے سابق گورنر اور فاروق لغاری کے انتہائی قریبی دوست اور ان کے ایڈوائزر شاہد حامد سے ایک کھانے پر ملاقات ہوئی تھی۔ انہی دنوں میں نے چوہدری شجاعت والے تہلکہ خیز پروفائل شروع کے بعد ان تمام لوگوں سے ملنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا جو میرے خیال میں اس وقت بعض اہم جگہوں پر موجود تھے جب اس ملک میں یا تو سازشیں ہو رہی تھیں یا سیاسی نظام کی بساط لپیٹی جا رہی تھی۔ میں شاید کبھی شاہد حامد کے بارے میں نہ سوچتا لیکن انہیں فرانس کے سفیر کے گھر کے سرسبز و شاداب لان میں ڈھلتی ہوئی شام میں اپنی خوبصورت بیوی کے ساتھ کھڑے دیکھ کر پتہ نہیں کیوں میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ مجھے اس شخص سے ملنا چاہیے کیونکہ وہ بڑے اچھے طریقے سے ان تمام واقعات سے پردہ اٹھا سکتے ہیں کہ کیسے اور کن حالات میں 5 نومبر 1996ء کو بینظیر بھٹو کی حکومت ان کے دوست فاروق لغاری نے توڑی اور آرمی چیف جہانگیر کرامت کا اس میں کیا کردار تھا۔ چیف جسٹس سجاد علی شاہ کیا گیم کھیل رہے تھے۔ نواز شریف کے ساتھ مستقبل کے معاملات کیسے اور کون طے کر رہا تھا اور سب سے بڑھ کر فاروق لغاری نے کن حالات میں ملک کی صدارت سے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ بات بھی بڑی اہم تھی کہ آخر

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

شاہد حامد کیسے اپنے پرانے دوست فاروق لغاری کو دیکھا چھوڑ کر پیچھے سے نواز شریف کیمپ میں شامل ہوئے اور لغاری کے استعفی کے بعد پنجاب کے گورنر تعینات ہوگئے۔

جب میں نے شاہد حامد کو اپنا تعارف کروایا اور اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں ان کا اپنے اخبار ڈیلی ٹائمز کے لیے انٹرویو کرنا چاہتا ہوں تو مجھے بہت خوشگوار حیرت ہوئی کہ شاہد حامد سے زیادہ ان کی بیگم نے بڑے پرجوش انداز میں اس آئیڈیے کی نہ صرف تائید کی بلکہ اس سے پہلے کہ شاہد حامد کوئی مثبت یا منفی جواب دیتے انہوں نے دو دن بعد کا مجھے وقت دے دیا۔ انہوں نے مجھے یہ بتایا کہ اگر میں ان کا انٹرویو کرنا چاہ رہا ہوں تو مجھے نتھیا گلی آنا پڑے گا جہاں وہ اس وقت کے وزیر خارجہ خورشید محمود قصوری کی عالیشان کوٹھی میں اپنے بچوں اور نواسے نواسیوں کے ساتھ چھٹیاں منانے گئے ہوئے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ ایک مہذب اور اچھی گفتگو کرنے والی بیگم شاہد حامد چاہتی تھیں کہ ان کے میاں دوبارہ پاکستانی سیاست میں شامل ہوں اور ان کی باتیں پوری فیملی کو ایک نئے سرے سے سیاسی ابھار سے جوڑ سکتی ہیں۔

دو دن بعد میں نے اپنے ایک پیارے دوست ڈاکٹر ظفر الطاف سے گاڑی اور ڈرائیور مانگا اور نتھیا گلی چلا گیا۔ میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ اچھے، خوبصورت اور مسحور کر دینے والے ماحول میں کبھی کسی کا انٹرویو نہیں کیا جو خورشید قصوری کی کوٹھی کے عقب میں واقع بالکونی میں بیٹھ کر دھیمی دھیمی بارش اور بدن سے ٹکراتی سرد ہوا میں بیٹھ کر شاہد حامد کا کیا تھا۔ پتہ نہیں کیا بات ہے کہ اس بالکونی میں بیٹھ کر دور تک پھیلی سرسبز و شاداب وادی جسے گہرے بادلوں نے اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا، میں کبھی نہیں بھلا سکا اور میں دنیا میں جہاں بھی گیا وہاں اس گھر میں گزرے ہوئے چند گھنٹے میری یادوں میں ہمیشہ شامل رہے ہیں۔

پانچ گھنٹے بعد جب میں اس ٹھنڈے اور خوبصورت موسم میں مری کے پہاڑوں پر ڈھلتی شام میں اسلام آباد کی طرف واپس روانہ ہوا تو مجھے احساس ہوا کہ اس ملک میں رہنے والے مجھ جیسے عام لوگ اپنے حکمرانوں اور ان کی سازشوں اور خواہشوں کی قیمت کیسے ادا کرتے آئے ہیں۔ یقین جانیے اگر میں شاہد حامد سے نہ ملتا اور وہ بھی بڑی ایمانداری سے مجھے بینظیر بھٹو، فاروق لغاری، نواز شریف، چیف جسٹس سجاد علی شاہ اور جنرل جہانگیر کرامت کی اندرونی باتیں نہ بتاتے تو شاید میں اس ملک کی سیاست کو

اپنے اپنے انداز میں نہ کچھ پہچانتا کہ آج میں کچھ کہتا ہوں۔

یہ بڑا عجیب سا اتفاق ہے کہ شاہد حامد کے والد جنرل حامد پاکستان کے تیسرے آرمی چیف جنرل ضیاء کے دور میں اس عہدے تک پہنچے جنہیں وہ عہدہ سونپا گیا۔ ہے کہ ان کا تعلق بھٹو پارٹی سے تھا اور وہ اپنے آپ کو بھٹو کا وفادار تصور کرتے تھے۔ یہ ہم وقت کے بدلتے ہوئے کہ کس انسان کیسے بدلتے ہیں کہ اسی جنرل حامد کے بیٹے شاہد حامد نے 5 نومبر 1996ء کی رات اسی بھٹو کی بیٹی بینظیر کی حکومت توڑنے کے لیے اپنے دوست فاروق لغاری کو ایک صدارتی حکم نامہ تیار کر کے دیا۔ شاہد حامد کے ڈرافٹ کیے ہوئے اس صدارتی حکم نامے نے اس ملک کی تاریخ ہمیشہ کے لیے بدل کر رکھ دی تھی کیونکہ اسی کی بدولت آصف زرداری جیل میں گئے جہاں سے وہ 2004ء میں تقریباً آٹھ سال بعد رہا ہو کر ملک چھوڑ گئے۔ اس سے پہلے بینظیر بھٹو مارچ 1999ء میں ملک چھوڑ کر جلاوطن ہوئیں اور جب آٹھ سال بعد وہ ملک لوٹیں تو راولپنڈی کے بازار میں سرعام ماری گئیں۔ اگر اس رات بینظیر بھٹو کی حکومت نہ توڑی جاتی تو شاید یہ سب کچھ مختلف ہو سکتا تھا۔

خورشید قصوری کی درختوں میں گھری اس خوبصورت کوٹھی کے عقبی حصے کی بالکونی میں بیٹھے بارش کے قطروں کی دھیمی دھیمی سرسراہٹ میں شاہد حامد کو ابھی بھی وہ 5 نومبر کی رات سات سال بعد بڑی اچھی طرح یاد تھی جب ہر پانچ منٹ بعد فاروق لغاری ان کے کمرے میں آتے اور کہتے "شاہد جری اپ ایمرجنسی کے آرڈرز جلدی تیار کرو۔"

یہ شاید اس خوبصورت ماحول کا اثر تھا جس نے مجھے چاروں اطراف سے اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا یا پھر شاہد حامد جیسا ایک نفیس لیکن زیرک انسان اپنا دل کھولنے پر تلا ہوا تھا یا پھر فاروق لغاری کے اس پرانے دوست کو اس بات کا احساس تھا کہ رؤف اسلام آباد سے اتنی دور صرف اس کا انٹرویو کرنے آیا ہے لہٰذا اس سے کچھ نہ چھپایا جائے۔ بہر حال، جو بھی وجہ تھی شاہد حامد نے بڑی ایمانداری سے اس دور کے اہم واقعات کو بڑی تفصیل سے میرے سامنے ایک ایک کر کے بیان کرنا شروع کیا اور میں نے اپنے آپ کو اس شخص کی طرح محسوس کیا جسے وقت بڑی تیزی سے سات سال پیچھے لے گیا ہو جب کچھ طاقتور لوگ محض مزید طاقت حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کر رہے تھے اور آج وہ اس ظالم تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں اور ان کی جگہ جنرل مشرف صدر اور جمالی وزیراعظم ہیں۔

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

جس دن فاروق لغاری اس ملک کے صدر بنے انہوں نے اسی لمحے اپنے ایچی سن کالج کے دوست شاہد حامد کو اپنا ایڈوائزر مقرر کر لیا۔ فاروق لغاری نے شاہد حامد سے جو پہلی لیگل ایڈوائس لی وہ سپریم کورٹ کے اس فیصلے کے بارے میں تھی جس میں ججوں کی سینیارٹی کا فیصلہ دیا گیا تھا۔ بینظیر بھٹو سپریم کورٹ کے اس فیصلے پر عمل کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ بینظیر بھٹو اور فاروق لغاری نے ایک اہم میٹنگ بھی کی تھی جس میں یہ گفتگو ہوئی تھی کہ سپریم کورٹ کے فیصلے پر کس طرح عملدرآمد کیا جائے۔ اس اہم میٹنگ میں فاروق لغاری اور بینظیر بھٹو کے علاوہ صدر کے پرنسپل سیکرٹری شمشیر علی خان، شاہد حامد، رضا ربانی، مرحوم جسٹس منیر اور ڈپٹی اٹارنی جنرل بھی موجود تھے۔ بینظیر بھٹو نے فاروق لغاری کو صاف لفظوں میں بتا دیا کہ وہ چیف جسٹس سجاد علی شاہ کو برطرف کر دیں۔ فاروق لغاری نے بینظیر کی بات سن کر شاہد حامد کی طرف دیکھا اور اس کی رائے مانگی۔ شاہد حامد نے بتایا کہ ججوں کی سینیارٹی کا کیس متفقہ طور پر سنایا گیا ہے اور تمام جج اس پر عملدرآمد چاہتے ہیں لہٰذا یہ کوئی سمجھداری کی بات نہیں ہوگی اگر ہم نے سپریم کورٹ کے فیصلے پر عمل کرنے کی بجائے چیف جسٹس کو ہٹا دیا۔

صدر لغاری نے شاہد حامد کی اس ایڈوائس سے پورا اتفاق کیا اور بینظیر بھٹو کی اس بات کو ٹھکرا دیا کہ وہ چیف جسٹس کو فارغ کر دیں۔

یہ وہ پہلا واقعہ تھا جس نے بینظیر بھٹو اور فاروق لغاری کے درمیان ہمیشہ کے لیے ایک ایسی خلیج حائل کر دی تھی جو آخر کار بینظیر حکومت کے ٹوٹنے اور کچھ ماہ بعد فاروق لغاری کے استعفیٰ دینے پر ختم ہوئی۔

اپنی یادوں میں کھوئے شاہد حامد نے یاد کیا کہ یہ اگست 1996ء کی بات ہے۔ وہ اسی گھر میں چھٹیاں منانے آئے ہوئے تھے جب صدر پاکستان فاروق لغاری نے انہیں ٹیلی فون کیا اور کہا کہ وہ فوری طور پر اسلام آباد واپس آ جائیں۔ وہ جونہی اسلام آباد پہنچے تو فاروق لغاری نے شاہد حامد کو چیف جسٹس سجاد علی شاہ کا ایک خط دکھایا جس میں انہوں نے یہ شکایت کی تھی کہ پیپلز پارٹی کی حکومت نے اب تک ججوں کے سینیارٹی والے کیس پر عمل نہیں کیا تھا۔ اس خط میں چیف جسٹس سجاد علی شاہ نے یہ بھی وارننگ دی تھی کہ ان کی ججمنٹ پر عمل نہ کرنے سے ایک بہت بڑا آئینی بحران پیدا ہو رہا ہے۔ اس خط کے ملنے کے بعد فاروق لغاری بڑے پریشان تھے اور انہیں یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ جسٹس سجاد علی شاہ اس

خط کے ذریعے انہیں کیا پیغام بھیجنا چاہ رہے ہیں۔

شاہد حامد نے لغاری کو بتایا کہ چیف جسٹس انہیں بڑے واضح الفاظ میں یہ بات بتا رہے ہیں کہ ملک کو آئینی طور پر نہیں چلایا جا رہا ہے۔ چیف جسٹس نے صدر پاکستان کو ان کی آئینی ذمہ داریاں یاد دلائی ہیں جو ان کو انتہائی متنازعہ شق 58(2)b کے تحت حاصل ہیں۔ اس آئینی شق کے ذریعے صدر منتخب حکومت اور اسمبلی توڑ سکتا تھا۔ لغاری نے شاہد حامد سے پوچھا کہ وہ چیف جسٹس کے اس خط پر کیا ردعمل ظاہر کریں۔ شاہد حامد نے لغاری کو مشورہ دیا کہ وہ سپریم کورٹ کو ایک ریفرنس بنا کر بھیجیں جس میں ان سے یہ رائے لی جائے کہ ان حالات میں کیا صدر پاکستان کوئی بھی ایکشن لے سکتے ہیں۔

فاروق لغاری کو شاہد حامد کی یہ تجویز بہت پسند آئی اور فوری طور پر انہیں کہا گیا کہ وہ سپریم کورٹ آف پاکستان کو ایک ریفرنس بھیجنے کی تیاری کریں۔

شاہد حامد نے مجھے بتایا کہ جب بینظیر بھٹو کو فاروق لغاری کے اس فیصلے کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ سپریم کورٹ کو ریفرنس بھیجنے والے ہیں تو وہ بڑے شدید دباؤ کا شکار ہوئیں اور انہوں نے فوری طور پر ججز کیس کے فیصلے پر عمل کر دیا۔

تاہم، فاروق لغاری مطمئن نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ بینظیر بھٹو حکومت کی خراب کارکردگی سے ناخوش تھے۔ صدر لغاری کے خیال میں اگر بینظیر بھٹو کی حکومت زیادہ دیر تک چلنے دی گئی تو پاکستان معاشی دیوالیہ پن کا شکار ہو جائے گا۔

آخر ایک دن صدر لغاری نے شاہد حامد کو بلایا اور پہلی دفعہ یہ اظہار کیا کہ وہ بینظیر بھٹو حکومت کو برطرف کرنے کا سوچ رہے ہیں۔ یہ بات سن کر شاہد حامد چونک گئے اور انہوں نے صدر لغاری کو بتایا کہ بینظیر حکومت کو توڑنے کے لیے محض ایک وجہ ناکافی ہے۔ سپریم کورٹ کبھی بھی صدر لغاری کے حکومت اور اسمبلیوں کو برطرف کرنے کے فیصلے کو قبول نہیں کرے گی محض اس بنیاد پر کہ صدر کا نشانہ بینظیر بھٹو ہیں۔ تاہم، یہ ممکن ہے کہ اگر ریاست کے ایک سے زیادہ ادارے کرپشن میں ملوث ہیں تو پھر بینظیر بھٹو حکومت کو برطرف کرنے کی بہت ساری وجوہات کورٹ کے سامنے پیش کی جا سکتی ہیں۔

شاہد حامد نے صدر لغاری کو یہ تجویز 1988ء سے لے کر 1993ء تک برطرف ہونے والی حکومتوں اور ان کے عدالتوں میں چلنے والے کیسوں اور ان کے فیصلوں کی روشنی میں دی تھی۔ 1988ء

www.freepdfpost.blogspot.com

!!!allurdupdfnovels!!!blogspot!!!com!!!

میں حاجی سیف اللہ نے جنرل ضیاء کے جونیجو کی حکومت توڑنے کے فیصلے کو چیلنج کیا تھا۔ 1990ء میں خواجہ طارق رحیم نے غلام اسحاق خان کی بینظیر بھٹو کی حکومت کی برطرفی کے خلاف پٹیشن دائر کی تھی جبکہ 1993ء میں نواز شریف نے غلام اسحاق خان کے اپنی حکومت توڑے جانے کے خلاف سپریم کورٹ میں پٹیشن دائر کی تھی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ سپریم کورٹ نے سندھ کے دو وزرائے اعظم جونیجو اور بینظیر بھٹو کی حکومتیں بحال نہیں کیں جبکہ پنجاب سے آنے والے وزیراعظم نواز شریف کی حکومت بحال کی گئی تھی۔ بینظیر بھٹو ہمیشہ عدالتوں کے ان فیصلوں کو چمک کا نتیجہ قرار دیتی رہی تھیں۔

بینظیر بھٹو کا کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہو چکا تھا۔ شاہد حامد کے بقول ایک دن صدر لغاری نے 27 ستمبر 1996ء کو انہیں اپنے پاس بلایا اور حکومت کی کرپشن سے بھری ہوئی فائلوں کا ایک انبار ان کے حوالے کیا۔ شاہد حامد کو کہا گیا کہ وہ بینظیر بھٹو کی برطرفی کے آرڈر تیار کریں۔ دن رات ایک کر کے آخر شاہد حامد نے ان فائلوں میں سے نو پوائنٹ تیار کیے جنہیں صدر لغاری کو حکومت کی برطرفی آرڈر کے ساتھ چارج شیٹ کے طور پر پڑھنا تھا۔ اس چارج شیٹ میں جو الزامات لگائے گئے تھے ان میں سے ججوں کے فون ٹیپ کرنے کے الزامات، پی آئی اے، سوئی ناردرن گیس، آئل فیلڈز اور واپڈا میں کرپشن کے الزامات بھی شامل تھے۔ شاہد حامد نے ان تمام بڑے بڑے لوگوں کے ناموں کی فہرست بھی حاصل کر لی تھی جن کے ٹیلیفون بینظیر بھٹو کے حکم پر ٹیپ کیے جا رہے تھے۔ اس وقت کے جج میں [illegible] نے خصوصی طور پر شاہد حامد کو فون کیا یہ جاننے کے لیے کہ کیا ان کا نام بھی اس فہرست میں شامل ہے جن کے فون ٹیپ کیے جا رہے تھے۔

نتھیا گلی میں واقع اس خوبصورت گھر کی بالکونی میں بارش کے قطروں کی سرسراہٹ میں میں نے پوچھا کہ شاہد حامد سے پوچھا کیا ان کا نام بھی اس فہرست میں شامل تھا۔ وہ تھوڑا سا ہنس دیے اور بولے ہاں!

میرا اگلا سوال یہ تھا کہ کیا فاروق لغاری کے خاندان کے لوگوں کے بھی ٹیلیفون ٹیپ کیے جا رہے تھے۔ شاہد حامد نے کہا بالکل۔

ایک بات میرے ذہن میں بار بار آ رہی تھی کہ آخر ایسی کیا بات تھی کہ بینظیر بھٹو حکومت توڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا یہ کام دن میں نہیں ہو سکتا تھا۔

اس پر شاہد حامد نے ایک نئی کہانی سنائی۔

دراصل صدر لغاری اس بات پر زور دے رہے تھے کہ حکومت کی برطرفی کا راز کسی صورت بھی اپنے وقت سے پہلے افشا نہیں ہونا چاہیے۔ یہی وجہ تھی کہ صرف چار لوگوں کو اس بات کا علم تھا کہ 4 نومبر 1996ء کی رات بینظیر بھٹو حکومت توڑ دی جائے گی۔

میں نے پھر پوچھا کہ وہ چار لوگ کون تھے۔ تو شاہد حامد بولے کہ ایک تو خود صدر پاکستان، دوسرے ان کے پرنسپل سیکرٹری شمشیر خان، آرمی چیف جہانگیر کرامت اور چوتھے وہ (شاہد حامد) خود تھے۔

منصوبے کے مطابق بینظیر بھٹو حکومت کی برطرفی کے آرڈر جنرل جہانگیر کرامت کو بھیجے جانے تھے تاکہ وہ ٹرپل ون بریگیڈ کو ہدایات جاری کر سکیں۔ تاہم، جب شاہد حامد بینظیر بھٹو کی برطرفی کے آرڈر تیار کر رہے تھے تو اسی وقت انگریزی اخبار دی نیشن کے ایڈیٹر عارف نظامی شمشیر خان کے کمرے میں داخل ہوئے۔ انہیں دیکھ کر شاہد حامد گھبرا گئے کیونکہ اس مرحلے پر کسی بھی اخبار نویس کی وہاں موجودگی ان کے پورے پلان کو خراب کر سکتی تھی۔ گھبراتے ہوئے شاہد حامد نے فوراً اپنے کاغذات اکٹھے کرنے شروع کیے تاکہ عارف نظامی کی ان پر نگاہ نہ پڑ سکے۔ عارف نظامی کے اندر موجود ایک صحافی نے انہیں شک میں ڈال دیا کیونکہ ان دنوں بینظیر بھٹو اور فاروق لغاری کے اختلافات کی کہانیاں زبان زد عام ہو رہی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے پوچھ لیا کہ وہ اس وقت پرنسپل سیکرٹری کے کمرے میں بیٹھ کر کیا ٹائپ کر رہے ہیں۔ شاہد حامد کو فوری طور پر کوئی جواب نہ سوجھا تو انہوں نے عارف نظامی کو بتایا کہ وہ دراصل ایک آرڈیننس کا ڈرافٹ شمشیر خان کے کمرے میں بیٹھ کر ٹائپ کر رہے ہیں۔ شاہد حامد دعا کر رہے تھے کہ عارف نظامی جلد از جلد وہاں سے چلے جائیں تاکہ وہ برطرفی کے آرڈر تیار کر سکیں۔ تاہم عارف نظامی وہاں دو گھنٹے تک بیٹھے شاہد حامد سے گپ شپ کرتے رہے۔ شاہد حامد کے پلے عارف نظامی کی کوئی بات نہیں پڑ رہی تھی کیونکہ ان کے ذہن پر برطرفی کا آرڈر سوار تھا اور یہ "نیک کام" آج ہی انجام دیا جانا تھا۔ وقت بڑی تیزی سے گزر رہا تھا اور عارف نظامی صاحب تھے کہ اٹھنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ آخر خدا نے شاہد حامد کی سن لی اور عارف نظامی ایوان صدر سے اٹھ کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد شاہد حامد نے بینظیر بھٹو کی برطرفی کا آرڈر مکمل کیا اور صدر لغاری نے اس پر دستخط کر

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

[illegible]

'Shahid Hamid unfolds palace intrigues'

[illegible]

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

میرے خیال میں فاروق لغاری چاہتے تھے کہ ان تمام صحافیوں کو کابینہ میں وزیر بنایا جائے جن کی کریڈیبلٹی تھی اور جو بینظیر بھٹو حکومت سے کرپشن کی وجہ سے نفرت کرتے تھے اور سب سے بڑھ کر وہ اپنے اخبارات و جرائد میں مسلسل حکومت کی نااہلی کے خلاف مضمون لکھتے رہے تھے اور فاروق لغاری اور جنرل جہانگیر کرامت کو ایک مسیحا کے طور پر پیش کرتے رہے تھے۔ نجم سیٹھی اور ارشاد احمد حقانی تو اس جھانسے میں آ گئے تاہم عارف نظامی زیادہ پروفیشنل اور ایماندار صحافی ثابت ہوئے اور انہوں نے فاروق لغاری اور شاہد حامد کی دی ہوئی یہ میٹھی گولی کھانے سے انکار کر دیا۔

تنہائی کی فضاؤں میں خنکی بڑھنی شروع ہو گئی تھی لیکن مجھے احساس تھا کہ ابھی شاہد حامد سے بہت کچھ سننا اور پوچھنا ہے۔ میں نے ایک سرے سے سوالات کا سلسلہ پھر شروع کیا۔

میرے لیے اہم بات یہ تھی کہ بینظیر بھٹو کی برطرفی سے پہلے آخر کابینہ کے ناموں کو کس نے بیٹھ کر حتمی شکل دی تھی۔

شاہد حامد نے بتایا کہ جب سے فاروق لغاری نے بینظیر بھٹو حکومت برطرف کرنے کا فیصلہ کیا تھا اس کے بعد وہ اپنے ذہن میں کابینہ کے ان وزیروں کی فہرست بنا چکے تھے جنہیں انہوں نے حلف دینا تھا۔ تاہم کچھ ناموں کا فیصلہ برطرفی آرڈر پر دستخط کرنے کے بعد کیا گیا۔

حکومت برطرف کرنے کے بعد فاروق لغاری نے ورلڈ بینک کے ایک ملازم شاہد جاوید برکی کو خود ٹیلی فون کیا اور انہیں ملک کا وزیر خزانہ بنانے کی پیشکش کی۔ ورلڈ بینک کے صدر مسٹر ولفنسن نے باقاعدہ فون کر کے صدر لغاری کو پاکستان میں ایک منتخب سیاسی حکومت برطرف کرنے پر مبارکباد پیش کی۔

شاہد حامد کی اس بات سے یہ بھی ثابت ہو رہا تھا کہ جہاں نواز شریف، عابدہ حسین، شہباز شریف، چوہدری نثار علی خان اور آرمی چیف جہانگیر کرامت بینظیر بھٹو حکومت برطرف کرنے کی سازش میں شامل تھے وہاں عالمی ادارے بھی باقاعدہ اپنا رول ادا کر رہے تھے۔ بعد میں مجھے بینظیر بھٹو دور کے وفاقی وزیر ڈاکٹر شیر افگن نیازی نے یہ بتایا تھا کہ دراصل ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف بینظیر بھٹو پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ وہ پاکستان میں بجلی اور گیس کے نرخ بڑھا دیں۔ تاہم بینظیر بھٹو نے ان کی یہ شرائط ماننے سے انکار کر دیا تھا کہ وہ عوام پر دباؤ نہیں ڈالنا چاہتی تھیں لہٰذا انہیں سزا دلوانے میں ورلڈ بینک اور اس

کے ملازم بھی پیش پیش تھے۔

بینظیر بھٹو حکومت برطرف ہونے کے بعد بہت سارے لوگوں کی لاٹری کھل گئی تھی۔ شاہد حامد کو تین اہم وزارتوں کی ذمہ داری سونپی گئی۔ انہیں سوچ سمجھ کر وزارت دفاع، قانون اور اسٹیبلشمنٹ کی وزارتیں دی گئیں تاکہ وہ فوج، عدلیہ اور سول بیوروکریسی کو اپنے حق میں کر سکیں۔ صدر لغاری چاہتے تھے کہ سیاسی جماعت سے ان کے دو نمائندے بھی کابینہ میں لیے جائیں۔ عابدہ حسین اور شفقت محمود کے ناموں پر بھی غور کیا گیا۔ کچھ ناموں کا فیصلہ تو بہت پہلے ہو چکا تھا۔ دو اہم صحافیوں نجم سیٹھی اور ارشاد حقانی کو بھی وزیر بنایا گیا کیونکہ انہوں نے بھی اپنی تحریروں کے ذریعے بینظیر بھٹو کے خلاف صدر لغاری کے ہاتھ مضبوط کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ملک معراج خالد لاہور میں واقع اپنے گھر میں سو رہے تھے جب آدھی رات کو انہیں ٹیلی فون کر کے بتایا گیا کہ انہیں ملک کا نگران وزیراعظم مقرر کر دیا گیا ہے۔

شاہد حامد نے یہ دعویٰ کیا کہ معراج خالد کو بینظیر بھٹو کی برطرفی کے منصوبے کا ہرگز علم نہیں تھا۔

تاہم مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر ایک دوسرے کے دشمن لغاری اور نواز بینظیر بھٹو حکومت کو برطرف کرنے کے لیے ایک نکتے پر کیسے راضی ہو گئے تھے۔

شاہد حامد نے گہرا سانس لیا اور مجھے بتایا کہ دراصل پہلے دن سے ہی لغاری اپنی حیثیت صدر پاکستان کے طور پر منوانا چاہ رہے تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ لوگ انہیں صدر پاکستان سمجھیں نہ کہ پیپلز پارٹی حکومت کا جیالا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپوزیشن کے ساتھ بھی رابطہ کرنے کی کوئی صورت ڈھونڈ رہے تھے۔ تاہم نواز شریف زیادہ سمجھدار تھے اور وہ یہ چاہتے تھے کہ اگر فاروق لغاری اور ان کے درمیان کوئی ملاقات ہو تو اس میں کوئی اہم باتیں یا ایجنڈا ڈسکس ہونا چاہیے۔ محض چائے پینے یا کھانا کھانے کے لیے وہ ملاقات نہیں کریں گے۔ اس پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ دونوں اطراف سے پہلے ایک ٹیم مل جائے جو نواز اور لغاری کے درمیان ملاقات کے ایجنڈے کے لیے تیاری کرے۔ شاہد حامد کو صدر لغاری نے نامزد کیا کہ وہ نواز شریف کی ٹیم سے مذاکرات کریں گے جبکہ نواز شریف نے سرتاج عزیز، جنرل مجید ملک، چوہدری نثار علی اور شہباز شریف کو اپنی طرف سے نامزد کیا۔ یوں ان لیڈروں کی پہلی ملاقات عابدہ حسین کے اسلام آباد میں واقع گھر میں ہوئی۔ شاہد حامد عابدہ حسین کے گھر گئے جہاں نواز شریف کے علاوہ چوہدری نثار، عابدہ اور شہباز شریف موجود تھے۔ ملاقات کے دوران شاہد حامد نے یہ

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

تجویز دی کہ نواز شریف کو لغاری سے ملنا چاہیے۔ تاہم، سیاسی طور پر بھی نواز اور ان کے ساتھیوں کو یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ہے لہٰذا وہ اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہ رہے تھے۔ بینظیر بھٹو سے 1993ء میں نواز شریف کے بجائے اسحاق خان کا ساتھ دینے پر اسے سزا دینے کا سنہری موقع ان کے ہاتھ آ رہا تھا۔ لہٰذا نواز اور ان کے ساتھیوں نے شاہد حامد سے پوچھا کہ اگر ان کی فاروق لغاری سے ملاقات ہوتی بھی ہے تو اس کے بدلے میں انہیں کیا ملے گا۔ شاہد حامد نے ان سے پوچھا کہ وہ کیا چاہتے ہیں تو نواز نے بتایا کہ سب سے پہلے لغاری کو پاکستان مسلم لیگ نواز کے بینظیر بھٹو حکومت کے خلاف لیے گئے سٹینڈ کی تائید کرنی چاہیے۔ اگر ان دونوں کے درمیان ملاقات بھی ہو تو اس ملاقات کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ بھی نکلنا چاہیے۔

ابھی یہ گفتگو جاری ہی تھی کہ ان میں سے کسی نے شاہد حامد سے یہ پوچھ لیا کہ کیا ان کے پاس واقعی فاروق لغاری کی اتنی اتھارٹی موجود ہے کہ وہ اتنے بڑے اہم فیصلے بیٹھ کر ان سے ڈسکس کر سکیں۔

اس خفیہ ملاقات کا یہ نتیجہ نکلا کہ نواز شریف شاہد حامد سے چند مضبوط یقین دہانیاں لینے کے بعد صدر لغاری سے ملاقات کے لیے تیار ہو گئے۔ شاہد حامد نے صدر پاکستان کے نمائندے کی حیثیت سے سب سے بڑی گارنٹی یہ دی کہ اس ملک میں جب بھی الیکشن ہوں گے وہ آزادانہ اور شفاف ہوں گے۔

میں نے شاہد حامد سے پوچھ لیا کہ جب عابدہ حسین کے گھر پر یہ خفیہ ملاقاتیں ہو رہی تھیں تو کیا ان میں یہ بات بھی چھیڑی گئی تھی کہ اگر الیکشن کے بعد نواز شریف اس ملک کے وزیراعظم بنتے ہیں اور ان کی ٹرم کے دوران ہی فاروق لغاری دوبارہ صدارتی انتخاب کے لیے امیدوار بنتے ہیں تو کیا مسلم لیگ نواز انہیں سپورٹ کرے گی۔

شاہد حامد نے جواب دیا کہ جب نواز اور لغاری کے درمیان پہلی ملاقات ہوئی تو اس میں اس طرح کی کوئی بات نہیں کی گئی۔ تاہم، شاہد حامد نے اس بات کا انکشاف کیا کہ جب نواز شریف کے ساتھی صدارتی نمائندوں کے ساتھ بینظیر بھٹو حکومت توڑنے کے لیے صلاح مشورے میں مصروف تھے تو انہوں نے یقیناً صدر لغاری کو دوسری دفعہ صدر بنانے کی پیشکش ضرور کی تھی۔ چوہدری نثار علی خان اور شہباز شریف دونوں نے باقاعدہ طور پر فاروق لغاری کو صدر بنانے کے حوالے سے شاہد حامد کو آفر کی تھی۔ اس کے بعد جب لغاری اور نواز شریف کی مزید ملاقاتیں ہوئیں تو نواز شریف نے براہ راست بھی

فاروق لغاری کو خود پیشکش کی تھی۔ تاہم، فاروق لغاری نے ہر دفعہ دوسری ٹرم کے لیے صدر بننے سے انکار کیا۔ لغاری کی صرف ایک ہی خواہش تھی کہ اس ملک کو آئینی تقاضوں کے مطابق چلایا جائے۔ شاہد حامد نے یہ بھی انکشاف کیا کہ بینظیر بھٹو حکومت کی برطرفی کے بعد عابدہ حسین خود ایک پیشکش لے کر آئی تھیں کہ پاکستان مسلم لیگ نواز نئے انتخابات میں فاروق لغاری کے امیدواروں کو 20% ٹکٹیں دینے کے لیے تیار تھی۔ تاہم، لغاری نے انکار کر دیا۔

میرا اپنا یہ خیال تھا کہ نواز شریف، شہباز شریف اور چوہدری نثار علی خان صدر لغاری کے ساتھ وہی کھیل رہے تھے جو بینظیر بھٹو نے فاروق لغاری اور آفتاب شیرپاؤ کے ساتھ مل کر 1993ء میں اسحاق خان کے ساتھ کھیلا تھا۔ جب نواز شریف اور اسحاق خان میں اقتدار کے لیے کشمکش بڑھی تو دونوں نے اس وقت کی اپوزیشن لیڈر بینظیر بھٹو سے رابطہ کیا کیونکہ یہ طے تھا کہ جس کے پلڑے میں بینظیر بھٹو اپنا وزن ڈالیں گی وہ جیت جائے گا۔ بینظیر کو نواز شریف یہ آفر کر رہے تھے کہ اگر وہ ان کی حکومت ڈس مس کرانے میں حصہ دار نہ بنیں تو ان پر اور آصف زرداری پر قائم ہونے والے مقدمات جو 1990ء میں اسحاق خان کے کہنے پر قائم کیے گئے تھے انہیں ختم کر سکتے ہیں اور ایک نیا آزاد الیکشن کمیشن بھی بنایا جا سکتا ہے تاکہ جب نواز شریف کے پانچ سال پورے ہوں تو انتخابات آزاد اور شفاف ہوں۔ دوسری طرف اسحاق خان اپنے داماد انور سیف اللہ کے ذریعے یہ آفر کر رہے تھے کہ اگر وہ قومی اسمبلی کی نشستوں سے مستعفی ہو جائیں جو صدر کو اسمبلیاں توڑنے کا جواز فراہم کریں گی تو وہ نئے الیکشن کے بعد انہیں دوبارہ وزیراعظم قبول کرنے پر تیار ہوں گے۔ اس کے بدلے میں بینظیر بھٹو سے یہ یقین دہانی چاہتے تھے کہ 1993ء میں ان کی صدارتی معیاد ختم ہو رہی تھی لہٰذا انہیں پانچ سال کے لیے مزید صدر بنایا جائے گا۔ صدر اسحاق اور نواز شریف میں اختلافات اس وجہ سے بھی پیدا ہوئے تھے کہ وہ چاہتے تھے کہ نواز شریف صدارتی انتخابات سے چھ ماہ پہلے ہی باقاعدہ یہ اعلان کر دیں کہ وہ ان کے صدارتی امیدوار ہوں گے۔ نواز شریف حکومت کے انٹیلی جنس بیورو کے سربراہ بریگیڈیئر امتیاز احمد نے بھی یہ بات مجھے خود بتائی تھی کہ نواز شریف اور غلام اسحاق خان کے درمیان اصل اختلافات اسی بات سے شروع ہوئے تھے کہ وزیراعظم اسحاق خان کو پانچ سالوں کے لیے مزید صدر بنانے کی گارنٹی دینے کو تیار نہیں تھے۔ یوں غلام اسحاق خان نے نواز شریف کو سزا دینے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کام کے لیے وہ بینظیر

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

بھٹو کی مدد چاہتے تھے۔ بینظیر بھٹو کے لیے یہ بڑا مشکل وقت تھا کہ وہ کس کا ساتھ دیں۔ ایک طرف اگر وہ صدر اسحاق کا ساتھ دیتیں تو نہ صرف نواز شریف کو 1990ء میں اسی صدر اسحاق، اسلم بیگ اور جنرل حمید گل کے ساتھ مل کر ان کی 6 اگست کو حکومت برطرف کرانے پر نہ صرف اب ان کی حکومت ڈس مس کرا کے سزا دی جا سکتی تھی بلکہ نئے انتخابات کی وجہ سے وہ فوری طور پر ملک کی وزیراعظم بھی بن سکتی تھیں اور آصف زرداری بھی فوری طور پر رہا ہو سکتے تھے جبکہ نواز شریف کا ساتھ دینے میں بینظیر کو دو سال مزید انتخابات کا انتظار کرنا پڑتا۔ یوں غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ صدر اسحاق کا ساتھ دے کر ایک تیر سے کئی شکار کیے جا سکتے ہیں۔ تاہم، کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ صدر اسحاق خان کا ساتھ دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ پیپلز پارٹی نے اصولوں پر سمجھوتہ کر کے ایک ایسے شخص کا ساتھ دیا جس نے بینظیر بھٹو اور آصف زرداری کو کرپشن چارجز پر برطرف کر کے جیل میں ڈال دیا تھا۔ کسی سیانے نے مشورہ دیا کہ اتنی معمولی سی بات کو اتنے بڑے کاز کے سامنے رکاوٹ نہ بننے دیں اور یوں یہ طے پایا کہ اسی کرپٹ شخص کو صدر اسحاق خود اپنی کابینہ کا ممبر بنا کر اور اس سے حلف لے کر ایک طرح کی اسے کلین چٹ فراہم کر دیں گے۔ یوں آسمان نے یہ نظارہ بھی دیکھا کہ جس آصف زرداری کو اسحاق خان کے کہنے پر کرپشن الزامات میں تین سال جیل میں رکھا گیا تھا اسی صدر نے اسے اپنے ہاتھوں سے حلف دیا۔ ان مذاکرات کے درمیان صدر اسحاق یہ گارنٹی چاہتے تھے کہ انہیں دوبارہ صدر بنایا جائے گا۔ بینظیر بھٹو نے بھی یہ گولی صدر اسحاق کو دی کہ وہ انہیں دوبارہ صدر منتخب کریں گی۔ صدر اسحاق بھی یہ گولی اس لیے نگل گئے کیونکہ 1988ء میں بینظیر بھٹو نوابزادہ نصراللہ خان کے مقابلے میں انہیں اپنا صدارتی امیدوار بنا چکی تھیں لہٰذا شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ تاہم، صدر اسحاق خان یہ بات بھول گئے تھے کہ ان پانچ سالوں میں بینظیر بھٹو نے بھی بہت کچھ سیکھ اور سمجھ لیا تھا۔ انہیں بھی اب سیاست کے گر آ گئے تھے۔ اسحاق خان یہ بھول گئے تھے کہ 1988ء میں جنرل اسلم بیگ اور جنرل حمید گل پاکستان کو چلا رہے تھے اور پانچ سال بعد پلوں کے نیچے سے بہت سارا پانی بہہ چکا تھا۔ اگرچہ اسحاق خان کو یقین تھا کہ فوج کے ایک پٹھان سپہ سالار عبدالوحید کاکڑ اپنے ایک پٹھان بھائی غلام اسحاق خان کا ساتھ دیں گے تاہم یہ ممکن نہ ہو سکا۔ یوں نواز شریف کی برطرفی اور ملک میں نئے انتخابات کے بعد جب نئے صدر کے انتخابات کا مرحلہ آیا اور غلام اسحاق خان پشاور سے دوڑے دوڑے اپنے کاغذات نامزدگی داخل کرانے آئے تو پتہ چلا کہ

گیم الٹ چکی تھی۔ اپنے داماد انور سیف اللہ کے ایف سیون میں واقع گھر میں بیٹھ کر اس زمانے کی بے ثباتی، دھوکے بازی اور سیاسی چالبازیوں کو روتے رہے۔ تاہم، وہ یہ بھول گئے تھے کہ ان کے ساتھ وہی کچھ ہوا تھا جو وہ دوسروں کے ساتھ کرتے آئے تھے۔ سیاست کے سینے میں نہ دل ہوتا ہے اور نہ خون کے رشتے دیکھے جاتے ہیں۔ یہ تو چالیں ہوتی ہیں۔ جو چل گیا وہ جیت گیا جو پیچھے رہ گیا وہ اپنی باری کا انتظار کرے یا پھر پشاور میں واقع اپنے گھر کی لائبریری میں بیٹھ کر ٹالسٹائی کا مشہور ناول War and peace کو نئے سرے سے پڑھے اور اپنی یادداشتوں کو قوم کی امانت سمجھ کر قلمبند کرنے کی بجائے ایک رات خاموشی سے اپنے بستر میں خدا کو پیارا ہو جائے۔

یہی وجہ تھی کہ نواز شریف بھی فاروق لغاری کے ساتھ وہی کھیل کھیل رہے تھے۔ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ لغاری کے ساتھ وہی کچھ ہو رہا تھا جو انہوں نے اسحاق خان کے ساتھ ہوتے ہوئے اپنی نظروں سے دیکھا تھا۔ تاہم، انسان میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ ابھی حالات میں برا کسی اور شخص کے ساتھ ہوا تھا وہ اس کے ساتھ نہیں ہوگا یا اپنے اوپر بڑھتے ہوئے غیر ضروری اعتماد کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو خدا کے بعد سب سے طاقتور شخص سمجھنا شروع کر دیتا ہے اور جب منہ کے بل گرتا ہے تو اس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ یہی کچھ نواز شریف کے وزیراعظم بننے کے بعد فاروق لغاری کے ساتھ ہوا۔ وہی نواز شریف جو بینظیر حکومت گرانے کے لیے فاروق لغاری کو دوسری مرتبہ صدر بنانے کے لیے تیار تھے، ان ہی شاہد حامد کے ہاتھ انہوں نے پیغام بھجوایا تھا کہ بہتر ہے کہ وہ صدارت سے مستعفی ہو جائیں ورنہ پارلیمنٹ کے ذریعے ان کا احتساب کر کے انہیں گھر بھیج دیا جائے گا۔

صدر غلام اسحاق خان اور فاروق لغاری ایک بات بھول گئے تھے کہ ان کے بارے میں یہ بات طے تھی کہ اگر وہ ان لوگوں کے وفادار ثابت نہیں ہوئے جنہوں نے انہیں صدر بنوایا تھا تو بھلا ان سے دوسرے لوگ وفا کی کیا توقع رکھیں۔ شاید یہ بات چنگیز خان کے بارے میں مشہور ہے کہ جب بغداد شہر کے حکمران کے خلاف چند لوگوں نے اس کے فوجیوں کی مدد کی اور فتح کے بعد ایک قطار میں کھڑے ہو کر اپنے انعام کا انتظار کرنے لگے تو اس نے ایک تاریخی فقرہ کہہ کر ان سب کی گردنیں اڑانے کا حکم دیا تھا کہ جو لوگ اپنی مٹی اور اپنے لوگوں کے وفادار نہیں وہ بھلا کسی اور کے کیا وفادار ہوں گے۔

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

نتھیا گلی کے خوبصورت جنگلوں اور پہاڑوں پر سے دھیرے دھیرے گزر رہا تھا اور میں ابھی بھی اس کشمکش کا شکار تھا کہ آخر فاروق لغاری بلوچ ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اور بینظیر بھٹو کو اپنی بہن سمجھتے تھے پھر بھی وہ کیونکر اتنا بڑا اقدام اٹھانے پر تیار ہو گئے تھے۔

شاہد حامد نے اپنے مخصوص دھیمے انداز میں مجھے بتانا شروع کیا کہ ماضی کے ان دو پرانے دوستوں کے درمیان اختلافات کی کوئی ایک وجہ نہیں تھی۔ پتہ نہیں کہاں سے صدر لغاری کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ مہران بینک اسکینڈل کے پیچھے آصف زرداری کا ہاتھ تھا جس کی وجہ سے ان کا عوام کی آنکھوں میں جو ایک صاف ستھرا امیج تھا وہ بری طرح متاثر ہوا تھا۔ وہ انکوائری کمیشن جو اس اسکینڈل کی تحقیقات کر رہا تھا، اس نے فاروق لغاری کو بیگناہ قرار دے دیا تھا لیکن اس کمیشن کی رپورٹ بھی میڈیا یا عوام کو ریلیز نہیں کی گئی۔ اس سے یہ تاثر ملا کہ بینظیر حکومت نہیں چاہتی تھی کہ لغاری پر لگنے والے کروڑوں روپے کے اس دھبے کو صاف کیا جائے۔ فاروق لغاری اس وجہ سے بھی بینظیر بھٹو سے خفا تھے کہ جب بھی انہوں نے محترمہ سے ان کی حکومت پر لگنے والے کرپشن کے الزامات پر بات کرنی چاہی تو وہ شدید ناراض ہو جاتی تھیں۔ محترمہ نے فاروق لغاری پر اتنا شک کرنا شروع کر دیا تھا کہ انہوں نے تمام وفاقی سیکرٹریوں کو باقاعدہ احکامات جاری کیے تھے کہ وہ ان کی اجازت کے بغیر صدر سے ملاقات نہیں کریں گے۔ تاہم ان تعلقات میں خرابی اس وقت آئی جب بینظیر بھٹو نے سپریم کورٹ کے ججز سینیارٹی کیس پر عمل کرنے سے انکار کیا تھا۔ کراچی میں مرتضیٰ بھٹو کے قتل نے رہی سہی کسر پوری کر دی جب بینظیر نے بالواسطہ صدر لغاری پر یہ الزام لگایا کہ وہ مرتضیٰ کو قتل کرنے کی سازش میں شریک تھے۔ بینظیر بھٹو کے اس الزام نے ایوان صدر کے مکینوں کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔ شاہد حامد کے مطابق جب بینظیر بھٹو نے مرتضیٰ کے قتل کا الزام ایوان صدر پر لگایا تو وہ خود بھی بہت پریشان ہو گئے تھے کیونکہ 20 ستمبر سے لے کر 5 نومبر کی درمیانی رات بینظیر بھٹو کی حکومت [illegible] فاروق لغاری [illegible] شاہد حامد کے کمرے میں ضرور تشریف لاتے تھے یہ سمجھنے کے لیے کہ برطرفی کا آرڈر تیار کرنے میں کتنی دیر لگتی ہے تاکہ جونہی فیصلہ ہو جائے بینظیر بھٹو کو گھر بھیج دیا جائے۔ مرتضیٰ کے قتل کا الزام لگنے کے بعد فاروق لغاری کسی صورت بھی بینظیر حکومت کو اقتدار میں رکھنے کا رسک نہیں لے سکتے تھے۔ تاہم شاہد حامد نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ

بینظیر بھٹو کی برطرفی کا آرڈر تیار کرنے کے لیے انہیں پی آئی اے سے ہوائی جہاز اور دیگر محکموں کی کرپشن کی جو فائلیں دی گئی تھیں وہ کس نے فراہم کی تھیں۔ تاہم یہ بات واضح تھی کہ اگر آرمی چیف جہانگیر کرامت صدر لغاری کے ساتھ تھے تو پھر یقیناً یہ نیک فریضہ آئی ایس آئی نے سرانجام دیا ہو گا۔

جونہی پیپلز پارٹی کی حکومت ختم ہوئی تو پنجاب سے پیپلز پارٹی کے بڑے بڑے لیڈروں کے فون آنے شروع ہو گئے۔ وہ سب فاروق لغاری کا ساتھ دینا چاہ رہے تھے۔ تاہم فاروق لغاری نے ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ اگرچہ انہی دنوں میں لغاری پارٹی بنانے کی سرگوشیاں شروع ہو چکی تھیں۔

باتوں باتوں میں شاہد حامد نے ایک اور انکشاف کیا کہ جنرل جہانگیر کرامت 1997ء کے الیکشن ملتوی کرانا چاہ رہے تھے۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے جہانگیر کرامت نے لغاری کو یہ بھی پیغام دیا تھا کہ اس کے کور کمانڈر اس بات کے حق میں تھے کہ پہلے ملک میں سیاستدانوں کا بے رحمانہ احتساب کیا جائے اور اس کے بعد الیکشن کرائے جائیں۔

ابھی میں اس شاک سے سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ جہانگیر کرامت بھلا کیسے اس طرح کی بات کر سکتے تھے کہ شاہد حامد نے میرے سر پر ایک اور بم مارا کہ جہانگیر کرامت کو تو چھوڑیں، سپریم کورٹ کے چیف جسٹس سجاد علی شاہ بھی نئے انتخابات کے خلاف تھے۔ موصوف نے تو صدر لغاری کو ایک خط بھی لکھا تھا کہ "جناب صدر! کیا آپ نے ابھی تک یہ نہیں سوچا کہ سپریم کورٹ سے رابطہ کر کے نگران حکومت کا دورانیہ بڑھایا جائے۔"

شاہد حامد کی بات سے یہ پیغام واضح تھا کہ اس وقت کے آرمی چیف اور چیف جسٹس دونوں مل کر پاکستان میں سیاسی نظام کے خلاف سازشیں کر رہے تھے اور اس کام کے لیے انہوں نے فاروق لغاری کو استعمال کیا تھا۔ لیکن لغاری بھی ایک حد تک استعمال ہونے کے بعد ان دونوں کے ہاتھوں مزید استعمال ہونے کے لیے تیار نہیں تھے۔

لغاری کو یہ بھی بہانہ بنا کر دیا جا رہا تھا کہ ملک میں نئی مردم شماری کرانے کے بعد ہی انتخابات منعقد کیے جا سکتے ہیں۔ تاہم لغاری نے یہ تمام تجاویز مسترد کر دیں۔ فاروق لغاری اس بات سے خوفزدہ تھے کہ اگر انہوں نے نگران حکومت کے قیام کا دورانیہ بڑھا دیا تو سیاسی جماعتیں اس پر اپنا شدید ردعمل ظاہر کریں گی۔ لغاری اس بات سے بھی خوفزدہ تھے کہ اگر ملک میں انتخابات نہ ہوئے تو یہ بھی ممکن تھا کہ

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

کچھ عرصے بعد فوج آگے بڑھ کر اقتدار پر قبضہ کر لے۔ بہانہ یہ بنایا جائے گا کہ فاروق لغاری کی کمزور کابینہ کرپٹ سیاستدانوں کا احتساب کرنے میں ناکام رہی تھی۔

جہاں ایک طرف آرمی چیف اور چیف جسٹس ملک میں انتخابات ملتوی کرانا چاہ رہے تھے وہاں کابینہ کے چند وزیر اور صوبائی گورنر بھی لغاری پر مسلسل یہ زور ڈال رہے تھے کہ وہ انتخابات نہ کرائیں بلکہ پہلے احتساب کیا جائے۔ فوجی قیادت بہت زیادہ بے چین تھی اور وہ ہر صورت ملک میں انتخابات ملتوی کرانا چاہ رہی تھی۔ جب لغاری پر دباؤ بڑھ گیا تو ایک دن فاروق لغاری کو جی ایچ کیو بلایا گیا جہاں انہوں نے کور کمانڈروں کو پانچ گھنٹے تک اس بات پر دلائل دیئے کہ ملک میں وقت پر انتخابات ہونا کتنے ضروری تھے۔ سول اور ملٹری حکمرانوں کے درمیان ان اختلافات کی بنیاد پر نیشنل سکیورٹی کونسل کا آئیڈیا سامنے آیا۔ یوں فاروق لغاری اس ملک کے پہلے صدر تھے جنہوں نے فوج کے سیاست میں باقاعدہ رول کو تسلیم کیا۔

میں نے شاہد حامد سے پوچھ ہی لیا کہ اگر بینظیر بھٹو، آصف زرداری اور پارلیمنٹ کے وہ تمام ارکان جنہوں نے فاروق لغاری کو ووٹ دے کر صدر بنوایا تھا، وہ کرپٹ تھے تو پھر فاروق لغاری نے خود استعفیٰ کیوں نہیں دیدیا۔ اگر انہیں ووٹ دینے والے کرپٹ تھے تو پھر انہیں بھی اقتدار میں رہنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ کیا فاروق لغاری پر اخلاقی اور سیاسی طور پر یہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی تھی کہ وہ اپنے تمام کرپٹ ساتھیوں کے ساتھ گھر چلے جاتے۔ انہوں نے ایک عجیب روایت قائم کی کہ جنہوں نے ان کو صدر بنوایا تھا وہ تو کرپٹ تھے اور موصوف خود اپنے آپ کو بہت ایماندار سمجھتے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ شاہد حامد کے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔

شاہد حامد اپنے ماضی کی یادوں میں ڈوبے ہوئے بولتے رہے۔ بینظیر بھٹو حکومت ختم ہو چکی تھی۔ نئے نئے منصوبے بن رہے تھے کہ اچانک ایک دن پتہ چلا کہ فاروق لغاری اور جہانگیر کرامت میں اختلافات پیدا ہو چکے ہیں۔ بینظیر بھٹو نے اپنی برطرفی سپریم کورٹ میں چیلنج کر دی تھی۔ سپریم کورٹ کے متوقع فیصلے سے ایک دن پہلے بحث کرنے کے لیے ایک میٹنگ بلائی گئی تھی۔ اس میٹنگ میں فاروق لغاری اور جنرل جہانگیر کرامت بھی شریک تھے۔ اس میٹنگ کا ایک ہی بات موضوع تھا کہ سپریم کورٹ کیا فیصلہ دے گی۔ سب کی نظریں شاہد حامد کی طرف اٹھیں کیونکہ ان دنوں وہ اس کیس کو براہ راست ڈیل کر رہے تھے۔ شاہد حامد نے بڑے اعتماد کے ساتھ اس میٹنگ کے شرکاء کو بتایا کہ سپریم کورٹ چھ کے مقابلے میں ایک ووٹ سے بینظیر بھٹو حکومت کی برطرفی کے فیصلے کو برقرار رکھے گی۔ میٹنگ کے شرکاء میں سے اچانک کسی ایک نے ایک انتہائی تکلیف دہ سوال پوچھ لیا کہ اگر سپریم کورٹ نے بینظیر بھٹو حکومت کو بحال کر دیا تو کیا ہوگا۔ ابھی سوال پوچھنے والے کی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ فاروق لغاری نے بڑی اونچی آواز میں کہا کہ پھر وہ کل صبح ہی صدارت سے استعفیٰ دے دیں گے۔ فاروق لغاری کی اس بات نے اس میٹنگ میں بیٹھے ہوئے سب لوگوں کو سخت حیران کر دیا۔ ان میں سے کوئی بھی ان سے اس طرح کی بات کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ فاروق لغاری نے ان سب لوگوں کو ایک بہت بڑا واضح پیغام دے دیا تھا کہ وہ ان سب کو انتقام سے بھری بینظیر بھٹو کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود چوٹی زیریں جا کر ڈیرہ لگا لیں گے۔ اس میٹنگ کے شرکاء کو یہ احساس ہوا کہ فاروق لغاری ایک خود غرض انسان ہیں اور آنے والے دنوں میں ان کے دوستوں کے درمیان اسی ایک بات سے پیدا ہونے والے اختلافات شدید ہوتے گئے اور آخر ایک دن وہ ایوان صدر میں اتنے تنہا رہ گئے کہ نواز شریف کے ایک پیغام پر انہیں استعفیٰ دے کر گھر جانا پڑا۔

میں نے بات کا رخ دوسری طرف موڑا اور شاہد حامد سے پوچھا کہ اس بات میں کتنی صداقت ہے کہ فاروق لغاری نے بینظیر بھٹو کی پارٹی کو ہرانے کے لیے انتخابات میں دھاندلی کرائی تھی۔

شاہد حامد نے مجھے ایک عجیب سی بات بتائی۔

انتخابات کے نتائج نے ایوان صدر کے مکینوں کو بھی حیران کر دیا تھا کیونکہ وہ بھی یہ توقع نہیں کر رہے تھے کہ نواز شریف دو تہائی اکثریت لے کر الیکشن جیت جائیں گے۔ اس حیرانی کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ الیکشن سے کچھ دن پہلے آئی ایس آئی نے اپنی ایک رپورٹ ایوان صدر بھیجی تھی جس میں 2 فروری 1997ء کو ہونے والے انتخابات کے بارے میں سیاسی جماعتوں کے امیدواروں کے ہارنے اور جیتنے پر پیشن گوئیاں کی گئی تھیں۔ آئی ایس آئی کے بقول نواز شریف کی پارٹی کو نوے اور سو کے درمیان جبکہ بینظیر بھٹو کو پچاس اور ساٹھ کے درمیان سیٹیں ملنے کی توقع تھی۔ تاہم، جب رزلٹ آنا شروع ہوئے تو ایوان صدر کے مکین آہستہ آہستہ حیران اور پھر پریشان ہونا شروع ہو گئے کیونکہ وہ تو یہ توقع کر کے بیٹھے تھے کہ آئی ایس آئی نے جو کہہ دیا تھا وہ فائنل تھا۔ ایک بات واضح تھی کہ پیپلز پارٹی کے مایوس کارکن

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

ووٹ ڈالنے کے لیے اپنے گھروں سے نہیں نکلے تھے۔

میں نے بات آگے بڑھانے کی غرض سے شاہد حامد سے پوچھا کہ جب نواز شریف وزیراعظم بن گئے تو پھر لغاری اور ان کے درمیان تعلقات کی نوعیت کیا تھی۔ شاہد حامد بولے کہ شروع میں دونوں کے درمیان تعلقات بہت اچھے تھے۔ ایک پرائیویٹ ڈنر کا اہتمام کیا گیا جس میں فاروق لغاری، پرائم منسٹر نواز شریف اور شاہد حامد شریک ہوئے۔ صدر لغاری نے نواز شریف کو اکانومی پر بریفنگ دی۔ شاہد جاوید برکی نے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے ساتھ طے پانے والے معاہدوں کی تفصیلات بتائیں۔ نواز شریف چاہتے تھے کہ شاہد جاوید برکی ملک کے وزیر خزانہ کے طور پر کام کرتے رہیں لیکن ورلڈ بینک کے اس ملازم نے انکار کر دیا۔ اسی ڈنر پر شاہد حامد نے نواز کو دفاع اور قانونی معاملات پر بریفنگ دی۔ نواز نے شاہد حامد کو بھی اپنی کابینہ میں وفاقی وزیر بنانے کی پیشکش کی۔ تاہم، فاروق لغاری چاہتے تھے کہ وہ پنجاب کے گورنر بن جائیں۔ جب کہ شاہد حامد کی یہ خواہش تھی کہ وہ فیڈرل منسٹر بن جائیں تاکہ وہ نواز اور لغاری کے درمیان ایک پل کا رول ادا کر سکیں۔ شاہد حامد نے محسوس کیا کہ فاروق لغاری کی شخصیت میں ایک بہت بڑی کمزوری تھی جس کا نام ڈیرہ غازی خان کی مقامی سیاست تھا۔ ایوان صدر میں بیٹھ کر بھی وہ اپنے حلقے کی چھوٹی موٹی سیاست میں ملوث رہتے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ ڈیرہ غازی خان ان کی انگلیوں پر ناچتا رہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب نواز شریف وزیراعظم بنے تو لغاری نے ذاتی طور پر پنجاب کے وزیراعلیٰ شہباز شریف سے یہ درخواست کی تھی کہ ڈیرہ غازی خان ان کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے کی اجازت دی جائے۔ جب ایک دن فاروق لغاری کی مقامی سیاست کے حوالے سے چھوٹی موٹی باتوں پر شاہد حامد تھوڑا سا جھنجھلاہٹ کا شکار ہوئے تو صدر صاحب نے انہیں ایک طعنہ مارا:

”شاہد حامد صاحب! آپ چونکہ اقتدار میں کسی سیاسی جدوجہد یا عمل کے ذریعے نہیں آئے لہٰذا آپ کو اس بات کا احساس نہیں ہے کہ جب تک مقامی سیاست میں اس طرح کی چھوٹی موٹی چیزیں نہ کی جائیں، انتخابات نہیں جیتے جا سکتے۔“

شاہد حامد اپنے پرانے دوست کے احترام میں خاموش تھے لیکن میں سمجھ رہا تھا کہ وہ یہ بات کہنا چاہ رہے تھے کہ کس طرح ایوان صدر میں بیٹھ کر بینظیر بھٹو حکومت کو کرپشن اور بیڈ گورننس کے الزامات پر برطرف کرنے والے موصوف کس طریقے سے اپنے مخالفین کو تھانہ کچہری اور پٹواریوں کے ذریعے تنگ کر

کے دوست پچ کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ تاہم لگتا ہے کہ مخالفین کو ذلیل کرنے کے باوجود بھی فاروق لغاری اپنی گرتی ہوئی مقبولیت کو اپنے حلقے میں نہیں سنبھال سکے اور 2008ء کے الیکشن میں وہ شخص جو 1988ء میں پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر ایک لاکھ سے زائد ووٹوں کی لیڈ سے جیتا تھا، وہ بمشکل تین دفعہ اپنے حلقے میں ووٹ دوبارہ گنوا کر ایم این اے بن سکا۔

شاہد حامد نے مجھے بتایا کہ جب نواز شریف وزیراعظم بنے تو فاروق لغاری خود چاہتے تھے کہ صدر کے اسمبلی توڑنے کے اختیارات کو ختم ہونا چاہیے۔ شاید لغاری یہ بات سمجھ چکے تھے کہ ایک صدر صرف ایک دفعہ اسمبلی توڑ سکتا ہے۔ اگر وہ دوبارہ یہ کوشش کرے گا تو اس کا حشر بھی وہی کچھ ہوگا جو غلام اسحاق خان کا ہوا تھا۔ جب 6 اگست 1990ء کو غلام اسحاق خان نے بینظیر بھٹو کی حکومت توڑی تھی تو فوج، عوام، میڈیا اور سیاستدانوں نے زیادہ ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا کہ شاید بینظیر بھٹو کا زیادہ قصور تھا۔ تاہم، جب تین سال بعد مارچ، اپریل 1993ء میں غلام اسحاق خان نے وہی کام نواز شریف کے ساتھ کیا تو پھر سب نے یہی سمجھا کہ صدر کے ساتھ ہی کچھ مسئلہ ہے جو سیاسی حکومتوں کو نہیں چلنے دے رہا۔ جب تک اس کی چھٹی نہیں ہوگی ملک کا نظام آگے نہیں چلے گا اور یوں غلام اسحاق خان کو سول ملٹری بیوروکریسی کی تمام تر حمایت کے باوجود استعفیٰ دے کر گھر جانا پڑ گیا تھا۔ یہی بات شاید فاروق لغاری کے ذہن میں بھی تھی کہ وہ اپنا اختیار ایک دفعہ استعمال کر چکے تھے۔ اب کی دفعہ ان کے ساتھ کوئی کھڑا نہیں ہوگا۔

جب فاروق لغاری نے اپنی اس خواہش کا اظہار جنرل جہانگیر کرامت کے سامنے کیا تو صدر صاحب بڑے حیران ہوئے جب آرمی چیف نے یہ فرمایا کہ جناب آپ کو یہ 58-2b ختم کرنے کی اتنی جلدی کیوں ہے۔ صدر لغاری کے لیے یہ پیغام بڑا واضح تھا کہ جناب آپ کے لیے استعمال کرنے کا وقت ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ آرمی چیف شاید بینظیر کی طرح نواز شریف کی چھٹی بھی صدر لغاری کے ذریعے کرانا چاہ رہے تھے۔

نواز شریف صدر لغاری کے اس اختیار کو بڑے احسن طریقے سے ختم کرانے کے موڈ میں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے چوٹی زیریں جا کر صدر لغاری کو ان کی اسمبلیاں توڑنے کے اختیارات ختم کرنے کے مسئلے پر اعتماد میں لینے کا فیصلہ کیا۔ جب میٹنگ شروع ہوئی اور نواز شریف نے یہ بات لغاری

www.freepdfpost.blogspot.com

!!!allurdupdfnovels!!!blogspot!!!com!!

کی گئی تھی کہ وہ پارلیمنٹ کے ذریعے صدر صاحب کے اسمبلیاں توڑنے کے اختیارات کو ختم کرنا چاہ رہے ہیں تو لغاری صاحب نے فوراً کہا کہ بالکل ٹھیک ہے۔ نواز شریف نے اسلام آباد واپس آ کر پارلیمنٹ کے اجلاس سے اس کلاز کو ختم کرا کے لغاری صاحب کے ہاتھ سے آرمی چیف اور دیگر اہم تعیناتیاں کرنے کی پاور اپنے ہاتھ میں لے لیں تو یکدم سب لوگوں کو محسوس ہوا کہ لغاری صاحب اور نواز شریف میں تعلقات کافی بگڑ چکے ہیں۔

اس سے پہلے جب نواز شریف چوٹی زیریں جا رہے تھے تو گورنر شاہد حامد بھی ان کے ساتھ تھے۔ راستے میں نواز شریف نے شاہد حامد کو بتایا کہ آپ لغاری صاحب کو یہ بات بتائیں کہ ہم ان کی قابلیت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ دوسری دفعہ بھی ملک کے صدر بنیں۔ تاہم، لغاری صاحب کے ساتھ ہونے والی میٹنگ سے پہلے شاہد حامد نے نواز شریف کو بتایا کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آرمی چیف کون مقرر کر رہا ہے صدر یا وزیراعظم کیونکہ جونہی ایک جنرل آرمی چیف بنتا ہے تو وہ فوری طور پر چیف آف آرمی سٹاف بن جاتا ہے۔ اس کی ہمدردیاں پھر اپنے ادارے کے ساتھ ہوتی ہیں نہ کہ صدر یا وزیراعظم کے ساتھ!

شاہد حامد نے اس بات کا اعتراف کیا کہ 58-2b کے ختم ہونے سے صدر اور وزیراعظم کے اب تک اچھے تعلقات میں یقیناً فرق پڑا۔ شاہد حامد کو اس بات پر قطعاً کوئی شبہ نہیں تھا کہ نواز شریف اور لغاری کے درمیان اس کلاز کا خاتمہ بالآخر آنے والے دنوں میں دونوں کے درمیان شدید اختلافات اور صدر لغاری کے استعفیٰ پر ہوا۔

شاہد حامد نے اس بات کو بھی تسلیم کیا کہ الیکشن ہونے سے پہلے فاروق لغاری نے نواز شریف کو بہت بڑی فیور کی تھی، یعنی جب امیدواروں کی قابلیت کے مسئلے پر چند چیزیں جو نواز شریف کو الیکشن لڑنے سے روک سکتی تھیں، انہیں ختم کر دیا گیا۔ نواز شریف اور خالد انور نے شاہد حامد سے یہ بات کی تھی کہ فاروق لغاری کو کہیں کہ وہ کسی امیدوار کی الیکشن لڑنے کی شرائط میں سے یہ بات نکال دیں کہ وہ تمام لوگ انتخابات لڑنے کے اہل نہیں تھے جو کسی ایسی مل یا کمپنی کے مالک تھے جو کسی بینک کی مقروض ہو۔ نواز شریف یہ چاہتے تھے کہ اس قانون میں سے کنٹرول اور مل مالک کے الفاظ نکال دیے جائیں۔ جب یہ بات نگران کابینہ کے سامنے رکھی گئی تو تمام وزیر دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ کچھ وزیروں کا خیال

تھا کہ نواز شریف بڑے لیڈر تھے لہٰذا ان کی یہ بات مان لینی چاہیے تا کہ وہ الیکشن لڑ سکیں جبکہ باقی وزیر اس بات کے خلاف تھے کیونکہ ان کے خیال میں اگر صرف نواز شریف کے لیے اس قانون میں تبدیلی کی گئی تو فاروق لغاری اور ان کی نگران کابینہ کی ساکھ برے طریقے سے خراب ہو گی۔

شاہد حامد نے بتایا کہ ان کا خیال تھا کہ شاید نواز شریف خود اس کلاز سے برے طریقے سے متاثر ہوں گے۔ نواز شریف کا جواب سن کر شاہد حامد حیران رہ گئے۔ نواز نے انہیں بتایا کہ دراصل اس کلاز سے انہیں ذاتی طور پر تو کوئی نقصان نہیں ہے، لیکن اگر اسے نہ ہٹایا گیا تو چوہدری شجاعت حسین الیکشن نہیں لڑ سکیں گے۔

صدر لغاری نواز شریف کی اس درخواست پر غور کرنے کے لیے تیار ہو گئے اور "اصولوں کی بنیاد" پر ان تمام لوگوں کو الیکشن لڑنے کی اجازت دے دی گئی جو ان کمپنیوں یا ملوں کے مالک تھے جن کے ذمے بینکوں کے کروڑوں یا ارب روپے کے قرضے واجب الادا تھے۔

الیکشن ہو گئے تھے۔ نواز شریف وزیراعظم بن چکے تھے۔ 58-2b کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ لوگوں نے سکھ کا سانس لیا تھا کہ شاید اب سیاسی انتشار ختم ہو چکا ہے۔ تاہم، کسی کو یہ علم نہیں تھا کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرانے والی ہے۔ صدر لغاری کے نواز شریف سے بھی عدلیہ کے مسئلے پر اسی طریقے کے اختلافات شروع ہونے والے تھے جیسے کہ بینظیر بھٹو سے ہوئے تھے جو پیپلز پارٹی حکومت کی برطرفی پر جا کر ختم ہوئے۔ دھیرے دھیرے فاروق لغاری کو یہ احساس ہونا شروع ہو گیا کہ نواز شریف بھی سارے اختیارات اپنے ہاتھوں میں لینا چاہ رہے تھے۔ وہ اختلافات جو دراصل وزیراعظم نواز شریف اور چیف جسٹس سجاد علی شاہ کے درمیان شروع ہوئے تھے اس کی لپیٹ میں فاروق لغاری بھی آ گئے حالانکہ شروع میں فاروق لغاری کا ان دونوں کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ نواز شریف اور سجاد علی شاہ کے درمیان اختلافات اس وقت شروع ہوئے جب وزیراعظم نے ملک بھر میں انٹی ٹیررسٹ کورٹس بنا کر عدلیہ کے سامنے ایک نیا ادارہ کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ سجاد علی شاہ نے نواز شریف کو بتایا کہ وہ نئی عدالتیں نہ بنائیں کیونکہ موجودہ قوانین کے تحت بھی دہشت گردوں کو سزا دی جا سکتی ہے۔ ابھی اس مسئلے کی گرد نہیں بیٹھی تھی جب سپریم کورٹ میں ججوں کی تعداد پر ایک نیا تنازعہ کھڑا ہو گیا۔ نواز شریف لاہور ہائی کورٹ کے پانچ ججوں کو سپریم کورٹ کا جج مقرر کرنے کے خلاف

www.freepdfpost.blogspot.com

!!!allurdupdfnovels!!!blogspot!!!com!!!

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

[illegible]

شاہد حامد نے فاروق لغاری کے سامنے یہ بات رکھی کہ جب سپریم کورٹ یہ سوچ رہی تھی کہ چیف جسٹس سجاد علی شاہ کو ہٹا دیا جائے اس وقت ساری عدلیہ ان کے پیچھے متحد کھڑی تھی اور سارے جج یہ چاہتے تھے کہ عدالت کے فیصلے پر عملدرآمد کیا جائے۔ اب حالات بدل چکے ہیں کیونکہ عدلیہ تقسیم ہو چکی ہے اور اہم بات یہ ہے کہ عدلیہ میں سے اس کے جج پہلے ہی چیف جسٹس کے خلاف بغاوت کر چکے ہیں۔

نواز شریف اور شاہد حامد کو اس وقت بڑا شدید جھٹکا لگا جب یہ بات سن کر فاروق لغاری نے ان کے منہ پر کہا کہ ہاں مجھے علم ہے کہ نواز شریف ججوں پر کام کرتے رہے تھے۔ اسی وجہ سے آج انہوں نے اپنے چیف جسٹس کے خلاف بغاوت کر دی ہے۔

میں نے شاہد حامد کو ٹوکا اور ان سے پوچھا کہ ان باتوں میں کتنی صداقت تھی کہ نواز شریف نے ججوں کو پیسے دے کر خرید لیا تھا۔

شاہد حامد اچانک سنجیدہ ہو گئے اور انہوں نے کہا کہ ان کے خیال میں نواز شریف نے کسی جج کو کوئی پیسے نہیں دیے تھے۔ وہ ان تمام ججوں کو ذاتی طور پر جانتے تھے اور انہیں اس بات کا بھی علم تھا کہ انہوں نے سجاد علی شاہ کے خلاف بغاوت کیوں کی تھی۔ سارا کام کوئٹہ سے شروع ہوا تھا جہاں تین جج کام

[illegible]

یہ بات مجھے ابھی سمجھ نہیں آ رہی تھی اور میں نے شاہد حامد سے پوچھا کہ یہ بات فاروق لغاری کی سمجھ میں کیوں نہیں آ رہی تھی اور انہوں نے نواز شریف کے کہنے پر سجاد علی شاہ کو ہٹا کر سپریم کورٹ کے سب سے سینئر جج کو چیف جسٹس کیوں نہیں بنا دیا۔

شاہد حامد نے میرے سوال کے جواب میں ایک اور کہانی سنائی۔ ان کے بقول فاروق لغاری کے دل میں نواز شریف کے خلاف اب نفرت بھر چکی تھی۔ وہ نواز شریف کے ساتھ مزید کام کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ فاروق لغاری اب یہ سوچ رہے تھے کہ نواز شریف کی باتیں ماننے کے بجائے بہتر ہے کہ وہ استعفیٰ دے کر گھر چلے جائیں۔ تاہم جب فاروق لغاری کے بچوں کو اور ان کے دوستوں کو یہ علم ہوا کہ وہ استعفیٰ دینے والے ہیں تو سب نے بڑی سختی سے اس کی مخالفت کی۔

سپریم کورٹ کے ججوں کا یہ خیال تھا کہ شاہد حامد فاروق لغاری کے بہت زیادہ قریب تھے لہٰذا وہ ان سے مسلسل رابطے میں رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہیں اچھی طرح اندازہ تھا کہ سپریم کورٹ کے جج کیا چاہتے تھے۔ ان تمام ججوں نے شاہد حامد پر ایک بات واضح کر دی تھی کہ وہ چیف جسٹس سجاد علی شاہ کے انڈر کام نہیں کریں گے۔ یوں جب فاروق لغاری نے نواز شریف کے مطالبے پر ان سے رائے مانگی تو شاہد حامد نے انہیں یہی مشورہ دیا کہ وہ سجاد علی شاہ کی چھٹی کرا دیں۔

جنرل جہانگیر کرامت بھی چپ کر کے بیٹھنے والے نہیں تھے۔ وہ بھی صدر اور وزیراعظم کے

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

درمیان بڑھتے ہوئے اختلافات کی کہانیوں سے باخبر تھے۔ ایک دن جنرل جہانگیر کرامت نے شاہد حامد کو فون کیا اور ان سے ان دس ججوں کے بارے میں قانونی رائے مانگی جنھوں نے سجاد علی شاہ کے خلاف بغاوت کی تھی۔ شاہد حامد نے جہانگیر کرامت کو وضاحت کے ساتھ سمجھایا کہ دس ججوں کی بغاوت کے بعد سجاد علی شاہ کو اب گھر جانا ہوگا۔ شاہد حامد کی بات سن کر جہانگیر کرامت نے کہا کہ جی ایچ کیو کی لیگل برانچ نے بھی انہیں یہی رائے دی ہے کہ سجاد علی شاہ کو اب جانا پڑے گا۔

فاروق لغاری اور نواز شریف کے درمیان اختلافات بہت آگے بڑھ چکے تھے۔ نواز شریف کا خیال تھا کہ چیف جسٹس سجاد علی شاہ ان کی جس انداز میں توہین کر رہے ہیں اس کے پیچھے فاروق لغاری کا ہاتھ ہے جبکہ فاروق لغاری کا یہ خیال تھا کہ نواز شریف اور جنیفر بھٹو کے درمیان کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ وہ دونوں عدلیہ کو اپنی مرضی کے مطابق چلانا چاہتے ہیں۔

نواز شریف نے آخر ایک دن یہ فیصلہ کر لیا کہ اب وہ فاروق لغاری کے خلاف پارلیمنٹ میں قرارداد لا کر ان کی صدارت سے چھٹی کرائیں گے۔ جب شاہد حامد کو اس بات کا پتہ چلا تو وہ بھاگے بھاگے چوہدری نثار اور شہباز شریف کے پاس گئے اور انہیں کہا کہ وہ لغاری کے ساتھ یہ سلوک نہ کریں۔ تاہم شاہد حامد یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ ان سے زیادہ جنرل جہانگیر کرامت کی بات سنی گئی جنھوں نے فاروق لغاری کو پارلیمنٹ کے ہاتھوں ذلیل ہو کر گھر جانے سے بچا لیا اور بات لغاری کے استعفی پر ختم ہوگئی۔

فاروق لغاری کو اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ نواز شریف نے ججوں پر کام کیا تھا لیکن شاہد حامد کو یہ بات سمجھ نہیں آتی تھی کہ بھلا ایک ہی وقت میں ایک شخص دس ججوں پر کیسے کام کر سکتا تھا۔ ان کے خیال میں لوگ یہ بات کیوں بھول جاتے تھے کہ باقاعدہ ایک فل کورٹ منعقد ہوئی تھی اور سب سے سینئر جج نے اس کی صدارت کی اور متفقہ فیصلے کے تحت سجاد علی شاہ کو ہٹایا گیا تھا۔

جب جہانگیر کرامت کو اس بات کا پتہ چلا کہ فاروق لغاری استعفی دینے والے ہیں تو انہوں نے انہیں اس بات سے منع کیا۔ فاروق لغاری نے نواز شریف کو پیغام بھجوایا کہ وہ وسیم سجاد کو اس ملک کا قائم مقام صدر بنا دیں جن کا ضمیر چیف جسٹس سجاد علی شاہ کو ہٹانے کی سمری پر دستخط کرتے وقت ڈسٹرب نہیں کرے گا۔

فاروق لغاری کے ایوان صدر میں آخری دنوں کو یاد کرتے ہوئے شاہد حامد بولے کہ استعفی سے کچھ دن قبل فاروق لغاری نے ان سے قانونی معاملات پر مشاورت بند کر دی تھی۔ اب اس کام کا فریضہ ان کے نئے دوست خواجہ طارق رحیم اور شہزادہ جہانگیر ادا کر رہے تھے۔

شاہد حامد نے گہری سانس لی اور کہا کہ اگرچہ چیف جسٹس کو ہٹانے کے معاملے پر وہ اپنے دوست فاروق لغاری کے ہم خیال نہیں تھے لیکن ان کے خیال میں لغاری کو استعفی نہیں دینا چاہیے تھا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک اور سوال آیا اور میں نے تنہائی کے ماحول میں بڑھتی ہوئی خنکی کے درمیان شاہد حامد سے پوچھ لیا کہ جب ان کے دوست فاروق لغاری استعفی دے رہے تھے تو کیا یہ ان کی بھی اخلاقی ذمہ داری نہیں بنتی تھی کہ جو شخص انہیں اتنا اوپر لے آیا تھا، جب وہ کسی صحیح یا غلط وجہ سے استعفی دے رہا تھا تو انہیں بھی اپنے دوست کا ساتھ دینا چاہیے تھا۔ لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ہوا کا رخ بدلتے دیکھ کر شاہد حامد نے بھی فاروق لغاری کی ڈوبتی ہوئی کشتی میں بیٹھنے کی بجائے نواز شریف کے جہاز میں بیٹھنے کا فیصلہ کیا تھا۔

میرا چبھتا ہوا اور تلخ سوال سن کر شاہد حامد نے انکشاف کیا کہ جس دن فاروق لغاری نے صدارت سے استعفی دیا تھا اس دن دوسرے صوبائی گورنروں کی طرح انہیں بھی لاہور سے بلایا گیا۔ نواز شریف نے بڑی تفصیل سے ان سب لوگوں کو وہ حالات و واقعات بتائے جن کی وجہ سے فاروق لغاری کو آج استعفی دینا پڑ گیا تھا۔ نواز شریف سے ملنے سے پہلے شاہد حامد ایئر پورٹ سے اترنے کے بعد سیدھے آرمی چیف جہانگیر کرامت سے ملنے گئے جہاں انہوں نے بیٹھ کر اس نئی صورتحال پر سیر حاصل گفتگو کی۔ اس کے بعد وہ سیدھے نواز شریف سے ملنے چلے گئے۔ جب گورنرز سے نواز شریف کی میٹنگ ختم ہوئی تو شاہد حامد نے چپکے سے اپنی جیب سے استعفی نکالا اور نواز شریف کے حوالے کر دیا۔ تاہم نواز شریف نے شاہد حامد کو کہا کہ وہ گورنر پنجاب کے طور پر کام کرتے رہیں۔ نواز نے شاہد حامد کو بتایا کہ وہ انہیں گورنر پنجاب کی پوزیشن سے اس لیے بھی نہیں ہٹائیں گے تاکہ کہیں یہ تاثر نہ پیدا ہو کہ وہ فاروق لغاری کے آدمی تھے لہٰذا ان کی بھی چھٹی کرا دی گئی۔

جب نواز شریف نے شاہد حامد کا استعفی مسترد کیا تو انہوں نے وزیراعظم کو فاروق لغاری سے اپنے ہونے والی میٹنگ کے بارے میں بتایا جو انہیں ابھی جا کر کرنی تھی۔ یہ سن کر نواز شریف نے شاہد

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

حامد کیانی کو وہ سابق صدر کو جا کر ان کا پیغام دیں اور ان سے پوچھیں کہ ان کے مستقبل کے بعد وہاں کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔ شاہد حامد مسکرائے کیونکہ انہیں بلوچ سردار کی ایک ذاتی کمزوری کا پتہ تھا۔ پتہ چلا نواز شریف سے پوچھا کہ کیا وہ فاروق لغاری کو اس بات کی ضمانت دے سکتے ہیں کہ وہ لغاری خان کی مقامی سیاست کے کلا رہیں گے اور وہ جیسے چاہیں گے لغاری خان کی انتخابی مہم ان کے اشاروں پر چلے گی۔

نواز شریف مسکرائے اور شاہد حامد کو کہا ٹھیک ہے آپ انہیں یہ گارنٹی دے دیں۔

شاہد حامد اگلے دن فاروق لغاری سے ملے اور انہیں یقین دہانی کرائی کہ وہ اپنے علاقے میں پہلے کی طرح ایک کلا ہو کر مقامی سیاست پر اپنا قبضہ جاری رکھ سکتے ہیں۔ شاہد حامد نے فاروق لغاری کو یہ بھی آفر کی کہ وہ مستعفی ہونے کو تیار ہیں تاہم فاروق لغاری نے انہیں منع کر دیا۔

میرے ذہن میں چوہدری شجاعت کی وہ بات موجود تھی کہ نواز شریف نے ایک بڑی ہائی لیول میٹنگ میں بیٹھ کر ایک یہ فیصلہ کرایا تھا جس کے بعد پنجاب کے صوبوں میں خصوصاً ماورائے عدالت قتل شروع ہو گئے تھے۔ شہباز شریف وزیر اعلیٰ اور شاہد حامد ان دنوں گورنر تھے۔ میں نے شاہد حامد سے پوچھا کہ ان دنوں پولیس کے ہاتھوں ماورائے عدالت ہلاکتیں کیوں شروع ہوئی تھیں۔ میرا سوال سن کر شاہد حامد سنجیدہ ہوئے اور انہوں نے شہباز شریف کی پالیسی کا دفاع کرنا شروع کیا۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے انہوں نے مجھے بتایا کہ دنیا کے تمام مہذب ملکوں میں دہشت گردی کا جن ختم کرنے کے لیے اس طرح کے اقدامات کیے جاتے رہے ہیں۔ مثلاً 1962ء میں فرانس میں ایک تنظیم "Raid" بنائی گئی تھی جس کا کام اس طرح کے دہشت گردوں کو ختم کرنا تھا۔ یہی کام کینیڈا میں کیا گیا۔ برطانیہ نے بھی آئرش ری پبلک آرمی کی تحریک کے ساتھ اسی طرح کے اقدامات کیے۔ 9/11 کے بعد اب امریکی حکومت بھی دہشت گردوں کو ختم کرنے کے لیے یہی کچھ کر رہی تھی۔ شاہد حامد کے بقول بھی کبھار کسی ریاست کو اپنی بقا کے نام پر قانون سے ماورا ایسے اقدامات کرنے پڑتے ہیں۔

نتھیا گلی کی سرد خوبصورت پہاڑیوں پر اب شام ڈھل رہی تھی۔ مجھے پتہ تھا کہ وقت تھوڑا رہ گیا ہے اس لیے میں نے بڑی بے چینی سے شاہد حامد سے پوچھا کہ انہوں نے نواز اور شہباز شریف کو اپنے دوست فاروق لغاری سے زیادہ اہمیت دی تھی لیکن پھر بھی ان دونوں بھائیوں نے کچھ عرصے

صرف انہیں پنجاب کی گورنرشپ سے ہٹا دیا تھا۔

شاہد حامد نے گہرا سانس لیا اور اشارتاً کہا کہ شاید اب ان دونوں شریف بھائیوں کی نگاہ میں ان کی اہمیت ختم ہو گئی تھی۔ انہوں نے ان سے جو کام لینا تھا وہ لے چکے تھے۔ ایک دن نواز شریف کے پرنسپل سیکرٹری سعید مہدی کا انہیں فون آیا۔ انہوں نے فون بند کیا، اپنا سامان اٹھایا اور صدر رفیق تارڑ کو استعفیٰ پیش کر کے گورنر ہاؤس سے نکل گئے۔

میں نے بھی نہیں پوچھا۔ شاہد حامد نے بھی نہیں بتایا کہ سعید مہدی نے انہیں فون پر کیا کہا تھا۔ نواز شریف سے اتنا بھی نہیں ہو سکا کہ وہ خود فون کرتے اور شاہد حامد کو یہ خبر سناتے کہ اب ان کا رول ختم ہو چکا ہے لہٰذا وہ گھر جائیں۔

شاہد حامد کی آواز میں افسردگی محسوس کر کے میں نے بات تبدیل کرنے کی کوشش کی اور ان سے پوچھا کہ کیا 12 اکتوبر 1999ء کی بغاوت کے بعد ان کی نواز شریف سے کبھی ملاقات ہوئی۔ شاہد حامد نے اپنا سر ہلایا اور کہا کہ ہاں ایک دن سپریم کورٹ کے دفتر میں نواز شریف سے سامنا ہو گیا تھا۔ انہیں سپریم کورٹ میں جنرل مشرف کے طیارہ سازش کیس کے سلسلے میں لایا گیا تھا۔ نواز شریف کو اس بری حالت میں دیکھ کر شاہد حامد کو بڑا صدمہ ہوا اور ان کے بقول یہ ان کی زندگی کے چند افسردہ لمحات میں سے ایک تھا۔ اس کے بعد ایک دفعہ نواز سے ان کی ملاقات جدہ میں ہوئی۔

میں نے پھر بات بدلنے کی کوشش کی اور شاہد حامد سے پوچھا کہ فاروق لغاری کی سیاست آج سے پانچ سال بعد 2008ء میں کیسی ہوگی۔

شاہد حامد نے پھر اپنی بات دہرائی کہ فاروق لغاری کو مستعفی نہیں ہونا چاہیے تھا کیونکہ ان کے جانے کی وجہ سے پورا سسٹم غیر متوازن ہوا۔ شاہد حامد اس بات پر بھی خوش نہیں تھے کہ فاروق لغاری کو ملک کا صدر رہنے کے بعد ایم پی اے یا ایم این اے کا الیکشن لڑنا چاہیے تھا۔ اتنے سال گزرنے کے بعد شاہد حامد اس بات سے بھی ناخوش تھے کہ انہوں نے بینظیر بھٹو حکومت کے بعد جو نگران کابینہ بنائی تھی اس میں لیے گئے وزیروں کا انتخاب بھی درست نہیں تھا۔ جن لوگوں کو وزیر بنایا گیا تھا وہ لوگوں کی توقعات پر پورا نہیں اترے۔ شاہد حامد کہہ رہے تھے کہ اتنے سال پولیٹکس میں گزارنے کے بعد اب اگر انہیں موقع دیا جائے کہ وہ نئی کابینہ بنائیں تو 1996ء کے برعکس وہ زیادہ بہتر لوگوں کی فہرست تیار کر

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

بھی گے۔

شاہد حامد ابھی ماضی میں کھوئے ہوئے تھے اور مجھے بتا رہے تھے کہ وہ فاروق لغاری کے لیے اور کیا کر سکتے ہیں۔

میں نے ان سے پھر پوچھا کہ کیا کبھی فاروق لغاری نے ان سے کوئی گلہ کیا تھا کہ وہ دوست ان کے تھے لیکن ضرورت پڑنے پر انہوں نے ساتھ نواز شریف کا دیا تھا۔

وہ بولے کہ نہیں، فاروق لغاری نے اس طرح کی شکایت کبھی نہیں کی۔

آخر شام گزر گئی اور آدھی رات بھی بیت گئی۔ میرے تمام سوالات ختم ہو گئے تھے۔ میں نے جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن ایک آخری سوال ابھی رہ گیا تھا جو میں جانے سے پہلے شاہد حامد سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اگر وہ دوبارہ ملے تو ... سے آج تک ان کو کوئی فرق پڑا ہے۔ میں نے شاہد حامد سے پوچھا کہ کیا میں یہ سمجھوں کہ شاہد حامد نے محض اپنے سیاسی مفادات کے لیے اپنے چالیس سال پرانے دوست فاروق لغاری کو چھوڑ کر جب موقع آیا تو نواز شریف کا ساتھ دیا تھا۔

میرے اس سوال پر شاہد حامد کو ایک لمحے کے لیے ... ہم انہیں سے ... لیکن پھر سنبھل کر بولے کہ جب نواز شریف کے قریب ہونے کا انہیں علم ہوا کہ وہ فاروق لغاری کو پارلیمنٹ کے ذریعے صدارت سے ہٹانا چاہتے ہیں تو میں نے نواز شریف کے اس منصوبے کی شدید مخالفت کی تھی۔ جب میں نے دیکھا کہ نواز شریف پھر بھی یہ کام کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو میں جا کر فاروق لغاری سے ملا اور انہیں بتایا کہ اس مشکل وقت میں میں ان کے ساتھ ہوں۔ اگر نواز شریف فاروق لغاری کے خلاف پارلیمنٹ میں قرارداد لے کر آتے تو وہ فوری طور پر گورنر پنجاب کے عہدے سے استعفیٰ دے کر اپنے دوست لغاری کے وکیل بن کر ان کا کیس لڑتے۔

میں نے اپنے دوست کو کوئی دھوکہ نہیں دیا تھا۔

اسحاق ڈار

اس ملاقات کے تقریباً چار سال بعد اسحاق ڈار نے مجھے بتایا کہ میں بڑا حیران اور پریشان بیٹھا ... کے شریکِ کار کو ایک ایک کر کے مجھے بتاتے ہوئے چھوڑ کر جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ شاید میں اب ان کے لیے ایک معمولی وزیر تھا جبکہ جنرل مشرف کا قریبی بننے والا اقتدار ہے جس کی ایک ... ملے۔

اسحاق ڈار بھی ان چند گنے چنے سیاستدانوں میں سے ایک تھے جو اٹک قلعہ میں جنرل مشرف کے آرڈر پر قید میں رکھے گئے۔

ان دنوں اسحاق ڈار کے بیٹے کی منگنی نواز شریف کی بیٹی سے تازہ تازہ طے پائی تھی۔ میں نے باتوں باتوں میں محسوس کیا کہ اسحاق ڈار کے پاس جو اس ملک کے کئی اہم عہدوں پر فائز رہے تھے بہت سارے راز ہیں اور مجھے خوشی اس بات پر ہوئی کہ وہ ان رازوں پر سے پردہ اٹھانے کے لیے بھی تیار تھے۔ باقی تو چھوڑیں، وہ یہ بات بتانے کے لیے بھی پہلی دفعہ تیار ہوئے کہ نواز شریف اور جنرل مشرف کے درمیان پاکستانی جیل چھوڑ کر جدہ کے سرور پیلس میں رہنے والی ڈیل کی اصل کہانی کیا تھی؟

ان رازوں سے ہم بعد میں پردہ اٹھائیں گے۔ پہلے آپ کی ملاقات اس اسحاق ڈار سے کراتے ہیں جب وہ ابھی سیاست میں نہیں آئے تھے۔ اسحاق ڈار کے ایک عام چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ سے پاکستان کے سب سے طاقتور وزیر خزانہ اور ابوظہبی کے حکمران شیخ النہیان کے ایڈوائزر بننے تک کی کہانی بھی ایک

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

ایک عجیب داستان ہے جس سے آپ ڈار کے اندر چھپی خصوصیات کا با آسانی اندازہ کر سکتے ہیں۔

بہت کم لوگ یہ بات جانتے ہوں گے کہ اسحاق ڈار اور نواز شریف جو دونوں کشمیری ہیں، گورنمنٹ کالج لاہور میں 1968ء میں کلاس فیلو بھی تھے۔ جب نواز شریف وزیر اعظم بنے تو انہوں نے اپنی پرانی دوستی سے تعلق رکھنے والے اپنے اس کلاس فیلو کو بورڈ آف انویسٹمنٹ کا چیئرمین لگا دیا۔ جب غلام اسحاق خان نے 1993ء میں نواز شریف کی حکومت برطرف کی تو انہوں نے اسحاق ڈار کو یہ پیشکش کی کہ وہ اپنے عہدے پر کام کرتے رہیں۔ ایک اردو اخبار کے مالک کو یہ پیغام دے کر ان کے پاس بھیجا گیا لیکن اسحاق ڈار نے یہ پیشکش مسترد کر دی۔

نواز شریف کی برطرفی کے بعد اسحاق ڈار نے سیاست کو باقاعدہ جائن کر لیا۔ 1993ء میں لاہور میں ہونے والے ضمنی الیکشن میں انہوں نے ایم این اے کی سیٹ جیتی۔ سیٹ اس وقت جیتی جب اسلام آباد میں بینظیر بھٹو کی اور پنجاب میں ان کی پارٹی کی حکومت تھی۔ انہیں نواز شریف سے علیحدہ کرنے کے لیے ایک وفاقی وزیر کو ان کے پاس بھیجا گیا اور اس کے بدلے میں بہت ساری پیشکشیں کی گئیں۔ ان کے انکار پر پیپلز پارٹی کو بڑا غصہ آیا۔ ان کے خلاف الیکشن ٹریبونل میں ایک پٹیشن فائل کر کے انہیں اس بات پر ڈس کوالیفائی قرار دے دیا گیا کہ وہ بورڈ آف انویسٹمنٹ کے چیئرمین ہونے کے ناطے دو سال تک الیکشن لڑنے کے اہل نہیں تھے۔ تاہم بعد میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے ایک فل بنچ نے اسحاق ڈار کے حق میں یہ کہہ کر فیصلہ دیا کہ کوئی بھی شخص اگر کسی سرکاری عہدے پر بغیر تنخواہ اور مراعات لیے کام کرتا ہے تو اس پر دو سال کی شرط لاگو نہیں ہوتی۔ کئی برسوں بعد سپریم کورٹ کے ایک جج نے اسحاق ڈار کو بتایا کہ انہیں آصف زرداری کے پریشر پر الیکشن ٹریبونل سے ڈس کوالیفائی کرایا گیا تھا۔

نواز شریف کو اسحاق ڈار کی یہ ادا بڑی پسند آئی۔ یہی وجہ تھی جب 1997ء میں وہ دو تہائی اکثریت سے جب دوبارہ اقتدار میں آئے تو انہوں نے ڈار کو اپنا وزیر تجارت مقرر کر دیا۔ وزیر بنتے ہی ڈار نے ان پانچ وجوہات کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا جو ہر سیاسی حکومت لوگوں کو رشوت کے طور پر استعمال کر کے اقتدار میں اپنے دن پورے کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ ان کے نزدیک وہ پانچ چیزیں جو رشوت کے طور پر استعمال کی جاتی رہی تھیں ان میں وزیر اعظم کا صوابدیدی اختیار کہ وہ کسی کو بھی پلاٹ الاٹ کر سکتے تھے، ٹیکسٹائل کوٹے میں صوابدیدی اختیارات، صدر، وزیر اعظم، آرمی چیف اور گورنرز کا ڈیوٹی فری

گاڑیاں امپورٹ کرنے کا استحقاق، اسپیشل امپورٹ ایکسپورٹ پرمٹس اور اسپیشل ایڈجسٹمنٹ گرانٹس شامل تھیں۔

اسحاق ڈار نے سب سے پہلے ٹیکسٹائل کوٹہ ختم کیا۔ مرسیڈیز گاڑیوں کی ڈیوٹی فری امپورٹ ختم کر دی گئی اور ساتھ ہی امپورٹ ایکسپورٹ اسپیشل پرمٹس بھی بند کر دیے گئے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ان کے اس فیصلے کا اطلاق سب سے پہلے اس وقت کے صدر رفیق تارڑ اور آرمی چیف جنرل پرویز مشرف پر ہوا ورنہ ان سے پہلے جو بھی اقتدار میں آیا اس نے ڈیوٹی فری گاڑیاں ضرور منگوائیں۔ بقول ڈار کے نواز شریف نے دونوں دفعہ وزیر اعظم ہونے کے باوجود ڈیوٹی فری گاڑیاں نہیں منگوائیں۔

جونہی اسحاق ڈار نے صوابدیدی اختیارات کے تحت ٹیکسٹائل کوٹے کو ختم کیا ان سے طاقتور سیاستدان، ایم این ایز اور وہ بزنس مین ناراض ہو گئے جو ماضی میں ان مراعات سے فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔ پہلی دفعہ ملک میں ٹیکسٹائل کوٹے کی الاٹمنٹ نیلامی کے ذریعے کی گئی اور 3.3 بلین روپے میں یہ کوٹے بیچے گئے جبکہ بینظیر بھٹو کے دور میں ان کوٹوں سے صرف 73 کروڑ روپے کمائے گئے تھے۔

جونہی ڈار کے اس فیصلے کا لوگوں کو پتہ چلا تو وہ دوڑے دوڑے نواز شریف کے پاس گئے اور ان کے خلاف شکایتوں کا ایک انبار لگا دیا گیا۔ تاہم، نواز شریف نے اسحاق ڈار کو مکمل سپورٹ کی اور یوں 1998-99 میں آنے والی ٹریڈ پالیسی کے ذریعے سیاست میں کوٹوں کی کرپشن کو ختم کر دیا گیا۔

ایک دن نواز شریف نے اسحاق ڈار کو بلایا اور ان سے کہا کہ وہ انہیں سرتاج عزیز کی جگہ ملک کا نیا وزیر خزانہ مقرر کر رہے ہیں۔ اسحاق ڈار کے لیے یہ ایک نئی خبر تھی۔

میں یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ آخر نواز شریف نے سرتاج عزیز کو ہٹا کر ڈار کو وزیر خزانہ لگانے کا فیصلہ اچانک کیوں کر لیا تھا۔

اسحاق ڈار نے دھیرے دھیرے ان تمام رازوں سے پردہ اٹھانا شروع کر دیا تھا جن کی تلاش میں میں ان سے ملنے کے لیے ان کے پاس آیا تھا۔

جس دن پاکستان نے مئی 1998ء میں نیوکلیئر ٹیسٹ کیے اس کے ساتھ ہی پاکستان کے مالی معاملات بگڑنا شروع ہو گئے۔ اس وقت کی معاشی مہم کے لیے عالمی اداروں کی طرف سے لگائی گئی پابندیوں کے بعد معاملات کو سنبھالنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ جس دن پاکستان نے نیوکلیئر بم کا تجربہ کیا اس

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

[illegible]

مجھے ان باتوں سے زیادہ ڈار صاحب سے یہ پوچھنے کے لیے بے چین تھا کہ آخر اس وقت یہ فیصلہ کس نے کیا تھا کہ بینکوں میں موجود پاکستانیوں کے فارن کرنسی اکاؤنٹس کو فریز کر لیا جائے۔ یہ ایک ایسا فیصلہ تھا جس سے نواز شریف کی کریڈیبلٹی پاکستان اور پاکستان سے باہر بری طرح سے خراب ہوئی کیونکہ لوگوں کے خیال میں نواز شریف حکومت نے ان کی جیبوں پر دن دھاڑے ڈاکہ مارا تھا۔

ڈار نے اس بات کا اعتراف کیا کہ نواز شریف حکومت کا یہ فیصلہ غلط تھا لیکن ان کا اس فیصلے میں ذاتی طور پر کوئی کردار نہیں تھا۔ جس دن نیوکلیئر بم کا تجربہ کیا گیا اس دن نواز شریف نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا تھا۔ وہ اس سے پہلے ہی ساڑھے گیارہ بجے کے قریب پرائم منسٹر ہاؤس چھوڑ کر چلے گئے تھے لہٰذا انہیں اس فیصلے کا پتہ بعد میں چلا جب انہوں نے صبح کے اخبارات پڑھے۔ باقی باتیں تو چھوڑیں، کابینہ کے ممبران کو بھی یہ فیصلہ کرنے سے پہلے اعتماد میں نہیں لیا گیا تھا۔ ڈار نے اس بات کا انکشاف کیا کہ دراصل یہ فیصلے کرانے کے ذمہ دار اس وقت کے گورنر اسٹیٹ بینک یعقوب، سیکرٹری فنانس معین افضل اور پلاننگ ڈویژن کے ڈپٹی چیئرمین حفیظ پاشا تھے۔ ان سب نے مل کر نواز شریف اور سرتاج عزیز کو اس بات پر قائل کر لیا تھا کہ فارن کرنسی اکاؤنٹس کو فریز کرنا بہت ضروری ہے۔

میرے چہرے پر تاثرات دیکھ کر اسحاق ڈار نے فوراً کہا کہ اس میں سرتاج عزیز کا اتنا زیادہ

[illegible]

ڈار نے کہا کہ [illegible] Dollarisation of economy میں مصروف تھے ان سے کہا جاتا کہ وہ اپنے ڈالر پاکستانی روپوں میں تبدیل کرائیں اور اپنے اکاؤنٹس بھی ایڈجسٹ کرائیں۔ [illegible] حکومت کے ان معاشی [illegible] کی تھی کہ وہ سرتاج عزیز کو صحیح صورتحال بتاتے لیکن وہ اپنا کام کرنے میں ناکام رہے۔

میں نے کہا کہ ڈار صاحب! یہاں تک تو ٹھیک ہے۔ میں مان لیتا ہوں کہ سرتاج عزیز کا اس میں زیادہ قصور نہیں تھا لیکن مجھے ذرا یہ تو بتائیں کہ آخر اتنے بڑے سیکرٹ فیصلے کی بھنک کچھ طاقتور لوگوں کو پہلے سے کیسے پہنچ گئی تھی کہ انہوں نے راتوں رات اپنے بینکوں سے ڈالر نکلوا کر باہر شفٹ کر دیے تھے۔ ڈار صاحب بولے کیونکہ وہ اس وقت فنانس منسٹری نہیں چلا رہے تھے لہٰذا انہیں اس بات کی خبر نہیں ہے کہ اس طرح کی انفارمیشن کس طرح لیک ہوئی تھی۔ تاہم، ڈار صاحب نے کہا کہ یہ بات ضرور تھی کہ نواز شریف اس بات پر بڑے برہم تھے کہ ان معاشی ٹیم نے فارن کرنسی اکاؤنٹس فریز کرا کر ان سے ایک بہت ہی غلط فیصلہ کرایا تھا۔ نواز شریف کی یہ برہمی ایک دن سرتاج عزیز کی فنانس منسٹری کی پوسٹ سے چھٹی پر جا کر ختم ہوئی۔ اگست 1998ء میں نواز شریف نے حفیظ پاشا کو سرتاج عزیز کی جگہ اپنا فنانس ایڈوائزر مقرر کر دیا۔ حفیظ پاشا سے بھی معاملات نہیں سنبھالے گئے اور ڈالر کی قیمت 67 روپے تک چلی گئی۔ مارکیٹ میں یہ باتیں پھیلنا شروع ہو گئی تھیں کہ دسمبر 1998ء تک ڈالر کی قیمت 100 روپے ہو

www.freepdfpost.blogspot.com

allurdupdfnovels.blogspot.com

ہو جائے گی اور ساتھ ہی پاکستان کا سوشل سیکٹر تباہ ہو جائے گا۔ یہ وہ لوگ اربوں روپے کما رہے تھے جبکہ ملک مکمل طور پر تباہی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ایک دن نواز شریف نے ڈار صاحب کو بتایا کہ ان کا تاثر ہے ان کے سابق وزرائے خزانہ جن کے خیال میں حفیظ پاشا سب سے بڑے بینکر تھے کا مقابلہ نہیں کر سکے۔ 6 نومبر 1998 کو جب اسحاق ڈار کو پاکستان کا وزیر خزانہ بنایا گیا اس وقت پاکستان کے فارن ریزرو صرف 400 ملین ڈالر رہ گئے تھے۔ ڈار ان دنوں اس ملک کے وزیر خزانہ بنے تھے جب کوئی بھی محکمہ اس عہدے پر پوسٹ لینے کی کوشش نہ کرتا۔ پاکستان کو فوری طور پر غیر ملکی ایئر لائنز، ملٹی نیشنل کمپنیز، بینک لاکرز اور انکلیو کی مد میں دو ارب ڈالر سے زیادہ کی ادائیگیاں کرنی تھیں۔ ان ادائیگیوں سے کسی طور پر بھی نہیں بچا جا سکتا تھا کیونکہ یہ ادائیگیاں پیرس کلب اور لندن کلب کے ساتھ قرضوں کی ہونے والی ری شیڈولنگ کے علاوہ تھیں۔ جب حفیظ پاشا وزیر خزانہ تھے تو انہوں نے اسلامک ڈویلپمنٹ بینک کے ایک کنسورشیم کے ساتھ 1.5 بلین ڈالر قرضے کے لیے مذاکرات کیے تھے لیکن اس قرضے کے ساتھ جو شرائط رکھی گئی تھیں وہ اتنی خوفناک تھیں کہ ڈار کے لیے انہیں تسلیم کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ قرضے پر مارک اپ ریٹ مارکیٹ 1.5% سے بڑھ کر 5% تک رکھے گئے تھے۔ پاکستان سے کہا جا رہا تھا کہ وہ اپنے تین بڑے ادارے مثلاً آئل ریفائنری، فرٹیلائزر اور بجلی پیدا کرنے کے پلانٹس قرضہ دینے والے بینک کے پاس گروی رکھوائیں گے۔ اس سے بھی زیادہ خوفناک شرط یہ تھی کہ اس 1.5 بلین ڈالر کے قرضے میں سے 1.2 بلین ڈالر واپس اس کنسورشیم کے انہی ممبران کو چلے جانے تھے جو قرضہ دے رہے تھے۔ یوں درحقیقت پاکستان کے پاس صرف 300 ملین ڈالر آنے تھے لیکن پاکستان پر اس قرضے کی معیاد میں مزید 240 ملین ڈالر کا اضافہ ہونا۔

ڈار نے اس پر کافی غور و فکر کیا اور آخر انہوں نے قلم اٹھا کر اس کاغذ پر لکیر پھیر دی جس پر یہ ساری شرائط درج تھیں۔ ڈار نے 1.2 بلین ڈالر کے قرضے کو ری شیڈولنگ کرانے کے لیے مذاکرات شروع کیے اور جون 1999 میں وہ کامیاب ہو گئے۔

ڈار کے بقول سعودی شہزادہ پرنس عبداللہ نواز شریف کو بہت پسند کرتے ہیں۔ جونہی پاکستان نے ایٹمی دھماکے کیے تو سعودی عرب دو ارب ڈالر کا مفت تیل پاکستان کو دینے پر رضامند ہو گیا۔ سعودی عرب نے اس کے بدلے میں صرف ایک شرط رکھی تھی کہ ورلڈ بینک، آئی ایم ایف یا مغربی

حوالے کو اس بات کا پتہ نہیں چلنا چاہیے کہ سعودی عرب پاکستان کو مفت تیل دے رہا ہے کیونکہ ان حالات میں جب پاکستان پر پابندیاں لگ چکی تھیں سعودی عرب کے لیے مسائل پیدا ہو سکتے تھے۔ سعودی عرب کی اس شرط کا پتہ صرف سات لوگوں کو تھا جن میں نواز شریف، سرتاج عزیز، اسحاق ڈار، شہباز شریف، حفیظ پاشا اور گورنر اسٹیٹ بینک یعقوب اور معین افضل شامل تھے۔ ان ساتوں شخصیات سے یہ توقع کی جا رہی تھی کہ وہ قومی مفاد میں اس راز کو راز رکھیں گے کہ سعودی عرب پاکستان کو دو ارب ڈالر سالانہ کا مفت تیل فراہم کر رہا تھا۔

ابھی اس بات کو ایک دو ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ اسحاق ڈار کو جو ان دنوں لندن میں نواز شریف کے ساتھ ستمبر 1999ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے سیشن کو اٹینڈ کر کے واپس آ رہے تھے، گورنر اسٹیٹ بینک یعقوب نے ٹیلی فون کیا اور جو بات انہوں نے اسحاق ڈار کو بتائی اسے سن کر وہ ایک لمحے کے لیے سن ہو کر رہ گئے۔ ڈار کو بتایا گیا کہ آئی ایم ایف کی جو ٹیم اسلام آباد میں مذاکرات کے لیے آئی ہوئی ہے اس کو فنانس منسٹری کی ٹیم نے نہ صرف سعودی عرب کے دو ارب ڈالر سیکرٹ آئل کے بارے میں بتا دیا ہے بلکہ پاکستانی روپے کو ڈالر کے مقابلے میں چار سے پانچ روپے کم کرنے کی بھی منظوری دے دی ہے۔

یہ بات سن کر لندن میں موجود نواز شریف کا وفد سکتے میں آ گیا۔ نواز شریف نے اسحاق ڈار کو کہا کہ وہ فوری طور واشنگٹن جائیں جہاں حفیظ پاشا ایک ٹیم لے کر آئی ایم ایف سے دوبارہ مذاکرات کر رہے تھے۔ ڈار ایئرپورٹ سے اترتے ہی سیدھے آئی ایم ایف کے ایک انچارج سینئر ڈائریکٹر کے پاس گئے جو پاکستان کے بہی خواہوں میں سے ایک تھے اور انہیں قسم دے کر پوچھا کہ آئی ایم ایف کو سعودی تیل کے بارے میں کتنا کچھ علم ہے۔ پاکستان نے آئی ایم ایف کو یہ بتایا تھا کہ سعودی عرب نے یہ تیل پاکستان کو ایک طرح کے ادھار پر دیا ہوا ہے۔ آئی ایم ایف کے اس ڈائریکٹر نے اسحاق ڈار کو بتایا کہ جناب وزیر صاحب! آپ کی فنانس منسٹری کے لوگوں نے ہمیں اسلام آباد میں اس راز سے آگاہ کر دیا تھا جب آپ اپنے وزیر اعظم کے ساتھ نیویارک میں تھے۔

میں نے اسحاق ڈار سے پوچھا کہ ان سات لوگوں میں سے کس نے دو ارب ڈالر ...

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

ویسے میں آپ کو صرف اتنا اشارہ دے سکتا ہوں کہ نومبر 1998ء میں اس وقت کے کامرس [illegible] پاشا اور سیکرٹری فنانس معین افضل کو برخاست کرنے کی بھی وجہ تھی۔

میں کوئی دو گھنٹے سلسلہ وار اسحاق ڈار کو دیکھتا رہا جب وہ ان تمام رازوں سے پردہ اٹھا رہے تھے کہ کیسے جاوید پاشا اور معین افضل نے اپنے ملک کے دو ارب ڈالر کے ذخائر کو چند لمحوں میں آئی ایم ایف کو ادا کروا دیا تھا۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ کیسے عالمی ادارے اپنے پاکستانی ایجنٹوں کے مفادات کا خیال رکھتے ہیں۔ وہی شخص جسے نواز شریف نے قومی راز افشا کرنے پر ڈس مس کیا تھا وہ مشرف حکومت میں سیکرٹری جنرل فنانس کے عہدے پر تعینات ہوا۔ آئی ایم ایف نے انہیں ان کا انعام دلوا دیا تھا۔

ڈالروں کی بڑھتی ہوئی قلت نے اسحاق ڈار کو مجبور کیا کہ وہ امریکہ سے F-16 طیاروں کی رکی ہوئی رقوم کی ادائیگیاں کرانے کے لیے بل کلنٹن حکومت پر دباؤ ڈالیں۔ 2 دسمبر 1998ء کو نواز شریف بل کلنٹن سے وائٹ ہاؤس میں ملے۔ ان کے ساتھ سرتاج عزیز، اسحاق ڈار، شہباز شریف اور مشاہد حسین بھی تھے۔ بل کلنٹن نے نواز شریف کو کہا کہ وہ F-16 کے باقی پیسوں میں سے ستر فیصد واپس لے لیں، باقی تیس فیصد امریکہ اپنے پاس رکھے گا اور اس معاملے کو یہیں ختم سمجھا جائے۔ اسحاق ڈار نے جب یہ آفر سنی تو وہ تیس فیصد نقصان کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ انہوں نے بل کلنٹن سے کہا کہ سر! جب یہ خبر پاکستان پہنچے گی کہ امریکہ نے پاکستان کے F-16 طیاروں کی تیس فیصد رقم بغیر کسی وجہ کے رکھ لی ہے تو اس کا کوئی اچھا اثر عوام پر نہیں ہوگا کیونکہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بل کلنٹن اور نواز شریف اچھے دوست ہیں اور ایک دوست دوسرے کے ساتھ اس طرح کی ناانصافی نہیں کر سکتا۔

بل کلنٹن نے بڑی حیرانی سے اسحاق ڈار کی بات سنی اور بولے کہ امریکہ کی سپریم جوڈیشل کونسل نے انہیں جو ایڈوائزری دی تھی اس کے تحت وہ اتنا کچھ انہیں آفر کر سکتے تھے اور اس سے زیادہ کا ان کے پاس اختیار نہیں تھا۔ کلنٹن نے بتایا کہ ان کے پاس کانگریس میں بھی اکثریت نہیں تھی جہاں سے وہ سپریم جوڈیشل کونسل کے فیصلے کے خلاف پاکستان کو F-16 طیاروں کی سو فیصد رقوم کی واپسی کا فیصلہ کرا دیتے۔

ڈار نے تجویز پیش کی کہ اس کا دوسرا حل یہ ہے کہ اس وقت پاکستان کو گندم اور کاٹن کی بڑی اشد ضرورت ہے۔ ان دنوں حکومت پاکستان یہ دونوں چیزیں خریدنے کے لیے ٹینڈرز کر رہی ہے لہٰذا

امریکہ یہ دونوں چیزیں کسی معاہدے کے تحت پاکستان کو امداد میں دے سکتا ہے۔ آخر کار فیصلہ ہوا کہ امریکہ پاکستان کو 140 ملین ڈالر کی گندم اور کاٹن فراہم کرے گا۔

وزیر خزانہ بننے کے بعد ڈار کا کردار بہت زیادہ وسیع ہو گیا تھا۔ ان کے پاس اب فوجی سامان کی خریداری کے معاہدے بھی آنے لگے جن کے لیے وزارت خزانہ نے ادائیگیاں کرنی تھیں۔ ایک دن ڈار کو پتہ چلا کہ اس وقت کے چیف آف آرمی سٹاف جہانگیر کرامت سوئٹزر لینڈ سے پانچ اینٹی ایئر کرافٹ گنز لینا چاہ رہے ہیں جس کے ساتھ پاکستان کا ایک بہت بڑا پروٹوکول وہاں موجود ہے جس کے تحت دونوں ممالک مشترکہ طور پر اینٹی ایئر کرافٹ گنز تیار کریں گے۔ اس معاہدے کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ تھی کیونکہ سوئٹزر لینڈ کے ایک مینوفیکچر نے حال ہی میں ترکی اور چین کے ساتھ اس طرح کے معاہدے کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس پروٹوکول کے تحت اگر پاکستان اس مینوفیکچر کو پانچ اینٹی ایئر کرافٹ گنز مینوفیکچر کرنے کا آرڈر دیتا تو وہ پاکستان میں بھی ان گنز کی تیاری شروع کر سکتے تھے۔ اسحاق ڈار کا خیال تھا کہ اگر اس معاہدے کو استعمال کرتے ہوئے پاکستان میں اینٹی ایئر کرافٹ گنوں کی تیاری شروع کر دی جاتی تو بڑے آرام سے اس فوجی اسلحے کو چین اور ترکی جیسے ملکوں کو ایکسپورٹ کر کے کئی ملین ڈالر کمائے جا سکتے تھے۔ اسحاق ڈار نے سب سے پہلے سعودی عربیہ کے ساتھ بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ کراؤن پرنس عبداللہ اور ملائیشیاء کے وزیراعظم مہاتیر محمد سے بات چیت کی گئی۔ ان دونوں نے انتہائی مثبت جواب دیا اور کہا کہ اگر پاکستان میں اینٹی ایئر کرافٹ گنز کی تیاری شروع ہو گئی تو وہ یقیناً پاکستان کو ملین ڈالرز کے آرڈرز دیں گے۔

جب ڈار نے یہ ساری بات چیت سعودی عربیہ اور ملائیشیاء سے شروع کی تو اس کے بعد جہانگیر کرامت اب کسی غیر ملکی مینوفیکچر کو اینٹی ایئر کرافٹ گنیں تیار کرنے کا آرڈر نہیں دے سکتے تھے لیکن سا تھ ہی افسوسناک بات یہ ہوئی کہ جنرل جہانگیر کرامت نے ان گنوں کی تیاری کا آرڈر ہیوی میکینیکل کمپلیکس کو بھی نہیں دیا جس سے پاکستان کو اچھا خاصا نقصان ہوا کیونکہ ان گنوں کو سوئٹزر لینڈ کی مدد سے تیار کر کے سعودی عرب، ملائیشیاء اور دیگر ممالک کو ایکسپورٹ کیا جا سکتا تھا۔

میں ڈار سے پوچھنے کے لیے بے چین تھا کہ آخر کارگل آپریشن پر کون جھوٹا اور کون سچا تھا۔ تھوڑا عرصہ پہلے چوہدری شجاعت نے مجھے ہی ایک انٹرویو دے کر پاکستانی سیاست میں ایک نئی بحث

www.freepdfpost.blogspot.com

!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!

چھوڑ دی تھی کہ کارگل آپریشن کا ذمہ دار کون تھا۔ شجاعت کے بقول جنرل مشرف نے یہ آپریشن نواز شریف سے اجازت لے کر کیا تھا۔ میں نے یہ سوال اسحاق ڈار سے پوچھا کیونکہ وہ اس وقت ملک کے وزیرخزانہ تھے جب کارگل کی جنگ لڑی جا رہی تھی۔

ڈار نے مجھے بتایا کہ انہیں کارگل کے ڈرامے کے متعلق بہت کچھ پتہ تھا۔ وہ ان تمام حالات سے آگاہ تھے جو اس وقت فوج اور سویلین لیڈرشپ میں چل رہے تھے۔ مجھے اس بارے میں بتانے سے پہلے انہوں نے یہ مطالبہ کیا کہ ایک جوڈیشل کمیشن بنایا جائے جس کے سامنے پیش ہو کر وہ تمام حقائق رکھیں گے جنہیں سن کر پوری قوم ہل جائے گی۔ اسحاق ڈار نے کہا کہ وہ کچھ رازوں سے تو پردہ اٹھا سکتے ہیں لیکن وہ کچھ باتیں صرف جوڈیشل کمیشن کو بتائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ اس بارے معاملے میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ مئی 1999ء میں جنرل مشرف نے ایک دن اسحاق ڈار اور سرتاج عزیز کو جو اس وقت وزیرخارجہ تھے، جی ایچ کیو کے ملٹری آپریشن روم میں ایک بریفنگ دی۔ اس کے بعد ڈیفنس کیبنٹ کمیٹی کی کئی میٹنگز بھی ہوئیں اور جون میں نواز شریف کی سربراہی میں منعقد کی گئیں جن میں جنرل مجید ملک، راجہ ظفرالحق اور مشاہد حسین کے علاوہ اس کمیٹی کے مستقل ممبران نے بھی شرکت کی جس میں آرمی چیف، نیول چیف اور ایئر چیف بھی شامل تھے۔ جب یہ فیصلہ کیا گیا کہ نواز شریف 4 جولائی کو فوری طور پر امریکہ جائیں گے جہاں وہ بل کلنٹن سے ملاقات کر کے بھارت سے متوقع ایک بڑی جنگ کو روکنے کی کوشش کریں گے تو اس سارے معاملے پر گفتگو کے لیے دو اہم میٹنگز کی گئیں۔

ڈار کے لہجے میں کوئی شک نہیں تھا کہ نواز شریف صرف فوج کو بچانے کے لیے امریکہ گئے تھے۔ جنرل مشرف ہر قیمت پر پاکستان اور بھارت کے درمیان کارگل سے پیدا ہونے والی صورتحال کو سنبھالنے کے لیے امریکہ کی مداخلت چاہتے تھے۔

میں نے کہا کہ ڈار صاحب! یہ بات تو بعد میں کریں گے۔ پہلے یہ بتائیں کہ کیا نواز شریف کو کارگل آپریشن کے بارے میں پہلے ان سے پتہ تھا یا نہیں۔

ڈار نے بڑی تلخی سے کہا، ہرگز نہیں!

وہ بولے باقی بات تو چھوڑیں، حتیٰ کہ فوج کے کور کمانڈرز، ایئرفورس اور نیول چیف کو بھی کارگل آپریشن کی بھنک نہیں پڑنے دی گئی تھی۔ نواز شریف کو ابھی پہلی دفعہ 17 مئی کو اس آپریشن کے بارے

میں اطلاع دی گئی تھی۔

ڈار نے انکشاف کیا کہ کارگل آپریشن شروع کرنے سے کئی ماہ پہلے مری میں ایک بریفنگ کا اہتمام کیا گیا تھا لیکن کسی صورت میں بھی نواز شریف سے کارگل آپریشن کی منظوری کا ذکر نہیں کیا جا سکتا۔ کارگل آپریشن کو بغیر کسی تیاری اور منصوبہ بندی کے جنرل مشرف نے شروع کیا۔ پاکستان کی اعلیٰ سیاسی قیادت سے صرف اس وقت رابطہ کیا گیا جب کارگل آپریشن کی خبریں چھپنا شروع ہو گئیں۔ سیاسی لیڈرشپ سے کہا گیا کہ اب کوئی راستہ نکال کر ان کی مدد کی جائے۔ جنرل مشرف سے ایک بریفنگ کے دوران نواز شریف نے یہی سوال کیا کہ جنرل صاحب! پہلے آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ نے مجھے اس آپریشن کے بارے میں کیوں نہیں بتایا تھا۔

ڈار نے کہا کہ نواز شریف صرف اور صرف جنرل مشرف کی ذاتی درخواست اور اصرار پر امریکہ گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ نواز شریف کو خود چھوڑنے کے لیے ڈار ایئرپورٹ پر موجود تھے۔ نواز شریف نے انتہائی سنجیدگی اور خلوص سے فوج کی عزت بچانے کی کوشش کی تھی۔ نواز شریف ان جوانوں کو بھی بچانا چاہتے تھے جو کارگل کے محاذ پر لڑ رہے تھے۔ باتیں کرتے کرتے اسحاق ڈار اچانک رک گئے۔ انہوں نے کہا کہ اگرچہ انہیں اس بارے میں بہت کچھ علم تھا لیکن وہ کارگل پر اس سے زیادہ گفتگو نہیں کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ باقی باتیں وہ کسی جوڈیشل کمیشن کے سامنے کر سکتے ہیں کیونکہ اس طرح کے راز اگر اس طرح افشا کیے گئے تو شاید پاکستان کے مفاد میں نہ ہوں۔

میں نے کہا ڈار صاحب! یہ تو بتائیں کہ جنرل مشرف کو آرمی چیف کے عہدے سے کیوں ہٹایا جا رہا تھا؟

ڈار نے گہری سانس لی اور بولے کہ نواز شریف کی جنرل مشرف سے خفگی کے پیچھے کئی عناصر تھے۔ ایک دن کراؤن پرنس عبداللہ نواز شریف کی درخواست پر پاکستان تشریف لائے۔ نواز شریف نے ان سے درخواست کی تھی کہ وہ پاکستان سے فوجی ساز و سامان خریدیں۔ کراؤن پرنس کے لیے ایک بریفنگ کا انتظام کیا گیا۔ اس میں اسحاق ڈار بھی شامل تھے۔ چیف آف آرمی سٹاف مشرف نے ایک لمبی بریفنگ دی جس کا معیار انتہائی گرا ہوا تھا کہ پاکستان سعودی عربیہ کو اس بات پر قائل نہیں کر سکا کہ وہ ہتھیار خریدنے کا آرڈر دے۔ مشرف نے سعودی بادشاہ کو بتایا کہ پاکستان نے پچھلے ایک سال میں

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!!blogspot!!!com!!

صرف ملاقات میں ڈار کا موڈ بتا رہا ہے۔ یہ میٹنگ بھی کہ نواز شریف خاصے ناراض ہو گئے تھے۔

ایک اور میٹنگ جو ستمبر کے بیچ میں نواز شریف کو ملی تھی، اس میں اسحاق ڈار اور سرتاج عزیز بھی شامل تھے۔ اس میٹنگ میں جنرل مشرف نے نواز شریف سے درخواست کی کہ وہ ایک ایکشن کونسل بنائیں۔ اس کو آپ نیشنل سیکورٹی کونسل سے ملتا جلتا تھا۔ جنرل مشرف نے اس میٹنگ میں یہ بھی درخواست کی کہ آرمی چیف بڑی آسانی سے چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کا عہدہ بھی ہینڈل کر سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جنرل مشرف یہ عہدہ بھی اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے۔

ڈار مجھے بتاتے رہے کہ جب جنرل مشرف اور نواز شریف میں اختلافات زیادہ بڑھنا شروع ہوئے تو ایک دن جنرل مشرف بڑے میاں صاحب سے ملنے رائیونڈ پہنچ گئے۔ اس سے پہلے وہ شہباز شریف کو جولائی 1999ء میں یہ پیشکش بھی کر چکے تھے کہ وہ اسلام آباد تشریف لے آئیں اور وزیراعظم کے مشیر کے طور پر کام کریں کیونکہ اس سے ان کے بھائی کی فیڈرل حکومت کی کارکردگی بہت بہتر ہو جائے گی۔ ڈار نے انکشاف کیا کہ جنرل مشرف کی رائیونڈ یاترا کے بعد انہیں چیئرمین جائنٹ چیفس آف سٹاف بنا دیا گیا۔ نواز شریف اور جنرل مشرف کے درمیان اختلافات اس وقت شدت اختیار کر گئے جب جنرل مشرف نے کور کمانڈر کوئٹہ طارق پرویز کو یہ کہہ کر ڈس مس کر دیا کہ وہ جا کر وزیراعظم سے ملے تھے۔ 10 اکتوبر کو ڈار کی نواز شریف سے لاہور میں ملاقات ہوئی تو انہوں نے وزیراعظم کو شدید پریشان دیکھا۔ طارق پرویز اس وقت یورپ کے دورے پر تھے۔ وہ فوری طور پر اپنا دورہ مختصر کر کے لاہور پہنچ گئے تھے۔ ڈار سے ملاقات کے بعد طارق پرویز کو نواز شریف سے ملنا تھا۔

ڈار ابھی یہ بات بتا رہے تھے کہ انہیں پتہ نہیں کیا یاد آیا اور وہ مجھے بتانے لگے کہ جنرل مشرف نے ان سے ایک انفرادی درخواست کی کہ آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کے لیے پانچ ارب روپے کی امداد دی جائے۔ وہ اس شرط پر آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کو اتنی بڑی رقم دینے پر آمادہ ہوئے کہ اس ٹرسٹ کے مالی معاملات فوری طور پر فنانس منسٹری کو منتقل کر دیے جائیں اور بعد میں فوجی فاؤنڈیشن اور آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کو ایک دوسرے میں ضم کر دیا جائے۔ جنرل مشرف نے اسحاق ڈار کا شکریہ ادا کیا اور ایک سرکاری خط کے ذریعے فوری طور پر آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کے اعلیٰ عہدوں پر بیٹھے لوگوں کو تبدیل کر دیا۔ تاہم ملک

میں 12 اکتوبر کا واقعہ ہونے کی وجہ سے فوجی فاؤنڈیشن اور آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کو ایک دوسرے میں ضم نہ کیا جا سکا۔

میں نے پوچھا کہ ڈار صاحب 12 اکتوبر کو کیا ہوا تھا؟

ڈار صاحب نے گہرا سانس لیا اور بولے کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس دن وہ شاید ایسے وزیر تھے جنہیں کچھ پتہ نہیں تھا کہ ان کے دفتر کے باہر کیا ہو رہا ہے اور ان کی سیاسی حکومت کب کی ختم ہو چکی ہے۔ انہیں پاکستان میں فوجی بغاوت کا علم شام کو پونے آٹھ بجے ہوا۔ وہ پونے چھ بجے سے کاٹن گروورز، اپٹما، ایم این ایز اور دیگر لوگوں کے ساتھ کپاس کی قیمتیں طے کرنے کے لیے ایک میٹنگ میں مصروف تھے۔ اس میٹنگ میں شہباز شریف نے بھی شریک ہونا تھا، تاہم آخری لمحے تک ان کی سیٹ خالی رہی کیونکہ وہ اس میٹنگ میں نہیں پہنچ سکے تھے۔ ساڑھے چھ بجے اسحاق ڈار نے اپنے سیکرٹری سے کہا کہ وہ پرائم منسٹر ہاؤس فون کر کے شہباز شریف کا پتہ کریں۔ انہیں بتائیں کہ میٹنگ شروع ہو چکی ہے لہٰذا وہ جلدی سے آ جائیں۔ تاہم، سیکرٹری کو بتایا گیا کہ شہباز شریف وزیراعظم نواز شریف کے ساتھ میٹنگ میں ہیں۔ ان سے اس وقت بات نہیں ہو سکتی ہے۔ میٹنگ جاری رہی۔ خاصی دیر بعد اچانک ایک ایڈیشنل سیکرٹری کمرے میں داخل ہوئے اور سیدھے اسحاق ڈار کے پاس گئے اور ان کے کان میں سرگوشی کی کہ ملک پر فوج نے قبضہ کر لیا ہے۔ غیر ارادی طور پر اسحاق ڈار نے جب یہ خبر اس میٹنگ میں شریک لوگوں کو سنائی تو ان سب کے لیے یہ ایک بم شیل تھا۔ ماسوائے ایڈیشنل سیکرٹری، ایڈیشنل سیکرٹری اور پرائیویٹ سٹاف کے باقی سارے لوگ کمرہ چھوڑ کر بھاگ گئے اور اسحاق ڈار اکیلے بیٹھے ان سب لوگوں کو اس طرح وہاں سے بھاگتے ہوئے دیکھتے رہے۔

چار سال بعد مجھے اس لمحے کی روداد سناتے ہوئے بھی اسحاق ڈار کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ملک کی سیاسی لیڈرشپ کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا تھا۔ ڈار نے یاد کیا کہ جولائی 1999ء میں مری میں ہونے والی ایک فارمیشن کمانڈرز میٹنگ میں جنرل مشرف نے ان کی بے پناہ تعریف کی تھی اور وردی میں ملبوس افسروں کو بتایا تھا کہ کس طرح اسحاق ڈار نے ملک میں جاری اقتصادی بحران کے باوجود خصوصاً نیوی اور آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کے لیے مدد کی تھی۔ جنرل مشرف انہیں چھوڑنے کے لیے باہر تک آئے۔ ڈار صاحب کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ لوگ کیسے راتوں رات بدل جاتے ہیں۔

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!!blogspot!!com!!

www.freepdfpost.blogspot.com

!!!allurdupdfnovels!!!blogspot!!!com!!!

انہیں گھر سے نکلتے وقت سکول جانے سے پہلے تلاشی کے مراحل سے گزرنا پڑتا۔ گھر کی خواتین کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔

"کیا میں غدار تھا؟" اسحاق ڈار نے بڑی تلخی سے مجھ سے سوال پوچھا۔

میں چپ رہا۔

25 اپریل سے لے کر 6 دسمبر 2000ء تک فوج نے اسحاق ڈار سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ وہ اپنے گھر میں قید رہے۔ آخر ایک دن لیفٹیننٹ جنرل محمود ان سے ملنے کے لیے ان کے گھر لاہور آئے۔ جنرل محمود نے ڈار صاحب کو بتایا کہ جنرل مشرف کے بعد اگر کوئی سب سے مصروف شخص تھا تو وہ تھے لیکن پھر بھی وہ ان سے ذاتی طور پر ملنے لاہور آئے ہیں۔ جنرل محمود نے اسحاق ڈار کو بتایا کہ آرمی کی ٹاپ لیڈرشپ ان کی ملک کے لیے کی گئی خدمات کو سراہتی ہے اور وہ جاننا چاہتے تھے کہ ڈار صاحب کے اب سیاسی منصوبے کیا ہیں۔ اسحاق ڈار نے بڑے طنزیہ لہجے میں جنرل محمود کو جواب دیا کہ جی ہاں! آپ درست فرماتے ہیں اس ملک کے لیے اتنی خدمات دینے کا انعام مجھے 12 اکتوبر کے بعد قید میں رکھ کر پہلے ہی دے دیا گیا تھا۔

جنرل محمود نے وضاحت کی کہ دراصل ڈار صاحب کو نواز شریف کے سب سے زیادہ قریب سمجھا جاتا تھا اور ایک طرح سے وہ ان کے اہم منسٹر تھے۔ یہی وجہ تھی کہ سب کا خیال تھا کہ یہ شخص ہی ایسا تھا کہ اسحاق ڈار نے نواز شریف اور ان کی فیملی کو [illegible] سے بچائے ہوں۔

ڈار صاحب نے جنرل محمود کو بتایا کہ 25 اپریل کو جنرل امجد نے انہیں خود ایک کلین چٹ دی تھی۔ اب [illegible] آئی ایس آئی جس کے وہ سربراہ تھے نے [illegible] ان کے خلاف [illegible] ثبوت اکٹھے کیے تھے۔

جنرل محمود نے ڈار صاحب کو بتایا کہ وہ ان سے ملنے کے لیے اس وقت آئے ہیں جب ان کے خلاف نیب اور دوسرے اداروں نے تحقیقات مکمل کر لی تھیں اور انہیں یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ اسحاق ڈار کے خلاف انہیں کوئی ایک بھی ایسی چیز نہیں ملی جس پر وہ کوئی اعتراض کرتے۔ اسی لیے وہ ذاتی طور پر ملنے کے لیے ان کے گھر آئے ہیں۔ صرف جنرل مشرف کو اس میٹنگ کا علم ہے۔

تب جنرل محمود نے ڈار صاحب سے کہا کہ وہ نواز شریف کو چھوڑ دیں۔

25 دسمبر 2000ء کو آئی ایس آئی پنجاب کے چیف نے ڈار صاحب کو مطلع کیا کہ 27 دسمبر کو انہیں اور مشاہد حسین کو رہا کر دیا جائے گا۔ ڈار صاحب کو کہا گیا کہ وہ یہ بتائیں کہ 28 دسمبر کو عید کی نماز کہاں پڑھنا پسند کریں گے تاکہ ان کے لیے سیکیورٹی کا انتظام کیا جا سکے۔

اگلے دن 26 دسمبر کو ایک آئی ایس آئی آفیسر میاں محمد اظہر کو ان سے ملوانے کے لیے لے آئے۔ اسحاق ڈار کو یوں محسوس ہوا کہ ملک کا وزیراعظم ان سے ملنے کے لیے گھر آیا ہے۔ میاں اظہر کو اس طرح پروٹوکول دیا گیا جا رہا تھا جیسے وہ اس وقت ملک کے وزیراعظم ہوں۔ میاں اظہر بھی ایسے ہی ایکٹنگ کر رہے تھے جیسے وہ واقعی بغیر حلف اٹھائے اس ملک کے وزیراعظم تھے۔ ادھر ادھر کی باتوں میں وقت ضائع کیے بغیر میاں اظہر نے اسحاق ڈار کو کہا کہ وہ جنرل مشرف کے زیر سایہ بننے والی سیاسی پارٹی میں شامل ہو جائیں۔ اسحاق ڈار نے انکار کیا اور میاں اظہر کو یاد دلایا کہ ان دونوں کو سیاست میں لانے والے نواز شریف تھے اور اس وقت نواز شریف کو چھوڑنا مناسب نہیں ہوگا۔

اسحاق ڈار کا انکار سن کر میاں اظہر نے ایک لمبی وضاحت پیش کی کہ انہوں نے نواز شریف کو کیوں چھوڑا تھا۔ میاں اظہر نے ڈار کو بتایا کہ ان کے پاس آنے کی ایک اور وجہ بھی تھی کہ جنرل مشرف انہیں ذاتی طور پر پسند کرتے ہیں۔ میاں اظہر نے جب بات بنتے نہیں دیکھی تو انہوں نے اسحاق ڈار پر طنز کیا کہ جناب اب نواز شریف ڈیل کر کے سعودی عرب جا رہے تھے تو ایک لمحے کے لیے بھی انہوں نے اسحاق ڈار اور دیگر ساتھیوں کا نہیں سوچا اور آج وہ بیٹھے نواز شریف سے وفاداری کا ڈھول پیٹ رہے ہیں۔ میاں اظہر دو گھنٹے تک اسحاق ڈار کے ساتھ رہے اور انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ بات نہیں بنی تو لوٹ گئے۔

میاں اظہر نے جا کر جنرل مشرف کو ان کے خلاف انتہائی نیگیٹو رپورٹ پیش کی۔ فروری 2001ء میں دی نیوز کے انویسٹی گیٹو رپورٹر طارق بٹ نے یہ ساری رپورٹ اخبار میں شائع کر دی۔

یہ رمضان کا آخری روزہ تھا۔ ڈار صاحب ابھی افطاری سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ آپریٹر نے انہیں بتایا کہ ان کے لیے جدہ سے ٹیلی فون کال ہے۔ فون پر دوسری طرف نواز شریف تھے۔ نواز شریف نے جنرل محمود کے خلاف سخت الفاظ استعمال کیے اور ڈار صاحب کو بتایا کہ اس پنجابی جرنیل نے ان کے ساتھ بہت برا سلوک کیا ہے۔ ڈار نے بھی نواز شریف کی ہاں میں ہاں ملائی۔

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovel!!!!!blogspot!!!com!!

اسحاق ڈار کو پتہ نہیں تھا کہ ان کی ٹیلی فون پر ہونے والی ساری گفتگو ریکارڈ کی جا رہی تھی۔ نواز شریف کی اس کال کا یہ نتیجہ نکلا کہ انہیں اس رات رہا کرنے کے بجائے مزید آٹھ مہینے تک گھر پر قید رکھا گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ جنرل محمود کو نواز شریف اور اسحاق ڈار کے درمیان ہونے والی اس گفتگو کا ٹرانسکرپٹ پیش کیا گیا تھا۔ ڈار کے خیال میں ان کے ساتھ ہونے والی تمام زیادتیوں کے ذمہ دار جنرل محمود تھے ورنہ انہیں جنرل امجد کے ساتھ 20 اپریل کو ہونے والی میٹنگ کے بعد رہا کیا جا رہا تھا۔

اپنی رہائی کے بعد اسحاق ڈار نے جو پہلا کام کیا وہ یہ تھا کہ انہوں نے ٹیلی فون اٹھایا اور جنرل امجد کو فون کیا جو اس وقت نیب سے ہٹا کر کور کمانڈر ملتان لگا دیے گئے تھے۔ اسحاق ڈار نے انہیں سچ مچ میں بتایا کہ قیامت والے دن خدا کے سامنے ان کا گریبان پکڑ کر ضرور انصاف مانگیں گے کیونکہ 20 اپریل کے بعد ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کے وہ ذمہ دار تھے۔ جنرل امجد یہ بات سن کر تھوڑے سے نرم ہوئے۔ انہوں نے اسحاق ڈار کو ملتان آنے کی دعوت اور ساتھ یہ بھی کہا کہ 20 اپریل کے بعد ان کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے وہ ذمہ دار نہیں تھے۔

جب اسحاق ڈار قید میں تھے تو انہیں کچھ سینئر ملٹری آفیسروں نے یہ مشورے دیے تھے کہ وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔ ڈار صاحب کا خیال تھا کہ جنرل محمود ان کے اور چوہدری نثار کے خلاف دل میں کوئی ذاتی بغض رکھتے ہیں اس لیے ان دونوں کی رہائی نہ ہونے میں ان کا اہم کردار تھا۔

مجھے پتہ تھا کہ اسحاق ڈار کے بیٹے کی منگنی نواز شریف کی بیٹی سے تازہ تازہ ہوئی تھی لہٰذا اگر کوئی شخص میاں صاحبان کے قریب ہونے کا دعویٰ کر سکتا تھا تو وہ ڈار صاحب تھے۔ لہٰذا اندر کی باتیں یقیناً انہیں پتہ ہوں گی۔

میں نے کہا کہ ڈار صاحب آخر نواز شریف اور جنرل مشرف کے درمیان یہ ڈیل کیسے اور کیونکر ہوئی تھی کہ وہ پاکستان چھوڑ کر چلے گئے۔

ڈار صاحب نے ایک لمحے کے لیے میری طرف دیکھا اور پھر رازوں پر سے پردہ اٹھانا شروع کیا۔

سعودی کراؤن پرنس عبداللہ نواز شریف کو پسند کرتے تھے اور ان کی رہائی کے لیے کوششیں کر رہے تھے۔ شاہ عبداللہ کی نواز شریف کے لیے پسندیدگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ریاض

میں ہونے والی ایک میٹنگ کے دوران کراؤن پرنس نے نواز شریف کو اپنا بھائی کہہ کر بلایا تھا۔ دوسرے آج بھی سعودی عربیہ خصوصاً اور باقی مسلم دنیا عموماً ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی سے نہ بچانے پر اپنے آپ کو مجرم سمجھتی ہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ نواز شریف کا انجام بھی بھٹو کی طرح ہو۔ سعودی عربیہ نے پہلے قطر کے وزیر خارجہ سے کہا کہ وہ جنرل مشرف کی فوجی حکومت سے رابطہ کریں اور نواز شریف کی رہائی کے لیے مذاکرات شروع کریں۔ قطر کے وزیر خارجہ نے سعودی عرب کو بتایا کہ جنرل مشرف کی حکومت نواز شریف کو رہا کرنے پر تیار نہیں تھی۔ شاہ عبداللہ نے ہمت نہیں ہاری۔ انہوں نے لبنان کے وزیر اعظم رفیق حریری سے بات کی اور ساتھ میں اپنے بیٹوں کو ان کے ساتھ لگایا کہ وہ پاکستان کی فوجی حکومت سے کوئی ڈیل طے کریں۔ تاہم بات پھر بھی نہیں بن رہی تھی۔ جب سعودی قیادت نے یہ دیکھا کہ جنرل مشرف کسی والے سے بھی کوئی بات سننے کو تیار نہیں ہیں تو آخر ایک دھمکی اسلام آباد کو بھیجی گئی کہ آج کے بعد دو ارب ڈالر کا مفت میں دیا جانے والا تیل بند کر دیا جائے گا اگر انہوں نے نواز شریف کو رہا نہ کیا۔

جو کام قطر کا وزیر خارجہ، لبنان کا وزیر اعظم اور سعودی شاہ کے اپنے بیٹے بھی نہیں کر سکے تھے وہ دو ارب ڈالر کی اس دھمکی نے کر دکھایا۔

ان مذاکرات میں پہلی کامیابی اس وقت ہوئی جب جنرل مشرف نے سعودیوں سے کہا کہ وہ شریف فیملی کے چاروں افراد سے یہ کہیں کہ وہ ملک سے اپنا میڈیکل علاج کرانے کے لیے جانا چاہتے ہیں یوں اس درخواست پر نواز شریف اور ان کی فیملی کو میڈیکل گراؤنڈز پر ملک سے باہر بھیجا گیا۔

برسوں بعد جب اسحاق ڈار نواز شریف سے جدہ میں ملے تو نواز شریف نے انہیں بتایا کہ انہوں نے جنرل مشرف سے کوئی براہ راست ڈیل نہیں کی تھی۔ جنرل مشرف ابھی بھی سعودی حکمرانوں سے یہ درخواست کرتے رہتے تھے کہ وہ شریف فیملی کو سعودی عربیہ سے کہیں نہ جانے دیں۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستانی ایمبیسی کو بھی منع کر دیا گیا تھا کہ وہ شریف فیملی کے لوگوں کے پاسپورٹ کی تجدید نہ کریں تاکہ وہ وہاں سے باہر نہ جا سکیں۔

ڈار صاحب کے بقول سعودی حکمرانوں نے پہلے دن ہی پاکستان کی فوجی قیادت کو ایک بڑا سخت پیغام بھیجا تھا کہ نواز شریف کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ ڈار صاحب نے دعویٰ کیا کہ یہ ساری ڈیل سعودیوں نے جنرل مشرف سے خود طے کی تھی۔ نواز شریف اس پوزیشن میں ہرگز نہیں تھے کہ وہ جیلوں

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

میں تو اپنے دیگر ساتھیوں کو اس ڈیل میں شامل کرا کے اپنے ساتھ لے جانے کا مطالبہ کیا تھا۔ نواز شریف ان سب کو اپنے ساتھ لے کر سعودی عرب کیوں نہیں لے گئے تھے اس کا جواز بہت کم بنتا ہے۔

میں نے ڈار صاحب سے پوچھا کیا کبھی انہوں نے نواز شریف سے جنرل مشرف کے ساتھ ہونے والی ڈیل پر کوئی سیر حاصل گفتگو کی تھی۔ وہ بولے کہ ہاں ان کی نواز اور شہباز دونوں سے اس بارے میں بات ہوئی تھی۔ دونوں کا یہی خیال تھا کہ فوجی حکومت نے سب سے زیادہ ٹارگٹ انہیں کیا تھا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اگر وہ اس ملک سے چلے جائیں تو ممکن ہے کہ جیلوں میں بند ان کے دوسرے ساتھیوں کو بھی رہائی مل جائے۔

میں نے ڈار صاحب سے پوچھا کہ ان کے بیٹے کی نواز شریف کی بیٹی سے منگنی کیسے ہوئی تھی۔

وہ بولے کہ اگست 2000ء میں دونوں خاندانوں کے بڑوں نے یہ فیصلہ کیا تھا۔

میں نے کہا کہ ڈار صاحب! آپ کے خیال میں نواز شریف حکومت کی سب سے بڑی غلطی کیا تھی جس کی وجہ سے اس ملک میں 12 اکتوبر کا مارشل لاء لگا۔ وہ بولے کہ سب سے بڑی غلطی تو یہ تھی کہ فوج کرنی کی طرح کوئی بھی کام نہیں کرنا چاہیے تھا۔ دوسرے احتساب کے نام پر جاری مہم تو انصاف پر مبنی نہیں تھی۔ نواز شریف حکومت کو ہر ایک کا احتساب کرنا چاہیے تھا۔

میں نے اسحاق ڈار صاحب سے آخری سوال پوچھا کہ ان کی زندگی میں سب سے بڑا نقصان کیا ہوا تھا۔ وہ بولے کہ جو حشر میرے خاندان کے ساتھ وردی میں ملبوس لوگوں نے کیا تھا اس کے بعد سب کے ذہن پر شدید برا اثر ہوا تھا۔ اب میرے بچے اس ملک میں ایک غیر جمہوری ماحول میں رہنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ میری زندگی کا یہ سب سے بڑا نقصان تھا۔

فیصل صالح حیات

فیصل صالح حیات سے میری پہلی ملاقات 2002ء کے انتخابات کے بعد میر ظفر اللہ جمالی کی حکومت بننے کے بعد ہوئی تھی۔ جس میں وہ پیپلز پارٹی کو تین دہائیوں کے بعد چھوڑ کر جنرل مشرف کے ساتھ مل گئے تھے۔ اس وقت وہ جنرل مشرف کی حکومت کے وزیر داخلہ تھے۔

میری ان سے ملاقات پارلیمنٹ کے کیفے ٹیریا میں ہوئی تھی جہاں وہ بہت سارے صحافیوں میں گھرے بیٹھے ان کے تیز و تند سوالات کے جواب دے رہے تھے۔ وہ پیپلز پارٹی کو توڑ کر بنائے گئے پیٹریاٹ گروپ کے خلاف میری خبروں سے بڑے نالاں تھے۔ مجھے ان کی ناراضگی کا پتہ جنگ گروپ کے مالک میر شکیل الرحمن صاحب کے مجھے کیے گئے ٹیلی فونز سے چلتا رہتا تھا۔ میر صاحب نے دو تین دفعہ یہ بات کہی تھی کہ فیصل صالح حیات میری رپورٹنگ کی وجہ سے مجھ سے ناراض ہیں۔

جب میں نے فیصل صالح حیات کو پارلیمنٹ کے کیفے ٹیریا میں دیکھا تو سوچا کہ جا کر ان سے ملتا ہوں اور ان کا نقطہ نظر جاننے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں خوشگوار موڈ کے ساتھ ان کی میز پر گیا۔ وہ مجھے شکل سے نہیں پہچانتے تھے۔ میں نے ان سے اپنا تعارف کرایا۔ انہوں نے مجھے کوئی خاص اہمیت نہیں دی جس سے مجھے تھوڑا سا جھٹکا لگا کہ کیا وہ واقعی مجھے نہیں جانتے تھے یا جان بوجھ کر نظر انداز کر رہے تھے۔ پھر ان کے خیال میں جو وزیر جنگ گروپ کے مالک میر شکیل الرحمن کو براہ راست فون کر کے اس کے

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!!!!blogspot!!!com!!

رپورٹر کے خلاف شکایت کر سکتے ہو۔ بھلا ایک رپورٹر کو وزارت سے ہٹانے کی کیا ضرورت تھی۔

میں نے ان دنوں ٹی وی پر سیاسی رپورٹنگ شروع کی تھی اور ضرورت سے زیادہ جوش و خروش تھا۔ میں بھی شاید دوسرے رپورٹروں کی طرح بیہیو کر رہا تھا جنہیں ہر وقت اپنی شناخت کا خیال رہتا ہے اور وہ ضرورت سے زیادہ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کوئی جج کہلانا شروع کر رہے ہیں۔ وہ ہر جگہ اونچی آواز میں سوال کر کے اور تکرار کر کے اپنا بنیادی فرض سمجھتے ہیں اور یہ تصور کر لیتے ہیں کہ شاید اس سے انہیں بڑا رپورٹر مان لیا جائے گا۔ میں نے بھی وہی حرکت کی اور فیصل صالح حیات سے کسی بات پر تکرار شروع کر دی جس سے میرے اور ان کے درمیان تھوڑی سی تلخی پیدا ہو گئی۔

فیصل نے کمال رواداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے کہا کہ آپ اب تک ہمارے نئے سیاسی گروپ کے خلاف خبریں دے رہے ہیں اور صرف ہمارے خلاف خبریں شائع کر رہے ہو۔ بہتر ہوگا کسی وقت میرے پاس آ کر مجھ سے پہلے کوئی موقف لیں اس کے بعد جو خبر دل چاہے لکھو۔

میں نے فیصل صالح حیات کی اس بات سے اتفاق کیا کہ ایک رپورٹر کے لیے ضروری ہے کہ وہ جو کچھ دونوں فریقوں کی طرف سے سنا کرے تب وہ لکھنے کے لیے بیٹھے تو اس کے ذہن میں ایک بہتر تصویر ہوتی ہے۔

کچھ دنوں بعد میں نے فیصل صالح حیات کو فون کیا۔ ان سے وقت طے ہوا۔ انہوں نے مجھے سیکرٹریٹ میں واقع وزارت داخلہ کے دفتر میں بلا لیا۔

ان کے دفتر میں جو کمرہ تھا اس کی دیوار پر لگے ایک بورڈ پر لکھے وہ نام پڑھنے شروع کیے جو اس وقت تک وزیر داخلہ رہے تھے۔ فیصل صالح حیات کا نمبر 33 تھا۔ ان سے پہلے سکندر مرزا، ملک فیروز خان نون، [illegible] ذوالفقار علی بھٹو، جنرل ضیاء کے پاس بھی وزارت داخلہ کا چارج رہا تھا۔

میں نے نام پڑھنے کے بعد فیصل صالح حیات سے کہا کہ اتنے بڑے بڑے لوگوں کے پاس وزارت داخلہ کا عہدہ رہا ہے اور آج وہ اس کرسی پر بیٹھے ہیں تو انہیں کیا محسوس ہوتا ہے۔

فیصل صالح حیات نے انگلی کے اشارے سے مجھے کہا کہ ذرا نمبر 18 پر لکھا ہوا نام پڑھو۔

میں نے وہ نام پڑھا جو ذوالفقار علی بھٹو کا تھا۔

فیصل صالح حیات نے باقی 32 ناموں کو نظرانداز کرتے ہوئے مجھے کہا کہ مجھے اس بات پر بڑا [illegible]

فخر محسوس ہوتا ہے کہ کبھی اس وزارت کو میرا لیڈر ذوالفقار علی بھٹو چلاتا تھا۔

ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میں نے فیصل سے پوچھا کہ وہ سیاست میں کیسے داخل ہوئے۔ ان کا جواب سن کر مجھے حیرانی ہوئی کہ کبھی وہ لاہور میں اسلامی جمعیت طلباء کے رکن تھے۔ جلد ہی فیصل صالح حیات کو محسوس ہوا کہ وہ اس مذہبی جماعت کے سخت ماحول میں سیاست نہیں کر سکتے۔ انہوں نے طالب علموں کے ایک انقلابی گروپ نیشنل سٹوڈنٹس آرگنائزیشن کو جائن کر لیا جس کے خیالات اور نظریات ان کے اپنے مذہبی اور فیوڈل بیک گراؤنڈ سے ہرگز نہیں ملتے تھے۔

وہاں سے فارغ ہوئے تو 1977ء میں فیصل صالح حیات نے پیپلز پارٹی جائن کر لی۔ پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن جیتا لیکن انہیں پارلیمنٹ میں بیٹھنے کے لیے اس سال انتظار کرنا پڑا کیونکہ جنرل ضیاء نے اس ملک پر مارشل لاء لگا دیا تھا۔

نصرت بھٹو فیصل صالح حیات کو بہت پسند کرتی تھیں کیونکہ وہ مرتضیٰ بھٹو کے کلاس فیلو تھے۔ فیصل کے انکل خالد خان کھرل کمشنر لاڑکانہ تھے اور وہ بھٹو صاحب کے ایک طرح سے فیملی فرینڈ تھے۔ یوں فیصل بھٹو فیملی کے بہت قریب تھے۔

فیصل صالح حیات کے لیے نصرت بھٹو کی پسندیدگی کی وجہ سے ان کا گھر میں آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ بیگم بھٹو ایک زبردست شخصیت کی مالک تھیں اور دل کی بہت اچھی تھیں۔ بینظیر بھٹو اور فیصل صالح تقریباً ایک دوسرے کے ہم عمر تھے لہٰذا ان کی بہت جلد ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگی ہو گئی۔ ان دونوں نے اپنا سیاسی کیریئر بھی ایک ہی پارٹی سے اس وقت شروع کیا تھا جب پارٹی اپنی تاریخ کے بدترین دور سے گزر رہی تھی۔ ان دونوں نے ایک ساتھ سیاست سیکھی خصوصاً جب جنرل ضیاء الحق پوری طاقت سے اس ملک پر حکومت کر رہے تھے۔ دونوں خاندانوں کے سیاسی تعلقات بہت جلد خاندانی تعلقات میں ڈھل گئے۔ بھٹو صاحب بھی فیصل کو پسند کرتے تھے۔ ان دونوں خاندانوں کے درمیان جاری یہ تعلقات اٹھائیس سال بعد اس وقت ختم ہوئے جب فیصل صالح حیات نے 2002ء کے انتخابات کے بعد بینظیر بھٹو کے خلاف یہ کہہ کر بغاوت کی کہ وہ چھوٹے موٹے مفادات کے لیے اسٹیبلشمنٹ کے ہاتھوں میں کھیل رہی تھیں۔ فیصل کے خیال میں ان کے اور پی پی کے درمیان جو چیز مشترک تھی وہ [illegible] اور جمہوریت کی بحالی تھی۔

www.freepdfpost.blogspot.com

allurdupdfnovels.blogspot.com

ایک بات میں نے محسوس کی کہ بینظیر بھٹو کو چھوڑنے کے بعد بھی فیصل کے دل میں ابھی بھی ان کے لیے بے پناہ احترام موجود تھا۔ ان کے خیال میں بینظیر بھٹو ایک شاندار انسان اور لیڈر تھیں۔ ایک ایسی خاتون جو بے پناہ خوبیوں کی مالک تھی۔ تاہم فیصل کے خیال میں بینظیر بھٹو کی سیاست کو سمجھنے کے لیے ضروری تھا کہ ہم 1988ء سے پہلے کی بینظیر بھٹو اور اس کے بعد کی بینظیر کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر کے دیکھیں جس سے یہ سمجھنے میں مدد ملے گی کہ کیسے ایک بہادر بینظیر بھٹو میں ایسی ذہنی تبدیلیاں آ گئی تھیں کہ وہ ایک دن اسٹیبلشمنٹ کے آگے جھک گئیں۔

بینظیر بھٹو یہ بات بھول گئی تھیں کہ لوگ پیپلز پارٹی سے اس لیے پیار کرتے تھے کہ یہ اینٹی اسٹیبلشمنٹ پارٹی تھی۔ یہ ایک ایسی پارٹی تھی جو اپنی اپروچ میں لبرل سیکولر اور ماڈرن تھی اور پاکستان کے لیے ایک جدید جمہوری معاشرے کی خواہاں تھی۔ ان اصولوں کے خواب حاصل کرنے کے رومانس میں پیپلز پارٹی کے ورکرز نے اسٹیبلشمنٹ کے ہاتھوں بے پناہ اذیتیں برداشت کیں لیکن اسٹیبلشمنٹ نے بینظیر بھٹو پر اتنا پریشر ڈالا کہ وہ ان کے ساتھ کمپرومائز کرنے پر تیار ہو گئیں اور یوں ان لوگوں کی آنکھوں میں خواب مرجھا گئے جنہوں نے ان کی تکمیل کے لیے ایک لمبی جنگ لڑی تھی۔

فیصل نے کہا کہ وہ یہ بات مانتے ہیں کہ سیاست میں کمپرومائز کرنا پڑتے ہیں لیکن ایک اچھے سیاستدان کو ایک سیاسی کمپرومائز اور اندھا دھند کمپرومائز میں ایک لکیر کھینچنی پڑتی ہے۔ ہم سیاست میں ساری عمر ہمیشہ ان دونوں کمپرومائزز کے درمیان بیلنس کرتے رہتے ہیں۔ لیڈرز کو کبھی اپنے بنیادی اصولوں اور پالیسیوں پر کمپرومائز نہیں کرنا چاہیے۔ فیصل کے بقول پیپلز پارٹی کو 1988ء میں حکومت نہیں بنانی چاہیے تھی اور یہ بہت بڑی غلطی تھی کیونکہ پیپلز پارٹی نے پہلی دفعہ اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ بہت بڑا کمپرومائز کیا تھا۔ جمہوریت کے لیے اتنے برس قربانی دینے کے بعد اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ اتنا اندھا کمپرومائز پارٹی کو نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اتنے بڑے کمپرومائز کے بدلے میں پیپلز پارٹی کو کچھ بھی نہیں ملا۔ اس وقت کی انتظامیہ نے پیپلز پارٹی کو فری ہینڈ نہیں دیا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے حکومت چلا سکتی۔ پیپلز پارٹی حکومت ہر وقت یہ بات ثابت کرنے میں لگی رہی کہ وہ اینٹی اسٹیبلشمنٹ پارٹی نہیں ہے اور اسی چکر میں وہ اپنے خواب، ویژن اور کمٹمنٹ کھو بیٹھی۔ فیصل نے مجھ سے پوچھا کہ آپ مجھے بتائیں کہ اگر پارٹی قیادت خود ہی اس طرح کے کمپرومائز کر کے ایک مثال قائم کرے گی تو پھر آپ اس پارٹی کے رہنماؤں سے کیا توقع کرتے ہیں کہ وہ اصولوں کی سیاست کریں گے۔

فیصل کے بقول بھٹو ازم اور پارٹی کی نظریاتی بنیادیں اسی دن ہی دفن ہو گئی تھیں جس دن 1988ء میں بینظیر بھٹو نے اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ کمپرومائز کیا تھا۔ اس کمپرومائز سے سارے پارٹی لیڈروں کو یہ پیغام سمجھا گیا کہ پارٹی اب اقتدار میں پہنچنے کے لیے رومانوی سیاست کے بجائے عملی سیاست کرے گی۔ اگرچہ تمام سیاستدانوں کا آخری مقصد اقتدار میں پہنچنا ہوتا ہے لیکن یہ مقصد اگر سیاسی عمل سے حاصل کیا جائے تو بہتر ہے نہ کہ اپنی پارٹی کی کلاسکی کو ختم کر کے جیسا کہ بینظیر بھٹو اور ان کی پارٹی نے کیا تھا۔ جس دن بینظیر بھٹو نے یہ کمپرومائز کیا اسی دن ہی پیپلز پارٹی کا امیج ایک پراگریسو اور لوگوں کی جماعت کے طور پر ختم ہو گیا تھا۔ 1977ء سے لے کر 88ء تک پیپلز پارٹی نے اینٹی اسٹیبلشمنٹ سیاست کی لیکن راتوں رات اس پارٹی نے اتنا بڑا یوٹرن لیا کہ لوگ حیران ہو کر رہ گئے۔ جب آپ نے ایک دفعہ کمپرومائز کر لیا تو پھر اس کے بعد ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا اور پھر چل سو چل۔

فیصل نے دعویٰ کیا کہ وہ ان چند سیاسی ورکروں میں سے ایک تھے جو بینظیر بھٹو کو 1986ء میں پاکستان واپس لائے تھے۔ انہیں اس بات کا اچھی طرح پتہ تھا کہ پیپلز پارٹی نے 1988ء میں کسی کو مجبور کر کے الیکشن نہیں کرائے تھے۔

فیصل کے خیال میں بینظیر بھٹو نے نوابزادہ نصر اللہ خان کے مقابلے میں غلام اسحاق خان کی مدد کر کے دراصل ایم آر ڈی کی تحریک کو دھوکہ دیا تھا جس نے جنرل ضیاء کے مارشل لاء کے خلاف بڑی لمبی جدوجہد کی تھی۔ وہ لوگ جو اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ اس طرح کی اندھی ڈیل کے خلاف تھے انہیں بینظیر بھٹو نے ایک ایک کر کے سائیڈ لائن کر دیا۔ بینظیر بھٹو کے نزدیک اب سیاسی اصولوں کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی کیونکہ 1993ء میں انہوں نے اس غلام اسحاق خان کی مدد کی تھی جس نے 1990ء میں ان کی حکومت کو کرپشن چارجز پر ڈس مس کیا اور ان کی پارٹی کے لیڈروں پر مقدمات بنائے تھے۔ بینظیر بھٹو اس غلام اسحاق خان کے ہاتھوں میں کھیل رہی تھیں جو نواز شریف کو گھر بھیجنا چاہتے تھے۔

فیصل نے اس بات پر دکھ کا اظہار کیا کہ ایک اینٹی اسٹیبلشمنٹ پارٹی آخر میں محلاتی سازشوں کا حصہ بن کر رہ گئی۔

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

باتوں باتوں میں فیصل نے مجھے بتایا کہ بینظیر بھٹو نے 1993ء میں آرمی چیف جنرل وحید کاکڑ کے ساتھ بھی بہت سے کمپرومائزز کیے تھے۔ جو بعد میں ان کی کمپرومائزڈ سیاست کے آئینہ دار بن گئے تھے۔

فیصل ایک کے بعد دوسری کہانی سناتے رہے۔

پارٹی نے ایک اور بہت بڑا غیر ضروری کمپرومائز اس وقت کیا جب پنجاب میں ایک چھوٹے سے سیاسی گروپ کو وزیر اعلیٰ بنا دیا گیا۔ جس گروپ کے لیڈر کو وزیر اعلیٰ بنایا گیا ان کے پاس صرف قومی اسمبلی میں چند سیٹیں تھیں۔ اس سے پہلے پنجاب کے گورنر تھے لیکن ان کے لیڈر، مخدوم الطاف، بینظیر بھٹو کے اور ملک کے لیڈر ہونے کے دعوے دار تھے۔ یہ بینظیر بھٹو کی ایک اور بہت بڑی سیاسی غلطی تھی۔ اگر بینظیر بھٹو انہیں پنجاب میں ایک مضبوط وزیر اعلیٰ کے طور پر لاتیں لیکن کچھ عرصے بعد فیصل نے اس وقت استعفیٰ دے دیا جب انہیں پتہ چلا کہ ان کی اپنی پارٹی کے لوگ ہی ان کی جڑیں کاٹ رہے تھے۔

اگرچہ فیصل صالح حیات کے بارے میں مجھے انہی کیمپ نے اپنے پروفیسر انٹرویو میں یہ کہا تھا کہ وہ محض اقتدار کے بھوکے تھے اس لیے انہوں نے جنرل مشرف کو جوائن کیا تھا۔

جب یہی بات میں نے فیصل صالح حیات سے پوچھی تو وہ بولے کہ جناب اگر ایسی بات ہوتی تو وہ کبھی بھی 1993ء میں پنجاب میں منظور وٹو کی پارٹی سے استعفیٰ نہ دیتے۔ فیصل مجھے بتانے لگے کہ 1988ء سے لے کر اب تک پیپلز پارٹی کی تاریخ ڈیل اور کمپرومائزز سے بھری ہوئی ہے تاکہ ہر قیمت پر اقتدار میں پہنچا جائے۔ فیصل نے اپنے اوپر بھی تنقید کی کیونکہ وہ بھی اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ کیے گئے کمپرومائزز اور ڈیل کا حصہ تھے۔ فیصل کے خیال میں وہ تمام کمپرومائزز محض کچھ عرصے کے لیے مفادات حاصل کرنے کے لیے کیے گئے تھے۔

اب پیٹریاٹ کے نام سے جانے گئے اس گروپ پر یہ الزام لگایا جا رہا تھا کہ وہ اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ مل گئے تھے لیکن ان ڈیلز اور کمپرومائزز کے بارے میں کیا خیال ہے جو بینظیر بھٹو ماضی میں اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ کرتی آئی تھیں۔ فیصل حیران ہو رہے تھے کہ ایک طرف بینظیر بھٹو پیپلز پارٹی کو دنیا کے سامنے اس طرح پیش کر رہی تھیں جیسے یہ ایک لبرل اور سیکولر پارٹی تھی اور دوسری طرف وہ مولانا فضل الرحمان جیسے لوگوں سے سیاسی الائنس کر کے انہیں اپنے دور میں اور اقتدار میں قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی برائے امور خارجہ کا چیئرمین بھی بنا رہی تھیں۔

فیصل نے بڑے طنزیہ انداز میں مجھ سے پوچھا کہ اب آپ ذرا پیپلز پارٹی سے پوچھیں کہ پارٹی کا لبرل امیج اور سیکولرزم کا نعرہ اس وقت کہاں گیا جب مولانا کے ساتھ سیاسی اتحاد کیا جا رہا تھا۔

فیصل نے کہا کہ یہ پیپلز پارٹی ہی تھی جس نے افغانستان میں طالبان پیدا کیے تھے۔ وزیر داخلہ نصیر اللہ بابر نے ان طالبان کی پرورش کی اور انہیں پیسے دیے۔

فیصل نے ایک دفعہ پھر تلخ لہجے میں پوچھا کہ جناب جب یہ طالبان پیدا کیے جا رہے تھے اس وقت پارٹی کا یہ لبرل امیج اور سیکولرزم کا نعرہ کہاں گیا تھا۔ کسی کو اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ طالبان پیپلز پارٹی نے پیدا کیے تھے۔ بینظیر بھٹو اپنے آپ کو مغربی دنیا کے سامنے ایک لبرل اور ماڈرن لیڈر پیش کرتی تھیں جبکہ پاکستان میں وہ مذہبی جماعتوں کے ساتھ مل کر حکومت بناتیں اور بنیاد پرست طالبان کی سرپرستی کرتیں۔

میں نے بات کا رخ موڑا اور فیصل سے پوچھا کہ پیپلز پارٹی کی قیادت پر لگنے والے کرپشن کے الزامات میں کیا حقیقت تھی۔

فیصل نے کہا کہ اس میں کوئی حیرانی کی بات نہیں ہے کیونکہ ان تمام کرپشن کی کہانیوں میں ہر جگہ زرداری فیکٹر موجود تھا۔ سب کو علم تھا کہ ان دنوں پرائم منسٹر آفس میں کیا ہو رہا تھا۔ محترمہ کو چاہیے تھا کہ وہ آصف زرداری کے خلاف ان کرپشن الزامات کو سنجیدگی سے لیتیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ کرپشن کی وہ کہانیاں جھوٹی نکلتیں لیکن یہ وزیر اعظم کا کام تھا کہ وہ ان رپورٹس پر ایکشن لیتیں۔

میں نے فیصل سے پوچھا کہ کیا نواز شریف اور بینظیر بھٹو کی لڑائی نے اس ملک کو ناقابل تلافی نقصان نہیں پہنچایا تو وہ بولے کہ دونوں لیڈر بڑے سیانے تھے اور کئی موقعوں پر انہوں نے ایک دوسرے کے مفادات کا تحفظ کرنے کے لیے کئی خفیہ کام بھی کیے تھے۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے انہوں نے کہا کہ بینظیر بھٹو کی دوسری حکومت میں شہباز شریف پیپلز پارٹی کی حکومت سے باقاعدہ ایک ڈیل کرنے کے بعد ملک سے باہر گئے تھے۔ اسی طرح مارچ 1999ء میں بینظیر کے خلاف عدالتی فیصلہ آنے سے پہلے ہی نواز شریف حکومت نے باقاعدہ ایک ڈیل کے تحت محترمہ کو ملک سے باہر جانے دیا۔

فیصل نے بتایا کہ اگر محترمہ کو جمہوریت سے اتنی ہی محبت تھی تو پھر 12 اکتوبر 1999ء کو جب جنرل مشرف نے اقتدار اپنے قبضے میں لیا انہوں نے اس کا کیوں خیر مقدم کیا تھا۔ تمام لوگوں نے پی پی

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

کیونکہ محترمہ کو ایک سیاسی حکومت کے خاتمے پر ایک جنرل کو خوش آمدید کہتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

فیصل نے کہا کہ باقی باتیں چھوڑیں۔ انہیں تو اس بات کا بھی پتہ ہے کہ محترمہ 12 اکتوبر 1999 سے پہلے ہی جنرل مشرف کے ساتھ ڈیل کرنا چاہ رہی تھیں۔ یہ تو جنرل مشرف تھے جنہوں نے بینظیر کے ساتھ ڈیل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

فیصل نے کہا کہ اگر وہ نیب کے مقدمات کا سامنا کر سکتے تھے تو بینظیر بھٹو کیوں نہیں۔ سپریم کورٹ آف پاکستان نے ہی ان کے بینک لون کیس میں ان کی ضمانت منظور کی تھی اور وہ وزیر ہوتے ہوئے بھی ابھی تک عدالت میں باقاعدگی سے پیش ہو رہے تھے۔

فیصل نے الٹا مجھ سے پوچھا کہ آپ ہی مجھے بتائیں کہ بینظیر بھٹو اس ملک میں رہ کر اپنے خلاف قائم کیے گئے مقدمات کا سامنا کیوں نہیں کر سکتی تھیں۔ فیصل نے کہا کہ جنرل مشرف کے تین سالہ فوجی دور میں انہوں نے تکلیفیں اور مصیبتیں دیکھیں مگر انہوں نے اس کی کوئی شکایت نہیں کی کیونکہ ان کی اپنی پارٹی کے ساتھ کمٹمنٹ تھی۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی سیاسی پارٹی نے تحریک چلا کر جنرل مشرف سے انتخابات نہیں کروائے تھے۔ کسی سیاسی پارٹی کے پاس کوئی سٹریٹ پاور نہیں تھی۔ آپ باقی باتیں چھوڑیں۔ 11/9 کے بعد افغانستان پر امریکہ کے حملے کے بعد بھی جماعت اسلامی چند ہزار سے زیادہ لوگ سڑکوں پر نہیں لا سکی۔ جنرل مشرف نے نئے انتخابات کرانے کا قوم سے وعدہ کیا تھا جو اس نے پورا کیا۔ اس قوم نے جنرل ضیاء الحق کا کیا کر لیا تھا جب اس نے 90 دن میں انتخابات کا وعدہ کر کے 11 سال تک وردی پہن کر اس ملک پر حکومت کی۔

میں ابھی تک نہیں جان سکا تھا کہ آخر فیصل صالح حیات کو کس بات نے مجبور کیا تھا کہ وہ بینظیر بھٹو کا ساتھ چھوڑ کر جنرل مشرف کے ساتھ مل جائیں۔ فیصل صالح حیات کا بینظیر بھٹو کو چھوڑنے کا فیصلہ کوئی عام بات نہیں تھی۔ فیصل اس پارٹی کے لیے کئی سالوں تک شاہی قلعے کی اذیتیں بھگت چکے تھے۔ آخر کچھ تو ہوا ہوگا جس کی وجہ سے فیصل جیسا بندہ بھی اب بینظیر بھٹو سے مایوس ہو کر ایک آمر کی حکومت میں وزیر بننے پر تیار ہو گیا تھا۔

جب اکتوبر 2002ء میں اس ملک میں انتخابات ہوئے تو بینظیر بھٹو نے پارٹی کے لیڈروں کو

ریلیکس کرنے کے لیے دعوت دی تھی۔ فیصل نے محترمہ کو بڑے واضح طور پر یہ بات بتائی کہ وہ سو فیصد اپنے سیاسی کیریئر میں اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ کمپرومائز اور ڈیل کرتی آئی تھیں۔ ایک دفعہ اسی طرح ایک اور ڈیل ہو رہی تھی۔ اسٹیبلشمنٹ بینظیر بھٹو کو سب کچھ دینے کو تیار تھی لیکن اس کے بدلے میں وہ چاہتی تھی کہ بینظیر بھٹو ملک سے باہر رہیں۔ فیصل نے محترمہ کو بتایا کہ پیپلز پارٹی اس پوزیشن میں ہے کہ وہ حکومت بنا سکے اور اس کو ہر حال میں حکومت بنانی چاہیے۔ فیصل نے بی بی سے پوچھا کہ ماضی میں بھی تو وہ بہت سارے ایسے سیاسی گروپوں کے ساتھ مل کر حکومت بناتی رہی ہیں جو انہیں پسند نہیں تھے تو اب کی بار اس میں کیا حرج ہے۔ فیصل کے خیال میں پیپلز پارٹی اور بینظیر بھٹو کے اصل سیاسی دشمن نواز شریف تھے نہ کہ پی ایم ایل کیو۔ فیصل نے بینظیر بھٹو کو وہ تمام نام گنوائے جو نواز شریف کے دور میں جیلوں میں بھیجے گئے۔ یوسف رضا گیلانی، مشتاق اعوان، آصف زرداری ان میں نمایاں تھے۔ یہ نواز شریف ہی تھے جنہوں نے پیپلز پارٹی کو دھوکہ دیا۔ 2 دسمبر 2000ء کو اے آر ڈی کے نام سے بینظیر بھٹو کے ساتھ ایک سیاسی اتحاد بنایا اور ٹھیک آٹھ دنوں بعد جنرل مشرف کے ساتھ ایک خفیہ ڈیل کر کے ملک سے چلے گئے۔ نواز شریف نے بڑی سمجھداری سے پیپلز پارٹی کی سیاسی طاقت کو جنرل مشرف کے ساتھ ڈیل کرنے کے لیے استعمال کیا۔

یہی وجہ تھی کہ فیصل چاہتے تھے کہ پی ایم ایل کیو کے ساتھ ڈیل کرنے میں بہت بڑا فائدہ تھا کیونکہ پی ایم ایل کیو کو کسی نظریے کی بنیاد پر تشکیل نہیں دی گئی تھی۔ اس پارٹی میں وہ لوگ شامل تھے جو اپنی سیٹیں جیت سکتے تھے اور انہیں طاقتور حلقوں نے ایک پارٹی میں اکٹھا کر دیا تھا۔ پیپلز پارٹی بڑے آرام سے اس مخلوط حکومت میں اپنی مرضی سے حکومت کر سکتی تھی۔

فیصل نے بی بی سے پوچھا کہ وہ بتائیں کہ ٹکراؤ کی سیاست کر کے انہوں نے کیا حاصل کر لیا ہے۔ وہ ایک ڈیل کر کے بڑی آسانی سے پاکستان واپس آ سکتی ہیں۔ اس کے کچھ عرصے بعد وہ اپنے کیسز کو بھی عدالتوں سے سیٹل کرا سکتی ہیں جب ان کی اپنی پارٹی اقتدار میں ہوگی۔

فیصل کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ 1988ء میں بینظیر بھٹو نے اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ ٹکراؤ کی سیاست سے گریز کیا تھا لیکن اب وہ جنرل مشرف سے ٹکراؤ کرنے کے موڈ میں تھیں۔ 1988ء میں محترمہ نے ایک بار پاور پالیٹکس کے نظریے پر چلتے ہوئے اقتدار حاصل کیا تھا۔ وہ آنے والے برسوں میں بھی پاور

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

پرویز مشرف کے دور سے کافی کردار ادا کر رہے ہیں۔ حالانکہ پارٹی کے اندر سے بہت سارے ایسے لوگ موجود ہیں جو پارٹی کی بجائے اسٹیبلشمنٹ کے قریب ہیں اور پچھلے کئی برس سے بات کر رہے تھے۔ اب مخدوم امین فہیم پارٹی کے چیئرمین اور اسٹیبلشمنٹ کے [illegible] ہو گئے تھے۔ انہوں نے محترمہ سے کہا کہ وہ دبئی میں رہیں اور جنرل مشرف کی حکومت سے بات چیت کریں اور اس کے بعد وہ پاکستان واپس آئیں۔ فیصل کا کہنا بھی یہی تھا کہ پارٹی سے کوئی بھی ایسا [illegible] جنرل مشرف کو [illegible] پر مجبور کر سکے۔ فیصل نے اس میٹنگ میں یہ بھی کہا کہ محترمہ نے جو بھی عزت حاصل کی تھی وہ انہوں نے اسٹیبلشمنٹ کے خلاف اپنے اندر موجود لڑنے کی صلاحیت سے حاصل کی تھی۔ اب انہیں یہ کیا ہو گیا تھا کہ وہ جیل جانے سے کیوں ڈر رہی تھیں۔

بینظیر بھٹو نے فیصل صالح حیات کی یہ ساری باتیں چپ ہو کر سنیں اور پھر وہ بولنا شروع ہوئیں۔ محترمہ نے کہا کہ فیصل اب وقت بہت بدل گیا ہے۔ اب ان کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ان کے بچوں کا باپ پچھلے سات سال سے جیل میں پڑا ہوا ہے۔ اب اگر وہ بھی جیل چلی گئیں تو ان کے بچوں کا خیال کون رکھے گا۔

فیصل نے بی بی کو جواب دیا کہ محترمہ قوم کے لیڈر ہمیشہ اپنے نہیں اپنی قوم کے بچوں کے لیے سوچتے ہیں۔ انہیں نیلسن منڈیلا اور گاندھی کی قائم کی گئی مثالوں پر غور کرنا چاہیے جن کا وہ اکثر اپنی تقریروں اور تحریروں میں ریفرنس دیتی رہتی ہیں۔ تیسری دنیا کے ممالک میں جمہوریت پسند لیڈروں کو ہمیشہ کچھ قربانیاں دینی پڑتی ہیں اور ایسے ملکوں کے لیڈروں کو جیل جانے سے خوفزدہ ہونے کے بجائے اپنے لوگوں کے لیے لڑنا چاہیے۔

میں نے فیصل سے پوچھا کہ جنرل مشرف بینظیر بھٹو کو کس طرح کی ڈیل آفر کر رہے تھے۔ وہ بولے کہ اس وقت امین فہیم کو وزیراعظم بنایا جا رہا تھا۔ کابینہ کے بہت سارے وزیر پیپلز پارٹی سے لیے جاتے۔ سندھ کا وزیراعلیٰ بھی پیپلز پارٹی کا ہوتا اور پنجاب میں بھی پیپلز پارٹی کے لیڈروں کو [illegible] جنرل مشرف چاہتے تھے کہ بینظیر بھٹو کچھ عرصے کے لیے ملک سے باہر رہیں۔

میں نے فیصل سے پوچھا کہ پھر بینظیر بھٹو نے جنرل مشرف سے ڈیل کیوں نہیں کی تو وہ

[illegible] کو پارٹی [illegible] کے بعد وہ کسی [illegible] کرتی تھیں [illegible] برداشت نہیں کر سکتی تھیں کہ ان کی عدم موجودگی میں پارٹی میں سے کوئی [illegible] ابھرے۔

فیصل نے بتایا کہ امین فہیم میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ بینظیر بھٹو کے سامنے بات کر سکتے۔ انہوں نے بعد میں امین فہیم سے کہا کہ وہ محترمہ سے اس ایشو پر کھل کر بات کریں۔ فیصل نے بھی بینظیر سے کہا کہ اگر وہ ملکی قیادت سے ڈیل کر رہی ہیں تو پھر وہ امین فہیم کو پوری طرح سپورٹ کریں۔ فیصل کی یہ بات سن کر بینظیر بھٹو نے بڑے طنزیہ انداز میں ایک جملہ کہا۔ "You all Makhdooms (Faisal and Faheem) feel and think alike"

فیصل نے بتایا کہ امین فہیم میں اتنی جرأت ہی نہیں تھی کہ وہ محترمہ کے ساتھ کھل کر کسی معاملے پر بات کر سکتے۔ امین فہیم کو اپنی اوقات کا پتہ تھا اور انہوں نے محترمہ کے سامنے کبھی بھی اپنی اوقات سے باہر نکل کر بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔

میں نے فیصل سے پوچھا کہ بینظیر بھٹو جیل جانے سے کیوں خوفزدہ تھیں تو وہ بولے کہ پیپلز پارٹی کے اندر ایک ایسا طبقہ موجود تھا جو یہ نہیں چاہتا تھا کہ محترمہ پاکستان واپس آئیں کیونکہ وہ ان کی عدم موجودگی میں پارٹی کے نام پر چاپلوسی کرتے تھے اور سب سے بڑھ کر وہ پارٹی فنڈز کے نام پر لوگوں سے پیسے اکٹھے کر رہے تھے۔ انہوں نے محترمہ کے ذہن میں بار بار یہ بات بٹھا کر انہیں خوفزدہ کر دیا تھا کہ اگر وہ جیل چلی گئیں تو ان کے پیچھے ان کے بچوں کا خیال کون رکھے گا۔

فیصل نے دبئی میں ہونے والی اس میٹنگ میں بی بی کو یہ بھی بتایا تھا کہ ان کا [illegible] مختلف [illegible] پر کھڑا ہے۔

اگرچہ فیصل نے یہ سب کہہ دیا لیکن ان کا [illegible] کی طرف تھا۔

اکتوبر 2002ء کے الیکشن کے بعد پیپلز پارٹی کی مرکزی [illegible] کے دو اجلاس ہوئے تھے۔ ان اجلاسوں میں کھل کر یہ بات کہی گئی کہ بینظیر بھٹو کے "[illegible]" سے [illegible] پیپلز پارٹی [illegible] پیسے اکٹھے کر رہے تھے۔ [illegible] پیپلز پارٹی کے الیکشن میں استعمال کرنے کے لیے لیے گئے تھے لیکن بعد میں یہ [illegible] بینظیر بھٹو کے "[illegible]" سے [illegible]

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

مجبور کر دیا تھا۔

فیصل نے کہا کہ میں نے بینظیر بھٹو کو واضح طور پر یہ بات کہہ دی تھی کہ میں آپ کی قیادت کو تو تسلیم کرنے کو تیار ہوں لیکن آپ کے ذاتی سٹاف کی قیادت کو نہیں۔

فیصل نے بڑے واضح انداز میں محترمہ کو بتایا تھا کہ آپ ان لوگوں کو پارٹی لیڈروں پر حاوی نہ ہونے دیں جن کا پارٹی کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جن کی پارٹی کے لیے کوئی کنٹریبیوشن نہیں۔ بینظیر بھٹو کے اس ذاتی سٹاف سے سب لوگ نفرت کرتے تھے کیونکہ انہوں نے پارٹی کو یرغمال بنایا ہوا تھا۔

میں نے فیصل سے کہا کہ انہوں نے ابھی تک مجھے یہ نہیں بتایا کہ وہ پارٹی کیوں چھوڑی جس کے لیے وہ شاہی قلعہ کی دیواروں سے سر ٹکراتے رہے تھے۔

فیصل نے ایک نئی کہانی سنائی۔

پیپلز پارٹی میں بیک وقت دو کام چل رہے تھے۔ ایک طرف پارٹی اصولوں کی بات کر رہی تھی اور میڈیا اور عوام کو یہ تاثر دیا جا رہا تھا کہ اس پارٹی سے بڑا اور کوئی شخص اصول پسند نہیں تھا جبکہ دوسری طرف امین فہیم کو بینظیر بھٹو نے یہ ٹاسک دیا ہوا تھا کہ وہ جنرل مشرف سے ڈیل کریں۔ مولویوں پر مشتمل متحدہ مجلس عمل کے لیڈروں سے بھی بات چیت جاری تھی۔

فیصل نے کہا کہ وہ پانچ دفعہ ایم این اے کا الیکشن جیت کر آئے تھے اور ان کی وفاداری اور محنت کا سب کو علم تھا۔ لیکن جب جونیئر لوگوں کو ان کا باس بنا دیا گیا جنہیں پارٹی افیئرز کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا تو ان کے دل میں پہلی دفعہ دراڑ پڑنا شروع ہو گئی تھی۔ ان کے دل میں بڑی دراڑ اس وقت پڑی جب امین فہیم کو بینظیر بھٹو نے یہ پیغام بھیجا کہ انہوں نے جنرل مشرف کے خلاف ایک سخت لائن لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ جب پارٹی کے گروپ نے ان سے یہ بات منوائی کہ جنرل مشرف پیپلز پارٹی کے بغیر اسلام آباد میں نئی سیاسی حکومت نہیں قائم کر سکتے تو فیصل صالح حیات نے فوراً یہ بھانپ لیا کہ اب اس ملک کا سیاسی نظام ڈوبنے والا ہے۔ وہ فوری طور پر اپنے چند دوستوں سے ملے اور انہوں نے پارٹی کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ فیصل اور ان کے دوست اس وجہ سے دوبارہ گھر نہیں جانا چاہتے تھے کیونکہ پیپلز پارٹی میں موجود کچھ لوگ انہیں اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ فیصل اور ان کے

ساتھیوں نے ڈیموکریسی کو بچانے کے نام پر ایک لولی لنگڑی جمہوریت کو ایک شخص کی آمریت پر ترجیح دیتے ہوئے اپنا ایک گروپ بنانے کا فیصلہ کیا۔

میں نے فیصل سے کہا کہ سیکرٹ ایجنسیوں نے پیپلز پارٹی کو توڑنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

فیصل نے بڑی سختی سے میری اس بات کی تردید کی کہ ان پر پریشر ڈال کر ان کی سیاسی وفاداریاں تبدیل کرائی گئی تھیں۔ ان کے بارے میں سب کو علم تھا کہ وہ ایسے سیاستدان نہیں تھے جن پر دباؤ ڈال کر اپنی مرضی کا کوئی کام کرایا جا سکتا تھا۔ وہ ماضی میں کئی دفعہ فوجی آمروں کے خلاف لڑتے ہوئے جیل جا چکے تھے۔ وہ تمام لوگ جنہوں نے پیپلز پارٹی چھوڑی تھی ان کے کردار اور محنت کے بارے میں سب لوگوں کو اچھی طرح علم تھا۔ فیصل تو یہاں تک بھی کہہ گئے کہ جنرل مشرف کے ساتھ پیپلز پارٹی کے سارے لیڈر ڈیل کرنے کے لیے پر تول رہے تھے لیکن ہم نے ڈیل اس لیے کی کہ ہم ایک کمزور سیاسی نظام کو چلتا دیکھنا چاہتے تھے۔

میں نے فیصل سے پوچھا کہ ان کی جنرل مشرف سے پہلی ملاقات کب ہوئی تھی تو وہ بولے کہ جب انہوں نے میریٹ ہوٹل میں اپنا ایک نیا سیاسی گروپ بنانے کا اعلان کیا تو وہ جنرل مشرف سے ملنے کے لیے گئے اور انہیں اپنی حمایت کا یقین دلایا۔

فیصل نے اس بات کو تسلیم کیا کہ وہ ایک باوردی صدر کے حق میں نہیں تھے لیکن اس وقت ملک کی صورتحال کچھ ایسی تھی کہ اس وقت ایک باوردی صدر کا ہونا ضروری تھا۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے فیصل نے کہا کہ وہ جنرل مشرف سے ملنے والے پیپلز پارٹی کے پہلے لیڈر نہیں تھے جو پرویز مشرف سے اس لیے ملاقاتیں کرتے تھے تاکہ نواز شریف حکومت کو گرایا جائے۔ پیپلز پارٹی کے بھی لیڈر جنرل وحید کاکڑ اور جنرل آصف نواز سے بھی ملتے تھے تاکہ نواز شریف حکومت ختم کرائی جا سکے۔ پیپلز پارٹی کے یہ لیڈران تو جنرل جہانگیر کرامت سے بھی ملنے کے لیے آرمی ہاؤس جاتے تھے۔

فیصل نے بتایا کہ پیپلز پارٹی اب منافقوں کی ایک جماعت بن چکی تھی۔ بینظیر بھٹو نے انتخابات سے پہلے جنرل مشرف سے ڈیل کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت کسی کو ایل ایف او کا کوئی خیال نہیں تھا۔ اب جب ان کی ڈیل نہیں ہو سکی تو یہ پارلیمنٹ میں جمہوریت کے بہت بڑے چیمپئن بن کر ابھرے ہیں۔ باقی باتیں چھوڑیں۔ اب متحدہ مجلس عمل کو دیکھ لیں۔ اس کے وزیر اعلیٰ نے ایل ایف او

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!!blogspot!!com!!

کے تحت حلف اٹھایا ہوا ہے۔ صوبوں میں تو پی پی ایم ایل کیو کے ساتھ اقتدار شیئر کیا ہوا ہے اور وہاں انہیں ایل ایف او پر کوئی اعتراض نہیں ہے جبکہ اسلام آباد کی اسمبلی میں انہوں نے آسمان سر پر اٹھایا ہوا ہے۔

فیصل نے کہا کہ اگر محترمہ ایک اصولی لیڈر تھیں تو پھر انہوں نے پی پی پی کے آگے ایک اور پی کیوں لگایا اور یوں اپنی پارٹی کو انتخابات سے پہلے الیکشن کمیشن میں اس کا نام بدل کرا کے رجسٹر کرایا۔

فیصل نے جب یہی بات بینظیر بھٹو سے پوچھی تو محترمہ نے انہیں جواب دیا تھا کہ یہ ایک حکمت عملی کے تحت کیا گیا ہے۔

فیصل نے مجھ سے پوچھا کہ آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ اب اسی حکمت عملی کا مظاہرہ کیوں نہیں کیا جا رہا تھا۔ اگر پی پی 1985ء کے انتخابات کا بائیکاٹ اس وجہ سے کر سکتی تھیں کہ ایک آمر کے تحت ہونے والے انتخابات انہیں قبول نہیں تھے تو پھر 2002ء میں ہونے والے انتخابات میں اسی وجہ سے بائیکاٹ کیوں نہیں کیا گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بینظیر بھٹو ابھی بھی کمپرومائز کر رہی تھیں اور آنے والوں دنوں میں بھی وہ کمپرومائز کریں گی۔ ساری باتیں چھوڑیں۔ بینظیر بھٹو نے تو اپنی پارٹی کو لوکل باڈی الیکشن لڑنے کی اجازت بھی دی اور اب وہ اس سسٹم کے خلاف باتیں بھی کر رہی ہیں۔

فیصل کے بقول ہم لوگوں سے یہ جھوٹ بولتے رہے تھے کہ بینظیر بھٹو 2002ء کے الیکشن سے پہلے پاکستان واپس آئیں گی۔ ہم سب کو پتہ تھا کہ محترمہ نے واپس نہیں آنا تھا۔ ہم پھر بھی تمام لوگوں کے سامنے جھوٹ بولتے رہے اور آخر میں جب وہ نہیں آئیں تو ہم عوام اور میڈیا کے سامنے بیوقوف بن کر رہ گئے۔

فیصل نے کہا کہ بینظیر بھٹو کو یہ سمجھنے کی ضرورت تھی کہ اب پارٹی کو ای میل کے ذریعے نہیں چلایا جا سکتا تھا۔ ان کا پاکستان میں ہونا ضروری تھا۔

میں نے فیصل کو بتایا کہ یہ سننے میں آتا ہے کہ پیپلز پارٹی کی سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی بینظیر بھٹو کو پاکستان آنے سے منع کرتی تھی۔ اسی وجہ سے وہ پاکستان نہیں آ رہی تھیں۔

فیصل مسکرائے اور بولے کہ سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ بینظیر بھٹو کے سامنے سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کی کیا اوقات تھی۔

میں نے فیصل کو ٹوکا اور کہا کہ عام لوگوں میں یہ بھی تاثر ہے کہ شاید پیپلز پارٹی کے اندر جو

پیٹریاٹ گروپ بنایا گیا تھا اس میں بینظیر بھٹو کی مرضی شامل تھی۔

فیصل نے کہا یہ سب جھوٹ ہے، لیکن وہ اس بات پر ابھی بھی قائم تھے کہ یہ گروپ بینظیر بھٹو کی [illegible] مجبور کرنے کے لیے [illegible] لیکن مسئلہ یہ تھا کہ بینظیر واپس آنے کو تیار نہیں تھیں۔

میں نے فیصل سے پوچھا کہ اب جب وہ اس ملک کے وزیر داخلہ ہیں، اگر بینظیر بھٹو واپس آئیں تو کیا وہ انہیں جیل میں ڈالیں گے۔

فیصل نے اس کا بڑا ڈپلومیٹک جواب دیا اور کہا کہ بینظیر بھٹو کے خلاف مقدمات نیب نے قائم کیے ہیں اور اس کا ان کی وزارت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ تمام کیسز بینظیر کے خلاف سیف الرحمن نے نواز شریف کے دوسرے دور اقتدار میں فائل کیے تھے اور آج تک مسلم لیگ نواز کے کسی بھی لیڈر نے پیپلز پارٹی یا بینظیر بھٹو سے معافی نہیں مانگی تھی۔

میں نے فیصل سے کہا کہ اب جبکہ وہ جنرل مشرف کے اقتدار کا حصہ ہیں تو آصف زرداری کو رہا کیوں نہیں کراتے جو ان کے بقول سیف الرحمن کے بنائے ہوئے جھوٹے مقدمات کی وجہ سے جیل میں پڑے ہوئے تھے۔

ایک مجبور فیصل نے ایک دفعہ پھر مجھے روایتی اور ڈپلومیٹک سا جواب دیا کہ وہ اپنی حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ آصف زرداری کا انصاف پر مبنی ٹرائل کیا جائے۔ ایک وزیر داخلہ ہونے کے ناطے وہ زرداری صاحب کو جیل میں جتنی سہولتیں فراہم کر سکتے تھے انہوں نے اپنے اس پرانے دوست کو پہلے ہی فراہم کر دی تھیں۔ وہ بار بار یہ کہتے تھے کہ آصف زرداری کا فیئر ٹرائل ہونا چاہیے۔

فیصل نے اس بات کو تسلیم کیا کہ انہوں نے کمپرومائز کرنے کے بعد ہی پیپلز پارٹی کو چھوڑا تھا۔ وہ کمپرومائز کرنے والے کوئی پہلے اور آخری لیڈر نہیں تھے۔ پوری کی پوری پیپلز پارٹی کمپرومائز کرتی رہی تھی۔

فیصل نے کہا کہ اگر ہم ماضی میں ایک سو دفعہ کمپرومائز کر چکے ہیں تو ایک اور کمپرومائز کرنے میں کیا حرج تھا۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے فیصل نے کہا کہ اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ پارٹی کے لیڈروں کو کمپرومائز کرنا بینظیر بھٹو نے سکھایا تھا۔

فیصل کی یہ مایوس کر دینے والی بات سن کر میں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پاکستان میں

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

سیاسی مفاہمت بالکل ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ فیصل نے بغیر جھجک کے مجھے کہا کہ ہاں، یہ بات درست ہے کہ پاکستان میں سیاسی مفاہمت کی موت واقع ہو رہی تھی۔

فیصل نے کہا کہ ہم سیاسی مفاہمت کی کیا بات کریں جب ماضی میں ایک دوسرے کے کٹر مخالف پیپلز پارٹی پیٹریاٹ اور مسلم لیگ کے لوگ ایک ہی کابینہ میں اکٹھے بیٹھے تھے۔

میں نے فیصل صالح حیات کے انٹرویو کے آخر میں ان سے ایک آخری سوال پوچھا کہ کیا وہ پیپلز پارٹی میں کبھی دوبارہ شامل ہونا پسند کریں گے جس کے لیے انہوں نے کئی برس جیلیں کاٹی تھیں۔ کیونکہ وہ اپنی جوانی کے خوبصورت سال اس پارٹی کو دے چکے تھے تو جنرل مشرف کے اس خوبصورت اور پراسرار وزیر داخلہ نے مجھے جواب دیا کہ اب میں کبھی دوبارہ زندگی میں بے نظیر بھٹو کی پارٹی میں نہیں جاؤں گا۔ اب میری اپنی ایک پارٹی ہے اور اپنی ایک سیاسی طاقت ہے۔

○○○

اس انٹرویو کے چھپنے کے بعد فیصل اور گجرات کے چوہدریوں پرویز الٰہی اور چوہدری شجاعت کے درمیان ٹھن گئی۔ چوہدری پرویز الٰہی نے حسب عادت پنجاب میں ہر اس لیڈر کو تنگ کرنا شروع کر دیا جس کے بارے میں انہیں ذرا سا بھی شک تھا کہ وہ جنرل مشرف کے قریب تھا یا کل کلاں کو ان کے وزیر اعظم بننے کی خواہش کے آگے تھوڑی سی بھی مزاحمت کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ پیپلز پارٹی پیٹریاٹ کے ارکان سب سے زیادہ پرویز الٰہی کے نشانے پر آئے۔ ان کے علاوہ فاروق لغاری، راؤ سکندر اقبال، فیصل صالح حیات، ڈاکٹر شیر افگن خان نیازی، ہمایوں اختر، جہانگیر خان ترین اور دیگر ایسے لیڈر ان تھے جن پر ہر وقت وزیر اعلیٰ پرویز الٰہی کی نظر کرم ضرورت سے زیادہ رہتی۔ تاہم، باقی لیڈروں کے برعکس فیصل صالح حیات ڈٹ کر چوہدریوں کے مقابلے میں کھڑے تھے۔ وہ دوسروں کی نسبت ان چوہدریوں کی کوئی خوش آمد نہیں کرتے تھے۔ فیصل کا خیال یہ تھا کہ جب ان سب کو جنرل مشرف کے دربار سے ہی فیض ملتا تھا تو پھر درمیان میں اپنی قیمت چوہدری پرویز الٰہی اور چوہدری شجاعت حسین جیسے پاور بروکر سے کیوں لگوائی جائے۔ اگر خوشامد کرنی ہی ہے تو جنرل مشرف کی کیوں نہ کی جائے۔ چوہدریوں کو فیصل کی اس عادت سے بڑی چڑ تھی۔ فیصل انہیں اس وجہ سے بھی ناپسند تھے کہ

ان کے پاس وزارت داخلہ کا قلمدان تھا جو نواز شریف کے پچھلے ادوار میں ہمیشہ چوہدری شجاعت کے پاس رہتا تھا۔ شاید اسی وزارت کی بدولت چوہدری شجاعت حسین کو مشکل ترین حالات میں بھی گجرات اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں سے ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو یورپ اور دیگر ملکوں میں بھجوانے کا موقع ملا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ چوہدری شجاعت کو فیصل کی موجودگی میں وزارت داخلہ کا استعمال کرنے کا موقع نہیں مل پا رہا تھا جو ماضی میں میسر تھا۔ چوہدری شجاعت کو فیصل کو نیچا دکھانے کا سب سے بڑا موقع اس وقت ملا جب جنرل پرویز مشرف نے میر ظفر اللہ جمالی کو ہٹا کر چوہدری شجاعت کو چند ماہ کے لیے نگران وزیر اعظم بنایا تاکہ شوکت عزیز الیکشن جیت کر ان کی جگہ لے سکیں۔ انہی دنوں ایک کالم نگار نذیر ناجی صاحب نے لاہور سے ایک کالم لکھا جس میں انہوں نے اس بات کا انکشاف کیا تھا کہ سابق وزیر داخلہ شاید انسانی سمگلنگ میں ملوث تھے اور برطانیہ نے حکومت پاکستان کو اس بارے میں ایک باقاعدہ خط لکھا تھا۔ اس کالم کا یہ فائدہ ہوا کہ فیصل صالح حیات کو دوسری دفعہ وزارت داخلہ نہیں ملی۔ جب شوکت عزیز نے نئی کابینہ بنائی تو انہیں وزیر ماحولیات بنا دیا گیا۔ فیصل صالح حیات بھی چوہدری نثار علی خان کی طرح ہیں۔ ان کے بارے میں کوئی ایسی چیز چھپ جائے جو انہیں پسند نہ ہو تو وہ بھی جب تک اس کا جواب نہ دے دیں آرام سے نہیں بیٹھتے۔

شوکت عزیز کی کابینہ بننے سے ایک دن پہلے فیصل صالح حیات کا مجھے فون آیا۔ وہ اس مسئلے پر اپنا انٹرویو دینا چاہ رہے تھے۔ انہوں نے اس انٹرویو میں گجرات کے چوہدریوں پر شدید حملے کیے اور مجھے ان پولیس آفیسروں کے نام دیئے جنہیں انہوں نے وزیر داخلہ کے طور پر ایف آئی اے سے انسانی سمگلنگ کے الزامات پر نکالا تھا اور اگلے روز ہی پنجاب حکومت نے انہیں صوبے میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز کر دیا تھا۔ فیصل نے اس انٹرویو میں پوری تفصیلات بتائیں کہ کیسے چوہدری صاحبان بھی اس انسانی اسمگلنگ میں ملوث رہے تھے۔

جونہی اگلی صبح یہ انٹرویو چھپا، دوپہر کے وقت مجھے فیصل صالح حیات کا فون آیا۔ وہ بڑے اچھے موڈ میں تھے اور بولے کہ ابھی صدر مشرف سے مل کر آ رہا ہوں۔ ان کے موڈ سے لگتا تھا کہ بات بڑی اچھی رہی تھی۔ صدر نے اس بات پر خفگی کا اظہار کیا تھا کہ انہیں دی نیوز کو انٹرویو دینے کی کیا ضرورت تھی کیونکہ اس سے ان کی حکومت میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے ایک دوسرے سے اختلافات بڑھ

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!!blogspot!!com!!

رہے تھے۔

2008ء کے الیکشن کے بعد فیصل صالح حیات چپ کر کے بیٹھنے والے نہیں تھے۔ اب انھیں بھی پارلیمنٹ میں نئی دشمنیوں کی تلاش تھی۔ [illegible]

[illegible]

ایک بات طے تھی کہ فیصل صالح حیات اور راجہ پرویز اشرف میں اب سیاسی سے زیادہ ذاتی دشمنی بن چکی تھی۔

فیصل صالح حیات کو راجہ پرویز اشرف پر ایک طاقتور حملہ کرنے کا موقع جون 2010ء میں اس وقت ملا جب بجٹ پر بحث کے دوران فیصل نے ایک دفعہ پھر راجہ پرویز اشرف کی مبینہ کرپشن کی کہانیاں دوبارہ شروع کیں۔ وزیراعظم یوسف رضا گیلانی بھی اس وقت قومی اسمبلی میں موجود تھے۔ فیصل صالح حیات نے بہترین موقع جانا اور کہا کہ راجہ پرویز اشرف پر کرپشن کی سٹوریاں … فائل کی تھیں۔ فیصل نے اس پر بس نہیں کیا بلکہ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے انھوں نے یہ کہا کہ رؤف کلاسرا وہی ہیں جنھوں نے وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کی کتاب "چاہ یوسف سے صدا" لکھی تھی۔ فیصل کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ جس رپورٹر نے گیلانی صاحب کی اپنی کتاب لکھی تھی وہ جھوٹی خبر کیسے دے سکتا ہے۔

اس پر یوسف رضا گیلانی صاحب کھڑے ہوئے۔ انھوں نے راجہ پرویز اشرف پر کرپشن کے الزامات پر تو کچھ نہیں کہا تاہم اپنی صفائی دیتے ہوئے انھوں نے ضرور کہا کہ یہ بات درست ہے کہ رؤف کلاسرا ان کے ذاتی دوست ہیں۔ جب وہ جیل میں تھے تو وہاں سے ملنے جاتے تھے لیکن انھوں نے اپنی کتاب خود لکھی ہے۔

گیلانی صاحب کی یہ بات درست تھی کہ انھوں نے اپنی آپ بیتی خود لکھی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ میں ان کی آپ بیتی کا انگریزی میں ترجمہ کروں۔

اس کے بعد فیصل نے قومی اسمبلی میں پھر راجہ پرویز اشرف کو اس وقت آڑے ہاتھوں لیا جب وزیر موصوف نے ان کی … سے پہلے کی گئی تقریر کے حوالے دینے کی کوشش کی۔ راجہ پرویز اشرف نے فیصل صالح حیات پر بھی کرپشن کے … الزامات لگائے جس پر فیصل نے ایک … کی طرح اس پوری کہانی کو … دیا اور قومی اسمبلی میں کھڑے ہو کر کہا کہ جناب! آپ پر کرپشن کی سٹوریاں رؤف کلاسرا نے فائل کی ہیں۔ میں نے تو صرف انھیں پارلیمنٹ میں کھڑے ہو کر پڑھا ہے۔

اس پر راجہ پرویز اشرف نے کہا کہ وہ رپورٹر جس کا آپ نام لے رہے ہیں وہ تو … ہے۔

www.freepdfpost.blogspot.com

allurdupdfnovels.blogspot.com

بھلا فیصل جیسا سمجھدار سیاستدان اس موقع کو کیسے ضائع جانے دیتا۔ وہ مسکراتے ہوئے کھڑے ہوئے اور بولے کہ جناب! یہ بڑی عجیب سی بات ہے کہ جس رپورٹر کے بارے میں آپ کہہ رہے ہیں کہ وہ بلیک میلر ہے اس کے بارے میں دو دن پہلے ہی آپ کے وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے اسی جگہ کھڑے ہو کر فرمایا تھا کہ وہ ان کا ذاتی دوست ہے۔ کیا اس سے یہ سمجھا جائے کہ یوسف رضا گیلانی صاحب اپنے وزیروں کے خلاف خود ہی خبریں لگوا رہے ہیں۔

اس کے بعد رحمٰن صاحب کی حالت دیکھنے والی تھی اور فیصل صالح حیات مسکراتے ہوئے قومی اسمبلی کے ہال سے باہر نکل گئے۔

امین فہیم

اکتوبر 2002ء کے الیکشن کے بعد امین فہیم کو پہلی دفعہ یہ یقین ہو گیا تھا کہ اگر وہ اب کی دفعہ وزیراعظم نہ بنے تو پھر وہ کبھی نہیں بن سکیں گے۔ اس سے بہتر موقع ان کی زندگی میں نہیں آ سکتا تھا۔

پیپلز پارٹی قومی اسمبلی کے انتخابات میں پی ایم ایل کیو کے بعد زیادہ سیٹیں لے چکی تھی۔ پی ایم ایل کیو کو ہاؤس میں سادہ اکثریت نہیں مل سکی تھی۔ حکومت بنانے کے لیے ضروری تھا کہ جنرل پرویز مشرف پیپلز پارٹی کے ساتھ ایک نیا سیاسی اتحاد تشکیل دیں۔ اگر پیپلز پارٹی اس اتحاد میں شریک ہونے سے انکار کرتی تو پھر جنرل مشرف کو پارلیمنٹ توڑ کر نئے سرے سے الیکشن کرانا پڑتے۔ یہی وجہ تھی کہ جنرل پرویز مشرف ہر قیمت پر پیپلز پارٹی کے ساتھ اتحاد کر کے امین فہیم کو وزیراعظم بنانے پر تیار ہو گئے۔ اب صرف بینظیر بھٹو کی ایک چھوٹی سی ہاں کی ضرورت تھی۔ بینظیر بھٹو نے امین فہیم کو لندن بلا لیا تھا۔ اس ملاقات میں یہ طے ہونا تھا کہ بینظیر بھٹو امین فہیم کو وزیراعظم بنانے پر تیار تھیں یا نہیں۔

لندن جانے سے قبل آئی ایس آئی کے افسران کے ساتھ امین فہیم کی ملاقاتیں بڑھ گئی تھیں۔ ایک مرحلہ تو یہ بھی آیا کہ ان مذاکرات میں آصف علی زرداری بھی شامل ہو گئے اور اس وقت کے ڈی جی آئی ایس آئی جنرل احسان الحق اور ڈپٹی ڈی جی آئی ایس آئی میجر جنرل احتشام ضمیر کے ساتھ خفیہ ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔

www.freepdfpost.blogspot.com

allurdupdfnovels.blogspot.com

ایک رات امین فہیم آصف زرداری کو پمز ہسپتال کے کمرے سے اس طرح چوری چھپے آئی ایس آئی کے جرنیلوں سے ملانے لے گئے کہ سیکیورٹی پر تعینات گارڈز کو بھی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ یہ ملاقات اتنی خفیہ رکھی گئی تھی کہ اس کا بینظیر بھٹو کو بھی علم نہیں تھا۔ کسی کام سے بینظیر بھٹو نے آصف زرداری کو واشنگٹن سے کال کیا تو ان کا فون بند ملا۔ ایک دو اور لوگوں سے بی بی نے پوچھنے کی کوشش کی تو بھی انہیں کامیابی نہ ہوئی۔ بینظیر بھٹو کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ سمجھیں کہ جنرل مشرف نے ان کے خاوند کو ہسپتال سے اغوا کرا لیا ہے اور زرداری صاحب کی جان خطرے میں ہے۔ زرداری صاحب کو اغوا کر کے جنرل مشرف ان پر اپنی مرضی کی ڈیل مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ اسی پریشانی کے عالم میں بینظیر بھٹو نے واشنگٹن میں مشہور صحافیوں شاہین صہبائی، خالد حسن، انور اقبال اور دیگر کو فون کر کے آصف زرداری کے اغوا کی خبر دینا شروع کر دی۔ ساتھ میں یہ بھی کہا کہ اگر آصف زرداری کو کچھ ہوا تو اس کے ذمہ دار جنرل پرویز مشرف ہوں گے۔

پاکستان میں اس وقت رات کے بارہ بج چکے تھے۔ میں ابھی بھی اپنے دفتر میں موجود تھا۔ اچانک ایم ایس این میسنجر پر شاہین صہبائی صاحب، جو واشنگٹن میں تھے، نے مجھے ہیلو کہا اور بولے روف تمہارے لیے ایک بہت بڑی خبر ہے۔ اگر تم چاہو تو یہ کل صبح کی تمہاری لیڈ سٹوری بن سکتی ہے۔ وہ مجھے بتانے لگے کہ بینظیر بھٹو اس وقت شدید پریشان ہیں کیونکہ آصف زرداری پمز ہسپتال کے کمرے سے غائب ہو چکے ہیں اور کسی کو کوئی علم نہیں کہ انہیں کون وہاں سے اغوا کر کے لے گیا ہے۔

میں یہ خبر سن کر واقعی چونک گیا۔ شاہین صاحب سے دو چار اور تفصیل لیے۔ کہیں سے آصف زرداری صاحب کے ساتھ رہنے والے ڈاکٹر قیوم سومرو کا موبائل نمبر لیا۔ ڈاکٹر قیوم سے گفتگو کر کے مجھے احساس ہوا کہ انہیں پتہ تھا کہ زرداری صاحب کو کون کہاں لے گیا ہے۔ دراصل بینظیر بھٹو کو آصف زرداری اور امین فہیم دونوں کے فون بند مل رہے تھے لہٰذا وہ پریشان ہو گئی تھیں اور جلد بازی میں انہوں نے صحافیوں کو فون کرنا شروع کر دیے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد بینظیر بھٹو کو یہ پیغام پہنچ گیا تھا کہ زرداری صاحب اس وقت جنرل احسان سے ملاقات کر رہے ہیں اور مستقبل کی حکومت اور وزیراعظم کے نام پر مذاکرات ہو رہے ہیں۔ اب بینظیر بھٹو پچھتا رہی تھیں کہ انہوں نے کیوں اتنی جلدی صحافیوں کو فون کرنا شروع کر دیا تھا جس سے بات تھوڑی سی بگڑ گئی تھی۔

تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

میں نے فوری طور پر اس کی خبر بنائی جو اگلے دن دی نیوز کی لیڈ سٹوری لگی جس سے عام پبلک اور سیاسی لیڈروں کو احساس ہوا کہ مذاکرات اب بہت سنجیدہ مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں اور اسی کے لیے آصف زرداری کو آئی ایس آئی کے سیف ہاؤس میں رات کے اندھیرے میں جنرل احسان اور دیگر جرنیلوں سے ملاقات کے لیے لے جایا گیا تھا۔

اس ملاقات میں ہی جنرل مشرف کے جرنیلوں نے بینظیر بھٹو کو یہ آفر دی تھی کہ وہ امین فہیم کو پاکستان کا وزیراعظم بننے دیں۔ چوہدری شجاعت حسین کے ساتھ مل کر ایک کابینہ بنے گی جس میں پیپلز پارٹی کو بھی حصہ دیا جائے گا۔ سندھ کی وزارت اعلیٰ بھی پیپلز پارٹی کو دی جائے گی۔ پنجاب میں چوہدری حکمرانی کریں گے لیکن وہاں بھی پیپلز پارٹی کو کچھ وزارتیں دی جا سکتی ہیں۔ صوبہ سرحد مولویوں کے حوالے کر دیا تھا جبکہ بلوچستان میں پی ایم ایل کیو اور مولویوں نے مل کر حکومت بنانی تھی۔ یوں جنرل مشرف بڑی سمجھداری سے ماسوائے نواز شریف کی پارٹی کے تمام سیاسی جماعتوں کو اپنے ساتھ اقتدار شیئر کرانے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ نواز شریف کی جماعت صرف اپوزیشن میں رہ جاتی اور بھلا بیس کے قریب ایم این اے 342 کے ہاؤس میں جنرل مشرف کے لیے کیا مسائل پیدا کر سکتے تھے۔ نواز شریف اور بینظیر بھٹو ملک سے باہر تھے اور یوں جنرل مشرف کے اقتدار کو دور دور تک کہیں سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

جنرل مشرف نے اپنے تئیں ایک بڑا خوبصورت پلان بنایا تھا لیکن اس کا سارا دارومدار بینظیر بھٹو اور مخدوم امین فہیم کی لندن میں ہونے والی ملاقات پر تھا۔

لندن جا کر امین فہیم نے بینظیر بھٹو کے سامنے یہ سارا پلان رکھا اور بتایا کہ جنرل صاحب انہیں وزیراعظم بنانا چاہتے ہیں۔ ان کی یہ بھی شرط تھی کہ بینظیر بھٹو تین سال تک پاکستان واپس نہیں آئیں گی۔

بینظیر بھٹو مسکرائیں اور انہوں نے امین فہیم جنہیں وہ سیکرٹ ایجنسیوں اور جنرل مشرف سے مذاکرات کے لیے استعمال کر رہی تھیں سے پوچھا کہ مخدوم صاحب! مجھے یہ تو بتائیں کہ اس پوری ڈیل میں میرے لیے کیا ہے؟

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

امین فہیم چپ رہے۔

بینظیر بھٹو کو ساری گیم سمجھ میں آ چکی تھی۔ جنرل مشرف سب کچھ اپنے لیے لینا چاہ رہے تھے۔ بینظیر بھٹو ان کے خاوند آصف زرداری کو جیل سے رہا کر کے دبئی بھیجنے کی آفر کر کے وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ پیپلز پارٹی کو اتنے بڑے تعاون کے نتیجے میں اس کی ساری قیمت ادا کر رہے تھے۔

یوں بینظیر بھٹو کے لیے اس پوری ڈیل میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کے لیے وہ جنرل مشرف کی شرائط ماننے پر تیار ہو جاتیں۔ یوں یہ ڈیل لندن میں ہی دم توڑ گئی تھی۔

اس کے بعد جنرل مشرف کے لیے دو آپشن رہ گئے تھے۔ یا تو وہ اسمبلیاں توڑ دیں اور نئے الیکشن کرائیں یا پھر پیپلز پارٹی کو توڑ دیں۔ نئے الیکشن کرانا اتنا آسان کام نہیں تھا۔ چند دنوں میں جنرل مشرف کی سیکرٹ ایجنسیوں نے پیپلز پارٹی توڑ دی۔ جو کام جنرل ضیا نہیں کر سکے تھے وہ جنرل مشرف نے کر دکھایا۔

جب میری امین فہیم سے اپریل 2003ء میں پیپلز پارٹی کے زیرو پوائنٹ پر واقع میڈیا سنٹر میں ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے یہی سوال پوچھا کہ آپ کی سیکرٹ ایجنسی کے لوگوں سے خفیہ ملاقاتوں پر بہت سے لوگوں کو اعتراضات تھے اس کے باوجود بھی آپ وزیراعظم نہیں بن سکے۔

امین فہیم بولے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اکتوبر کے انتخابات کے بعد اس ملک کا نیا وزیراعظم بن رہے تھے۔ حتیٰ کہ ایک پیغام بھی انہیں پہنچا دیا گیا تھا کہ اگر یہ مذاکرات کامیاب ہو گئے تو وہ اپنے آپ کو وزیراعظم سمجھیں۔

تو پھر کیا ہوا؟

امین فہیم کا خیال تھا کہ بعد میں بہت سے لوگوں نے ان کے خلاف سازش کی تھی۔ انہوں نے جنرل مشرف کے کانوں میں یہ بات ڈال دی تھی کہ وہ بینظیر بھٹو کے بہت قریب ہیں اور اگر انہیں وزیراعظم بنا دیا گیا تو وہ [illegible] ان سے ہدایات لے کر اپنی حکومت چلائیں گے۔ یوں بینظیر بھٹو [illegible] بار بار جنرل مشرف کے کانوں میں ڈالا گیا [illegible] جنرل مشرف کے ذہن سے نہیں نکال سکے۔

اگرچہ امین فہیم اقتدار کے بہت قریب سے [illegible] لیکن پھر بھی ان کے ذہن میں پیپلز پارٹی چھوڑ کر

جنرل مشرف کو جائن کرنے کا خیال نہیں آیا۔

پیپلز پارٹی کے ساتھ اپنی وابستگی کا اظہار کرنے کے لیے امین فہیم نے مجھے ایک لمبی کہانی سنائی۔

امین فہیم ذوالفقار علی بھٹو سے اس وقت ہی متاثر ہو گئے تھے جب وہ پہلی دفعہ ان سے راولپنڈی میں ملے تھے۔ بھٹو صاحب اس وقت جنرل ایوب خان کی کابینہ میں وزیر خارجہ تھے۔ امین فہیم کا خیال تھا کہ بھٹو صاحب جیسے بندے کے پاس ایک نوجوان کے لیے ٹائم نہیں ہوگا۔ جب وہ بھٹو صاحب سے ملنے کے لیے ان کے دفتر پہنچے اور انہیں بتایا گیا کہ مخدوم طالب المولا کا بیٹا ان سے ملنے کے لیے آیا ہے تو وہ اپنے دفتر سے باہر کر انہیں ریسیو کرنے آئے۔ انہوں نے ایک بہت ضروری میٹنگ کینسل کر دی تاکہ وہ انہیں ٹائم دے سکیں۔

ایک نوجوان مخدوم کے لیے یہ بہت بڑی بات تھی کہ بھٹو صاحب جیسا لیڈر سارے کام چھوڑ کر ان کے پاس بیٹھا تھا۔ امین فہیم بھٹو صاحب کے اس انداز کو کبھی نہ بھول سکے۔ یہ بات صرف یہیں ختم نہیں ہوئی۔ امین فہیم کے والد مخدوم طالب المولا جب بھی اسلام آباد قومی اسمبلی کے اجلاس میں آتے تو اپنے ساتھ امین فہیم کو ضرور لاتے۔ امین فہیم وزٹرز گیلری میں بیٹھے ہوتے۔ جونہی اجلاس ختم ہوتا بھٹو صاحب سیدھے وہاں سے امین فہیم کی طرف آتے اور ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر نہ صرف ان سے باتیں کرتے بلکہ باہر بھی لے جاتے۔

ایک دن امین فہیم لندن میں تھے کہ انہیں بھٹو صاحب کا پیغام آیا۔ انہوں نے اس نوجوان کو بلایا اور بتایا کہ وہ ایک سیاسی پارٹی بنانا چاہتے ہیں۔ بھٹو صاحب نے اپنی نئی پارٹی کے بارے میں گفتگو شروع کی۔ امین فہیم کا ذہن کسی اور سائیڈ پر تھا کیونکہ آج انہوں نے [illegible] [illegible] امین فہیم کے ساتھ ان کے [illegible] انہوں نے اپنے کزن کو ہوٹل کے باہر کھڑا کر رکھا تھا کہ وہ بھٹو صاحب سے [illegible] کر کے واپس آ جائیں گے [illegible] بھٹو صاحب اپنی نئی پارٹی کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ جب یہ میٹنگ ختم ہوئی تو بھٹو صاحب نے امین فہیم سے کہا کہ آپ کے ساتھ یہ ساری گفتگو کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے والد کو میرا [illegible]

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

پارٹی میں لے کر آئیں گے۔

امین فہیم نے بھٹو صاحب سے وعدہ کر لیا۔

امین فہیم بھٹو صاحب کے ڈریس سے بہت متاثر تھے اور یہ جاننا چاہتے تھے کہ وہ اپنے کپڑے کہاں سے خریدتے ہیں۔ بھٹو صاحب نے امین فہیم کو ہانگ کانگ میں ایک چینی شاپ کے بارے میں بتایا کہ جب بھی وہاں جاؤ تو شرٹس وہاں سے خریدنا اور ہاں، میرے لیے بھی لانا نہ بھولنا۔ بھٹو صاحب اپنے جوتے لندن سے خریدتے تھے اور بھی انہوں نے کسی سنگل شاپ سے ٹائی نہیں خریدی تھی۔

جب امین فہیم نے پاکستان واپس آ کر اپنے باپ سے بات کی کہ وہ بھٹو کی پارٹی کو جائن کریں تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ وہ خود ایک بہت بڑے فیوڈل تھے۔ وہ بھلا کسی اور فیوڈل کی پارٹی میں شامل کیوں ہوتے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ پیدائشی مسلم لیگی تھے اور کسی مسلم لیگی کے لیے اپنی سیاسی وابستگیاں تبدیل کرنا مناسب نہیں تھا۔

امین فہیم اصرار کرتے رہے کیونکہ وہ بھٹو صاحب سے وعدہ کر چکے تھے۔

امین فہیم اپنے باپ کو اس بات پر قائل کرنے میں لگے رہے کہ نئی سیاسی پارٹی جائن کرنے سے انہیں کیا کیا فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔ آخر کار انہوں نے اپنے باپ کو قائل کر لیا۔

امین فہیم نے بھٹو صاحب کو پیغام بھیجا کہ ان کا مشن پورا ہو گیا ہے۔

بھٹو صاحب نے فوری طور پر غلام مصطفیٰ جتوئی اور پیر غلام رسول جیلانی کو مخدوم آف ہالا بھیجا تا کہ وہ طالب المولا کو نئی پارٹی جائن کرنے کی دعوت دے سکیں۔ مخدوم طالب المولا کی پیپلز پارٹی میں شمولیت پر بہت خوشیاں منائی گئیں کیونکہ بھٹو صاحب کا خیال تھا کہ ہالا کے مخدوموں کے پارٹی میں شامل ہونے سے انہوں نے سندھ میں تقریباً آدھی سے زیادہ سیاسی جنگ جیت لی ہے۔

ابھی پیپلز پارٹی کو بنے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ ملک میں ہونے والے نئے انتخابات میں الیکشن میں حصہ لینے کے مسئلے پر پارٹی میں دو دھڑے بن گئے۔ پارٹی کے اندر ایک ایسا گروپ تھا جو کمٹڈ سوشلسٹ لیڈروں پر مشتمل تھا جس میں ڈاکٹر مبشر حسن، جے رحیم، معراج محمد خان، شمیم خان اور میر علی احمد تالپور جیسے لوگ شامل تھے۔ وہ روس اور چین کی طرز پر انقلاب لا کر اقتدار میں آنے کے حق میں تھے۔ وہ اس بات کے خلاف تھے کہ پیپلز پارٹی کو انتخابات میں حصہ لینا چاہیے۔

دوسرا گروپ جس کی قیادت مخدوم آف ہالا کر رہے تھے، وہ انتخابات میں حصہ لینے کے حامی تھے۔

بھٹو صاحب نے مخدوم آف ہالا کی حمایت کر دی اور یوں انتخابات لڑنے کا فیصلہ کیا گیا۔

بھٹو صاحب نے اپنی انتخابی مہم سندھ سے شروع کی اور امین فہیم کو اپنے ساتھ رکھا۔ وہ ہر جگہ بھٹو صاحب کے ساتھ جلسے جلوسوں میں شریک ہوتے رہے۔

جب الیکشن کا رزلٹ آیا تو سب لوگ ششدر رہ گئے۔ امین فہیم کا خیال تھا کہ ان کا کام ختم ہو گیا تھا۔ وہ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے جاپان چلے گئے۔ وہ ابھی دنیا گھومنا پھرنا چاہتے تھے۔

امین فہیم ابھی اپنی نئی منزل پر پہنچے ہی تھے کہ انہیں جام صادق علی کی کال آئی۔ بھٹو صاحب چاہتے تھے کہ امین فہیم ان کی ایک خالی کی ہوئی نشست پر ضمنی انتخابات میں حصہ لیں۔ شروع میں امین فہیم نے مزاحمت کی تاہم واپس آ کر الیکشن لڑا اور جیت گئے۔ انہیں سندھ کے گورنر ممتاز بھٹو کا فوڈ اور ایگریکلچر ایڈوائزر مقرر کیا گیا۔ کچھ عرصے بعد امین فہیم کو اسلام آباد لے آیا گیا جب بھٹو صاحب اس ملک کو نیا آئین بنانے کی تیاریوں میں مصروف تھے، وہ آئین بننے کے تمام مراحل میں شریک رہے۔ بھٹو صاحب نے انہیں وزیر مملکت برائے کیبنٹ ڈویژن اور پارلیمانی امور بنا دیا۔

میں اس دوران خاموشی سے بیٹھا یہ سب کچھ سنتا رہا تھا۔ جونہی امین فہیم نے پیپلز پارٹی کے ساتھ شروع کیے گئے اپنے سیاسی سفر کی کہانی ختم کی، میں نے ان سے پوچھا کہ سیاست میں اتنا اچھا سٹارٹ لینے کے باوجود بھٹو صاحب کا اتنا برا انجام کیوں ہوا؟

امین فہیم شاید اتنی جلدی اس سوال کی توقع نہیں کر رہے تھے۔ وہ خاصی دیر خاموش رہے۔ اپنے آپ کو تھوڑا سنبھالا اور پھر انہوں نے بولنا شروع کیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بیرونی طاقتوں نے بھٹو صاحب پر اپنا دباؤ بڑھانا شروع کر دیا تھا۔ ملکی معاملات چلانے کے لیے بھٹو صاحب کو چند غلط مشورے بھی دیے گئے۔ دراصل وہ لوگ بھٹو صاحب کے اس انجام کے ذمہ دار تھے جو شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار تھے۔

میں نے امین فہیم سے ان لوگوں کے نام پوچھنے کی کوشش کی لیکن وہ یہ بتانے کے لیے تیار نہیں ہوئے اور کہنے لگے کہ اب وہ اپنے دوستوں کو ناراض نہیں کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو پہلے ہی

www.freepdfpost.blogspot.com

فوت ہو چکے تھے۔

امین فہیم کا خیال تھا کہ دو چیزیں بھٹو صاحب کے خلاف گئیں۔ پہلی بات تو یہ کہ جس نے بھی بھٹو صاحب کو وقت سے پہلے 1976ء میں نئے انتخابات کرانے کا مشورہ دیا تھا اس نے ان کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ پیپلز پارٹی کی حکومت کا ابھی ایک سال باقی تھا۔ ہر چیز بڑے اچھے طریقے سے چل رہی تھی۔ ملک میں نئے انتخابات کا اعلان کر کے خواہ مخواہ ایک پنڈورا باکس کھول دیا گیا جس کے بوجھ تلے آ کر بھٹو صاحب کی جان چلی گئی۔ دوسرے یہ کہ جن لوگوں نے بھٹو صاحب اور پارٹی کے بغیر لوگوں کو بلا مقابلہ کامیاب کرایا تھا انہوں نے بھی بھٹو صاحب کے ساتھ کوئی اچھا کام نہیں کیا تھا بلکہ ایک طرح سے انہوں نے بھٹو صاحب کے زوال کی بنیاد رکھ دی تھی۔

میں نے کہا کہ امین فہیم صاحب! بھٹو صاحب ایک بڑے لیڈر تھے۔ انہوں نے کیوں اس طرح کا مشورہ قبول کر لیا اور اپنے آپ کو بلا مقابلہ کامیاب کرایا؟

امین فہیم نے فوراً [illegible] بات نہیں تھی۔ بھٹو صاحب نے اس طرح کی کوئی [illegible]

[illegible]

دیا گیا۔

بھٹو صاحب کو پھانسی دی جا چکی تھی۔ اکثریت کا خیال تھا کہ اب پیپلز پارٹی ختم ہو جائے گی۔ پوری پارٹی تتر بتر ہو چکی تھی۔ بھٹو کے وفاداروں کو سندھ میں تشدد اور موت کے گھاٹ اتارا جا رہا تھا۔ ہزاروں لوگوں پر زندگیاں تنگ کر دی گئی تھیں۔ ان کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ بھٹو سے محبت کرتے تھے۔

امین فہیم کے اپنے دو بھائیوں مخدوم خلیق الزماں اور رفیق الزماں کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ جنرل ضیاء کا وہ بدترین دور تھا، تاہم مخدوم فیملی ضیاء کے آگے نہیں جھکی۔ ایک مرحلے پر جنرل ضیاء نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ مخدوموں سے تنگ آ چکے ہیں اور اب وہ مخدوم آف ہالا کو اپنے ساتھ ملانا چاہتے ہیں [illegible] جنرل ضیاء سندھ میں نئے سیاسی دوست بنانا چاہتے تھے۔

بریگیڈیئر امتیاز ان دنوں سندھ میں آئی ایس آئی کے انچارج تھے۔ انہوں نے امین فہیم کو فون کیا اور بتایا کہ وہ ان سے ملنا چاہتے ہیں لیکن مخدوم طالب المولیٰ نے ان سے ملنے سے انکار کیا۔ جب بریگیڈیئر امتیاز کا اصرار بڑھا تو امین فہیم نے اپنے باپ کو ان سے ملنے کے لیے راضی کر لیا۔

[illegible]

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

آخر بریگیڈیئر امتیاز نے بھی بچی کھچی گولیاں نہیں کھیلی ہوئی تھیں۔ وہ امین فہیم کے پیچھے لگے رہے۔ آخر امین فہیم مان گئے لیکن انہوں نے بریگیڈیئر امتیاز کے سامنے یہ شرط رکھی کہ وہ اس صورت میں سندھ حکومت میں شامل ہوں گے اگر ان کے ساتھ جام صادق علی اور غلام علی نظامانی کو بھی وزیر بنایا جائے۔ جام صادق علی ان دنوں لندن میں جلاوطنی کے دن گزار رہے تھے۔ بریگیڈیئر امتیاز نے انہیں وزیر بنانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ بھارتی ایجنٹ ہیں۔ یہ علیحدہ بات تھی کہ بعد میں اسی اسٹیبلشمنٹ اور سیکرٹ ایجنسیوں نے اسی بھارتی ایجنٹ جام صادق علی کو 93-1991 میں سندھ کا وزیر اعلیٰ بنا کر پیپلز پارٹی کے خلاف استعمال کیا۔

جب جنرل ضیاء کو مخدوم طالب المولا کے انکار کا پتہ چلا تو انہوں نے خود ان سے ملنے کی خواہش کی لیکن مخدوم طالب المولا نے ان سے ملنے سے انکار کر دیا۔

جب یہ ساری بات چیت آگے پروان نہ چڑھ سکی تو امین فہیم امریکہ چلے گئے جہاں 17 اگست 1988 کو انہوں نے جنرل ضیاء کے طیارے کے حادثے کی خبر سنی۔

امین فہیم فوری طور پر پاکستان لوٹ آئے۔ پیپلز پارٹی نے انتخابات میں اکثریت حاصل کی۔ اسٹیبلشمنٹ نے ایک دفعہ پھر اپنا کھیل شروع کر دیا۔ وہ بھٹو خاندان میں سے کسی کو بھی وزیر اعظم بنانے پر تیار نہیں تھے۔ اب کی دفعہ اسٹیبلشمنٹ امین فہیم کو توڑ کر ملک کا وزیر اعظم بنانا چاہتی تھی۔ ایک دن امین فہیم کو پتہ چلا کہ فرزند راولپنڈی شیخ رشید احمد جو اس وقت سیاست میں اتنے نہیں جانے جاتے تھے اور چوہدری انور عزیز ان سے ملنے کے لیے آ رہے تھے۔ ان دونوں نے اس وقت کے آرمی چیف جنرل اسلم بیگ اور صدر غلام اسحاق خان کا ایک پیغام انہیں دیا کہ وہ بینظیر بھٹو کو چھوڑ کر اس ملک کے نئے وزیر اعظم بن جائیں۔ امین فہیم کو بتایا گیا کہ انہیں سندھ سے قابل اعتماد بندے کی ضرورت ہے۔ آرمی چیف اور صدر بینظیر بھٹو کے بجائے انہیں وزیر اعظم بنانا چاہتے ہیں۔ ان دونوں نے یہ تجویز دی کہ وہ پارٹی کے اندر ایک فارورڈ بلاک بنائیں لیکن امین فہیم نے انکار کر دیا۔

میں نے امین فہیم سے پوچھا کہ جب آپ کے خاندان نے پیپلز پارٹی کے لیے اتنی قربانیاں دی تھیں اور وہ بھٹو فیملی کے وفادار بھی رہے پھر بھی بینظیر بھٹو نے انہیں اس ملک کا وزیر اعظم نہیں بننے دیا۔

امین فہیم نے قہقہہ لگایا اور بولے کہ جب ان کی بینظیر بھٹو صاحبہ سے 11 اکتوبر 2002ء کو لندن میں ملاقات ہوئی تھی تو محترمہ نے انہیں پیپلز پارٹی حکومت بنانے کا پورا اختیار دے دیا تھا۔ محترمہ نے امین فہیم سے کہا تھا کہ وہ پی ایم ایل کیو کی لیڈر شپ سے پاور شیئرنگ معاہدے کے لیے گفتگو شروع کریں۔ امین فہیم کو اس وقت شدید مایوسی ہوئی جب ان مذاکرات میں ان کے سامنے یہ شرط رکھی گئی کہ وزیر اعظم بننے کے بعد بینظیر بھٹو سے کوئی رابطہ نہیں رکھیں گے۔

میں نے کہا کہ مخدوم صاحب! عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ بینظیر بھٹو نہیں چاہتی تھیں کہ پیپلز پارٹی میں سے کوئی سندھی لیڈر وزیر اعظم بنے کیونکہ اس کے بعد ان کی اپنی بارگیننگ پوزیشن ہمیشہ کے لیے کمزور ہو جاتی۔

امین فہیم نے بڑی شدت سے اس تاثر کو مسترد کیا اور کہا کہ بینظیر بھٹو واقعی انہیں وزیر اعظم بنانا چاہتی تھیں اور یہی وجہ تھی کہ آصف علی زرداری کو 2002ء کے انتخابات کے بعد حکومت بنانے کے لیے ہونے والے مذاکرات میں شامل کیا گیا تھا۔

میں نے کہا کہ امین فہیم صاحب! یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ کے بیٹے کو بھی سندھ کا وزیر اعلیٰ نہ بنوانے میں بینظیر بھٹو کا بڑا ہاتھ تھا حالانکہ جنرل مشرف اور آپ کے ساتھی ان کے بیٹے کو یہ عہدہ دینے کے لیے تیار تھے۔

امین فہیم نے یہ کہہ کر پھر بینظیر بھٹو کا دفاع کیا کہ ایسی بات ہرگز نہیں تھی۔ جب انہیں جنرل مشرف کی طرف سے یہ پیشکش کی گئی کہ وہ اپنے بیٹے کو سندھ کا چیف منسٹر بنوا لیں تو انہوں نے محترمہ سے رابطہ کر کے یہ ساری بات انہیں بتائی تھی۔ محترمہ نے انہیں کہا تھا کہ وہ اپنی پارٹی کے لوگوں کو اعتماد میں لے لیں اور سب لوگ تقریباً اس پر راضی بھی ہو گئے تھے۔ جنرل مشرف اور پیپلز پارٹی کے درمیان ڈیل تقریباً طے ہو چکی تھی۔ جنرل مشرف نے ان کے بیٹے کو وزیر اعلیٰ سندھ بنانے کی منظوری دے دی تھی۔ چوہدری شجاعت حسین اور وزیر اعظم ظفر اللہ جمالی نے کراچی پہنچ کر ایک پریس کانفرنس میں ان کے بیٹے کو چیف منسٹر بنانے کا اعلان کرنا تھا۔

اس پریس کانفرنس سے چند گھنٹے پہلے امین فہیم کو ایک ٹیلیفون کال آئی۔ انہیں کہا گیا کہ وہ اپنے بیٹے کو کہیں کہ اگر وہ وزیر اعلیٰ بننا چاہتے ہیں تو پہلے پیپلز پارٹی سے اعلان لاتعلقی کریں۔

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!!blogspot!!com!!

[illegible]

[illegible] پارٹی کو توڑا جائے۔ [illegible] ان لوگوں نے اپنے آپ کو عوام کے غصے سے بچانے کے لیے بینظیر بھٹو کے نام کو استعمال کیا۔

میں نے امین فہیم سے پوچھا کہ کیا بینظیر بھٹو نے کبھی ان سے ان رپورٹس کے بارے میں [illegible]

[illegible]

○○○

امین فہیم سے میرا دوسرا رابطہ چار سال بعد 2007 میں [illegible] بینظیر بھٹو اور جنرل پرویز مشرف کے درمیان ایک نئی ڈیل کرانے کے لیے سرگرم تھے۔ [illegible] جنرل مشرف کے ساتھ [illegible] جنرل مشرف انہیں اکثر یہ کہتے کہ وہ بینظیر بھٹو کو چھوڑ دیں [illegible] ان کے ساتھ شامل ہو جائیں۔

جنرل مشرف کا خیال تھا کہ شاید مدہوشی کے ان لمحات میں امین فہیم شاید بہک جائیں لیکن مخدوم نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہوئی تھیں۔ یوں وہ دونوں ایک دوسرے کو داد و تحسین دیتے رہے اور 2002 کی نسبت اب کی دفعہ امین فہیم، بینظیر بھٹو اور جنرل مشرف کو ایک نیا معاہدہ کرنے پر تیار کر چکے تھے۔ اب کی دفعہ جنرل مشرف بدلتے ہوئے عالمی اور ملکی حالات کے پیش نظر بینظیر بھٹو کو وزیراعظم بنانے پر تیار ہو گئے تھے۔

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!!!blogspot!!com!!

امین فہیم سے میرا ایشو ابھرا کر 2008ء کے شروع میں ہوا جب فروری کے انتخابات کے بعد وہ اپنے آپ کو پاکستان کا وزیراعظم سمجھنے لگ گئے تھے۔ اس میں ان کا قصور بھی نہیں تھا کیونکہ نوڈیرو میں بینظیر بھٹو کی شہادت کے بعد ہونے والی پہلی پریس کانفرنس میں آصف علی زرداری صاحب نے اپنے آپ کو بلاول بھٹو زرداری کے ساتھ کو چیئرپرسن منتخب کرا کر یہ اعلان کیا تھا کہ امین فہیم ان کے وزارت عظمیٰ کے امیدوار ہوں گے۔

29 دسمبر 2007ء کو نوڈیرو میں ہونے والی اس پریس کانفرنس میں میں بھی موجود تھا۔ میں وہاں بینظیر بھٹو کی شہادت کے بعد اپنے اخبار دی نیوز کے لیے رپورٹنگ کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ فروری کے انتخابات میں جب پیپلز پارٹی نے اکثریت حاصل کر لی تو امین فہیم نے اپنے آپ کو ملک کا وزیراعظم سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے چالیس سال پرانے دوست سینیٹر انور بیگ نے امین فہیم کو اسلام آباد میں غیر ملکی سفیروں سے ملانا شروع کر دیا تھا۔ بہت سارے سفیر تو خود امین فہیم سے ملنا چاہتے تھے تاکہ وہ ملک کے نئے وزیراعظم کو قریب سے دیکھ کر ان کے بارے میں اپنا ایک تاثر قائم کریں۔ انور بیگ کے ڈپلومیٹک انکلیو میں بہت زیادہ تعلقات تھے جس کا مظاہرہ انہوں نے اس وقت کر کے دکھایا جب بینظیر بھٹو پاکستان واپس آئیں اور انور بیگ نے پارلیمنٹ ہاؤس میں سو سے زیادہ غیر ملکی سفیروں کو ایک چھت تلے بینظیر بھٹو کی تقریر سننے کے لیے اکٹھا کر دیا تھا۔ بینظیر بھٹو بھی انور بیگ کے اتنے زیادہ تعلقات سے بہت متاثر ہوئی تھیں۔ اب جبکہ بینظیر بھٹو نہیں رہی تھیں تو انور بیگ نے اپنے دوست امین فہیم کو ڈپلومیٹک انکلیو میں متعارف کرانا شروع کر دیا تھا۔ اس میں انور بیگ کا قصور بھی نہیں تھا کیونکہ یہ آصف علی زرداری ہی تھے جنہوں نے نوڈیرو میں بیٹھ کر امین فہیم کو پاکستان کا نیا وزیراعظم بنانے کا عندیہ دیا تھا۔ امین فہیم اور انور بیگ کے ذہن میں بھی یہ نہیں آ سکتا تھا کہ انتخابات کے بعد آصف علی زرداری صاحب کی ترجیحات یکدم بدل چکی تھیں۔ امین فہیم کو وزیراعظم بنانے کا اعلان محض پارٹی کے اندر اپنے خلاف ہونے والی کسی بھی بغاوت کو رونما ہونے سے روکنا تھا۔ بینظیر بھٹو کے بعد اگر کوئی پارٹی کا لیڈر بن سکتا تھا تو وہ امین فہیم تھے جو اس وقت پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرین کے چیئرمین تھے۔ اگر نوڈیرو کی وہ میٹنگ جس میں بینظیر بھٹو کی وصیت پڑھ کر سنائی گئی اور زرداری صاحب نے پارٹی اپنے قبضے میں لے لی، میں امین فہیم بغاوت پر اتر آتے تو شاید آصف زرداری

صاحب کے لیے پارٹی پر قبضہ کرنا اتنا آسان نہ رہتا۔ یوں بڑی سمجھداری سے امین فہیم کو کسی بھی متوقع بغاوت سے باز رکھنے کے لیے آصف زرداری نے وقتی طور پر انہیں وزیراعظم بنانے کا اعلان کیا لیکن بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ وہ ان کی ایک سیاسی چال تھی، لیکن امین فہیم آخری دن تک جب تک یوسف رضا گیلانی کے نام کا اعلان نہیں کیا گیا، اپنے آپ کو وزیراعظم کا امیدوار سمجھتے رہے۔

جب انور بیگ امین فہیم کو سفیروں سے ملوا رہے تھے، اس وقت آصف زرداری صاحب ابھی بھی نوڈیرو میں موجود تھے۔ جب مجھے ان ملاقاتوں کا علم ہوا تو میں نے دی نیوز میں اس کی ایک سٹوری فائل کی۔ اور تو اور، امریکی سفیر بھی انور بیگ کے گھر پر آ کر خصوصی طور پر امین فہیم سے ملی تھیں اور انہوں نے بھی ایک طرح سے اپنی طرف سے کلیئرنس چٹ دے دی تھی۔ انور بیگ اور امین فہیم نے اپنا ہوم ورک پورا کر لیا تھا۔ جب امریکن سفیر کو ان کے وزیراعظم بننے پر اعتراض نہیں تھا تو باقی پھر پیچھے کیا رہ جاتا تھا۔ یوں امین فہیم کے وزیراعظم بننے میں کچھ دن باقی رہ گئے تھے۔

جب یہ سٹوری چھپی تو مجھے انور بیگ نے فون کر کے کہا کہ کلاسرا صاحب! آپ نے تو امین فہیم کے وزیراعظم بننے کے امکانات تقریباً ختم کر دیے ہیں۔ میں بڑا حیران ہوا تو وہ بولے کہ آج امین فہیم کی کچھ مغربی سفارتکاروں سے ملاقاتیں تھیں۔ اس خبر کے چھپنے کے فوراً بعد امین فہیم کو بتایا گیا تھا کہ وہ تمام ملاقاتیں چھوڑ کر فوری طور پر نوڈیرو پہنچیں۔ آصف زرداری صاحب ان سے کچھ صلاح مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔ بیگ صاحب کا خیال تھا کہ یہ صلاح مشورہ محض بہانہ تھا۔ دراصل زرداری صاحب نہیں چاہتے تھے کہ امین فہیم غیر ملکی سفیروں سے ملیں۔

اس کا مطلب بڑا واضح تھا کہ آصف زرداری کا ذہن تبدیل ہو چکا تھا اور امین فہیم اب اس ملک کے نئے وزیراعظم نہیں ہوں گے۔

وہی ہوا جس کا اندیشہ انور بیگ نے ظاہر کیا تھا۔ نوڈیرو سے واپسی پر امین فہیم کو اندازہ ہو چکا تھا کہ ان کی کہانی ختم ہو گئی ہے، لیکن انہوں نے بھی آخری لمحوں تک آصف زرداری پر اپنا دباؤ رکھنے کا فیصلہ کیا۔

میں نے انہی دنوں میں امین فہیم کے حق میں خبریں دینا شروع کیں کیونکہ میرا خیال تھا کہ ان کے ساتھ زیادتی ہو رہی تھی۔ یہ آصف زرداری ہی تھے جنہوں نے انہیں خود وزیراعظم بنانے کی بات کی

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

تھی اور انہیں اپنے وعدے سے منحرف کر گئے تھے۔ ان دنوں میرے علاوہ اسلام آباد کے صحافی بھی وہاں موجود رہتے تھے۔ آصف زرداری صاحب چاہ رہے تھے۔ کسی صحافی نے ان کے اس بیان کو سوال کرتا تو کسی نے پیپلز پارٹی کی خبریں لگائی تھیں اور کوئی بھی ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے دن رات ان کا حامی بنا ہوا تھا۔

امین فہیم اور آصف زرداری کے درمیان اختلافات بڑی تیزی سے بڑھتے جا رہے تھے۔ پیپلز پارٹی کے لوگوں کو بھی یہ اندازہ ہونا شروع ہو گیا تھا کہ ہوا کا رخ بدل گیا ہے۔ ایک دن زرداری صاحب نے اسلام آباد کے صحافیوں کو ایف ۔ ایٹ میں واقع زرداری ہاؤس میں شام کے کھانے پر بلایا۔ بڑے سے لے کر چھوٹے صحافی تک سب وہاں شریک ہوئے۔ ہمارا خیال تھا کہ زرداری صاحب شاید صحافیوں کے منہ سے کچھ باتیں سننا چاہتے تھے۔ یہ علیحدہ کہانی ہے کہ وہ دو گھنٹے تک خود ہی بولتے رہے اور انہوں نے کسی کو بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ کھانے کے بعد صحافی انہیں گھیرے کھڑے تھے۔ اچانک ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ یوسف رضا گیلانی اور شاہ محمود قریشی ان کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ زرداری صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ میرے خیال میں انہیں کس کو وزیر اعظم بنانا چاہیے؟ میں نے ان سے کہا کہ صحافی ہونے کے ناطے یہ میرا کام نہیں ہے کہ میں انہیں مشورہ دوں کہ وہ کس کو وزیر اعظم بنائیں یا کس کو نہ بنائیں۔ یہ بات انہیں اپنی پارٹی کے لوگوں سے پوچھنی چاہیے۔

زرداری صاحب نے اپنی روایتی مسکراہٹ کے درمیان مجھ سے پھر پوچھا کہ نہیں آپ مجھے بتائیں کہ میں کسے وزیر اعظم بناؤں۔ میں نے پھر وہی عذر پیش کیا۔

اب کی بار زرداری صاحب نے کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو ہمیں مشورہ نہیں دینا چاہیے لیکن میں آپ سے خود پوچھ رہا ہوں لہٰذا آپ مجھے بتائیں۔

میرے لیے یہ بڑا مشکل مرحلہ تھا کیونکہ انہی دنوں یہ خبریں آنا شروع ہو گئی تھیں کہ آصف علی زرداری امین فہیم کے بعد احمد مختار، شاہ محمود قریشی اور یوسف رضا گیلانی میں سے کسی ایک کو وزیر اعظم بنانا چاہتے تھے۔ گیلانی صاحب اور قریشی صاحب میرے سامنے کھڑے تھے۔ دونوں سے میرا اچھا تعلق تھا۔

میں نے زرداری صاحب سے کہا کہ میرے خیال میں انہوں نے خود ہی یہ اعلان کیا تھا کہ وہ

امین فہیم کو وزیر اعظم بنائیں گے لہٰذا انہیں اپنا وعدہ پورا کرنا چاہیے۔ ساتھ ہی میں نے زرداری صاحب کو یاد دلایا کہ انہوں نے اسی طرح ایک وعدہ یوسف رضا گیلانی سے بھی کر رکھا ہے۔

زرداری صاحب نے حیرانی سے میری طرف دیکھا جیسے پوچھ رہے ہوں کہ کون سا وعدہ؟

یوسف رضا گیلانی اور ارد گرد کھڑے صحافیوں نے مجھے چونک کر دیکھا۔ میں نے زرداری صاحب کو یاد دلایا کہ جب احتساب عدالت کے جج نے یوسف رضا گیلانی کو سات سال کی قید سنائی تھی تو وہ اس وقت عدالت میں موجود تھے۔ یہ زرداری صاحب ہی تھے جنہوں نے اونچی آواز میں یہ کہا تھا کہ جج صاحب! آپ یوسف رضا گیلانی کو نہیں بلکہ ملک کے مستقبل کے صدر پاکستان کو سزا سنا رہے ہیں۔

میں نے کہا زرداری صاحب! میرا خیال ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ آپ جج صاحب کو کہے ہوئے اپنے الفاظ پر عملدرآمد کرا سکتے ہیں۔

زرداری صاحب نے میری بات سنی اور فوراً بولے کہ ہاں مجھے یوسف رضا گیلانی سے کیا ہوا اپنا یہ وعدہ یاد ہے۔

اس کھانے سے ہم فارغ ہوئے تو سب پر یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ اب کسی صورت بھی امین فہیم اس ملک کے وزیر اعظم نہیں بننے والے تھے۔ اب مقابلہ یوسف رضا گیلانی، شاہ محمود قریشی اور احمد مختار کے درمیان تھا۔

انہی دنوں حسین حقانی بھی امریکہ سے آئے ہوئے تھے اور ہر وقت وہ زرداری صاحب کے قریب موجود رہتے۔ انہوں نے کچھ عرصہ صحافت کی ہوئی تھی لہٰذا انہیں صحافیوں کی پروفیشنل کمزوریوں کا بھی علم تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کا گر بھی جانتے تھے۔ ان کے خلاف اخبارات میں خبریں آنا شروع ہو گئی تھیں اور وہ چاہتے تھے کہ کسی طریقے سے ان کا تدارک کیا جائے۔ میں بڑا حیران ہوا جب انہوں نے مجھے فون کیا اور بڑے اچھے طریقے سے بات چیت کی اور ہمت کر کے کہا کہ وہ مجھے اندر کی بہت ساری سیاسی خبریں دے سکتے ہیں لیکن اس کے بدلے میں مجھے تھوڑی حد تک ان کے مفادات کا بھی خیال رکھنا پڑے گا۔

مجھے متاثر کرنے کے لیے انہوں نے کہا کہ میں آپ کو ایک ایسی خبر دے رہا ہوں جو کسی کے

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

پاس نہیں ہے۔ یہ حسین حقانی تھے جنہوں نے مجھے یہ خبر دی تھی کہ یوسف رضا گیلانی ہی اس ملک کے نئے وزیر اعظم ہوں گے۔

ان دنوں جب یوسف رضا گیلانی کا نام دور دور تک سننے میں نہیں آتا تھا یہ حسین حقانی ہی تھے جنہیں اس بات کا علم تھا کہ یہ ساری بحث فضول تھی کہ کون وزیر اعظم بنے گا۔ اگر کسی نے وزیر اعظم بننا تھا تو وہ یوسف رضا گیلانی تھے۔

جس طریقے سے حسین حقانی نے مجھ سے خبروں کا سودا کرنے کی کوشش کی تھی وہ شاید میرے لیے قابل قبول نہیں تھا اور یوں اس ایک واقعہ کے بعد میرا اور ان کا زیادہ رابطہ نہیں رہا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ میں نے یوسف رضا گیلانی کے وزیر اعظم بننے کی خبر اخبار میں نہیں دی کیونکہ میرا خیال تھا کہ جب میں حسین حقانی کی خواہش پر ان کے چند مفادات کا خیال نہیں رکھ سکتا تھا تو پھر مجھے ان کی دی ہوئی اس خبر کو چاہے وہ کتنی ہی بڑی کیوں نہیں تھی استعمال کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

امین فہیم بڑی تیزی سے اپنی پارٹی میں تنہا ہوتے جا رہے تھے۔ ان کے تمام ساتھی جن پر وہ بہت بھروسہ کرتے تھے وہ انہیں ایک ایک کر کے چھوڑتے جا رہے تھے۔ امین فہیم نے بھی آخری دم تک لڑنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔ انہوں نے یہ اعلان کر دیا کہ وہ قومی اسمبلی میں وزیر اعظم کا انتخاب لڑیں گے اور اس کے لیے انہیں آصف علی زرداری کی نامزدگی کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرین کے چیئرمین ہیں۔ امین فہیم کا خیال تھا کہ سندھ سے بھی ایم این اے ان کا ساتھ دیں گے۔ خصوصاً ان کو نوید قمر پر بڑا مان تھا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ہر دفعہ نوید قمر ان کی وجہ سے اپنے حلقے سے جیتتے تھے۔ اگر وہ نوید قمر کے حلقے میں موجود اپنے مریدوں کو انہیں ووٹ ڈالنے کا نہ کہیں تو نوید قمر کبھی نہیں جیت سکتے تھے۔

امین فہیم کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا جھٹکا اس وقت لگا جب نوید قمر نے ان کی نامزدگی کے کاغذات پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ نوید قمر جیسا شخص بھی انہیں اس مشکل مرحلے میں یوں چھوڑ جائے گا۔

اگر پیپلز پارٹی کے دوستوں کے ہاتھوں دھوکا کھانے میں کوئی کسر رہ گئی تھی تو وہ راجہ پرویز اشرف نے پوری کر دی۔ یہ وہی راجہ پرویز اشرف تھے جو سینیٹر انور بیگ کے گھر پر رات کو دی گئی پارٹی میں اکیلے اس وقت احتراماً کھڑے ہو جاتے جب امین فہیم باتھ روم جانے کی نیت سے صوفے سے

اٹھتے تھے۔ جب امین فہیم باتھ روم سے واپس لوٹتے تو بھی راجہ پرویز اشرف ایک دفعہ پھر احتراماً کھڑے ہو جاتے تاکہ امین فہیم کو پتہ چلے کہ وہ ان کی دل سے کتنی عزت کرتے ہیں۔ تاہم جب امین فہیم کو ان کی ضرورت پڑی تو راجہ پرویز اشرف نے ان کا فون تک سننے سے انکار کر دیا۔

امین فہیم بھول گئے تھے کہ بینظیر بھٹو مر چکی تھیں۔ اب آصف علی زرداری پارٹی کے صدر ہیں اور نوید قمر اور راجہ پرویز اشرف جیسے لوگ نئے بادشاہ کے درباری بن چکے تھے۔ اگر اس لیے کوئی بھی شخص امین فہیم کے ساتھ اپنی پوری طاقت کے ساتھ کھڑا تھا تو یہ انور بیگ تھے۔ ان دونوں کی دوستی کراچی میں 1960ء کی دہائی میں شروع ہوئی تھی۔ اپنی دوستی کو پکا رنگ دینے کے لیے دونوں نے اپنے بڑے بیٹوں کے نام نجیب رکھے تھے۔ آج ان دونوں کے بیٹے ان کی دوستی کی طرح اپنی عمر کی چالیس سے زیادہ بہاریں دیکھ چکے ہیں۔

انور بیگ کے اسلام آباد کے میڈیا اور ڈپلومیٹک انکلیو میں بے پناہ تعلقات تھے جس کا سارے کا سارا فائدہ امین فہیم کو ہو رہا تھا۔ انور بیگ کے ان تعلقات کی وجہ سے ہی امین فہیم کو عوام میں ہمدردیاں مل رہی تھیں اور یہ سمجھا جا رہا تھا کہ زرداری صاحب نے ان کے ساتھ زیادتی کی ہے۔

آصف علی زرداری کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ اس وقت امین فہیم کے ساتھ اگر کوئی شخص اپنی دوستی نبھا رہا ہے تو وہ سینیٹر انور بیگ ہیں۔ زرداری صاحب نے اپنے قریبی دوست فیصل بٹ کو ایک رات انور بیگ کے گھر بھیجا اور انہیں بڑا دوستانہ مشورہ دیا کہ وہ امین فہیم کی حمایت سے باز آ جائیں اس کے بدلے میں ان کا خیال رکھا جائے گا۔

انور بیگ اپنی پارٹی کے لیڈروں، نوید قمر اور راجہ پرویز اشرف کی طرح، سیاست نہیں سمجھتے تھے۔ انہیں یہ پتہ نہیں تھا کہ سیاستدان دوستیوں کے لیے نہیں بلکہ اقتدار کے لیے سیاست کرتے ہیں۔ انہوں نے بڑی شائستگی سے فیصل بٹ کو یہ کہا کہ وہ امین فہیم کے چالیس سال پرانے دوست ہیں اور اس مرحلے پر محض سیاسی مفادات کے لیے ان سے تعلقات ختم کرنا ان کے لیے مشکل ہے۔

یوں زرداری صاحب کا یہ پیغام ٹھکرا کر انور بیگ نے دوستی کے نام پر اپنا سیاسی کیریئر تباہ کر لیا تھا۔ ان کے نزدیک ان کی دوستی ان کے سیاسی کیریئر سے زیادہ اہم تھی۔

وقت آگے نکل گیا تھا۔ یوسف رضا گیلانی وزیر اعظم بن چکے تھے۔ آصف علی زرداری ابھی

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

کہ انور بیگ سے مخدوم ناراض تھے۔ انہوں نے انور بیگ کو ایک پیغام بھیجا کہ وہ سینٹ کی سیٹ سے استعفیٰ دے دیں۔ مخدوم زرداری نے صورت حال کو سنبھال لیا۔ انہوں نے صدر صاحب کو بتایا کہ مخدوم انور بیگ صاحب دراصل سینٹ سے مارچ 2008ء میں ریٹائر ہو رہے ہیں۔ اگر ان سے اس وقت استعفیٰ لیا گیا تو یہی سمجھا جائے گا کہ انہیں امین فہیم کے ساتھ دوستی کی سزا دی جا رہی ہے۔ زرداری صاحب کو یہ بات سمجھ میں آ گئی اور انہوں نے انور بیگ کے استعفیٰ پر زیادہ اصرار نہیں کیا۔

جب مارچ کے مہینے میں نئے سینیٹرز کے لیے انتخابات ہونے لگے تو انور بیگ ٹکٹ اپلائی کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کا دل اس وقت بے طرح ٹوٹ گیا جب انہیں یہ پتہ چلا کہ مخدوم امین فہیم نے ان کی بجائے سندھ سے دو تین اور لوگوں کا نام ٹکٹ کے لیے دیا تھا۔ انہیں اس بات پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ ان کا چالیس سال پرانا دوست ان کے ساتھ اس طرح کی حرکت کر سکتا ہے۔ تاہم کچھ لوگوں نے انور بیگ کو سمجھایا کہ انہیں پارٹی ٹکٹ کے لیے ضرور اپلائی کرنا چاہیے۔ یہ ضرور تھا کہ انہیں ٹکٹ نہیں ملے گا لیکن کم از کم یہ بوجھ پیپلز پارٹی کے کندھوں پر رہے گا کہ انہوں نے انہیں ٹکٹ دینے سے انکار کیا تھا۔ وہی ہوا آصف علی زرداری صاحب نے انور بیگ کو ٹکٹ دینے سے انکار کر دیا۔

کچھ عرصے بعد کسی دوست نے آصف علی زرداری سے انور بیگ کو ٹکٹ نہ دینے اور ان کے ساتھ اچھا سلوک نہ رکھنے کی شکایت کی تو انہوں نے آگے سے یہ کہا کہ آپ اس بات پر شکر کریں کہ انور بیگ ابھی تک زندہ ہے۔

انور بیگ کے بعد یوسف تالپور بھی ان لیڈروں میں سے تھے جو امین فہیم کے حامی تھے اور وہ اپنی اس حمایت کو کھل کر بیان بھی کرتے۔

اسی اثناء میں یہ خبریں آنا شروع ہو گئیں کہ امین فہیم کے لیے اقتدار سے باہر رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ ان کے گھر سے ان پر پریشر پڑنا شروع ہوا کہ وہ کس چکر میں پڑ گئے ہیں۔ بارہ سال بعد پیپلز پارٹی اقتدار میں آئی ہے۔ وہ دن رات بینظیر بھٹو کے لیے بھاگ دوڑ کرتے رہے تھے اور آج جب پھل کھانے کا وقت آیا تو وہ اقتدار سے باہر ہیں۔ گھر کے خرچ چلانا بھی ذرا مشکل لگ رہا تھا۔ اب انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آصف علی زرداری کو کیسے راضی کیا جائے۔ آخر مخدوم صاحب کی کراچی والی بیگم کو ایک طریقہ سمجھ میں آیا۔ انہوں نے سندھی روایات کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ کراچی سے جہاز پکڑا اور

پہنچیں ایوانِ صدر گئیں۔ اپنے بھائی آصف علی زرداری سے ملیں۔ اپنے خاوند کی غلطیوں پر ایک بہن کی حیثیت سے معذرت کی۔ اب ایک سندھی بلوچ کے لیے یہ مشکل ہو گیا تھا کہ وہ مخدوم امین فہیم کی بیوی کو بہن بنانے کے بعد نظر انداز کرتا۔

یوں ایک بلوچ سردار نے طالب المولا کے اس بیٹے کو معاف کر کے وزیر بنا دیا جس نے کبھی اپنے باپ کو بھٹو کی پارٹی جائن کرنے کے لیے پتہ نہیں کتنے ترلے ڈال کر راضی کیا تھا اور بھٹو صاحب نے ایک بڑا تاریخی جملہ کہا تھا کہ مخدوم آف ہالا کا ان کی پارٹی میں آنے سے وہ سندھ میں اپنا آدھے سے زیادہ الیکشن جیت گئے ہیں۔ آج اسی مخدوم طالب المولا کی بہو ذوالفقار علی بھٹو کے داماد سے اپنے خاوند کی جان بخشی اور اسے کسی مال بنانے والی وزارت کا وزیر بنانے کی درخواست کر رہی تھی۔

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

آصف علی زرداری

مجھے سیاستدانوں کے انکشافات پر مبنی سیاسی پروفائل کرتے ہوئے کچھ ماہ گزر گئے تھے۔ یہ سلسلہ بڑی تیزی سے دی نیوز کے قارئین میں پاپولر ہو رہا تھا۔ اردو اخبارات بھی ان پروفائلز میں سے سنسنی خیز خبریں نکال کر اور ان کا ترجمہ کر کے چھاپ رہے تھے۔ کالم نگار دوستوں نے بھی دھیرے دھیرے کالموں میں ذکر کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان سب کے لیے یہ نئی چیز تھی کہ ماضی کے سیاستدانوں کے سینوں میں اتنے راز چھپے ہوئے تھے جو اب دھیرے دھیرے باہر نکل رہے ہیں۔

آصف زرداری ان دنوں جنرل مشرف کے زیر عتاب تھے۔ غلام اسحٰق خان سے لے کر نواز شریف، فاروق لغاری اور اب جنرل مشرف نے آصف زرداری کو سیدھا کرنے کا بیڑا اٹھا رکھا تھا۔ ہر ایک نے اپنے اپنے دور میں آصف زرداری پر کیسز بنائے۔ انہیں جیلوں میں رکھا اور انہیں اپنے تئیں سیدھا کرنے کی کوشش کی۔ سرکاری وکیلوں اور ان مقدمات پر کروڑوں روپے خرچ کیے گئے۔ ایک دفعہ تو باقاعدہ آڈیٹر جنرل پاکستان نے اپنی ایک رپورٹ میں آصف زرداری پر بنائے گئے ان مقدمات پر خرچ ہونے والے کروڑوں روپوں کو قومی خزانے پر ایک بوجھ اور غیر قانونی قرار دیا تھا۔ جب میں نے وہ رپورٹ چھاپی تھی تو سینیٹر رضا ربانی نے پڑھ کر اس کی کاپی مجھ سے مانگی تھی۔ اب یہ نہیں پتہ کہ انہوں نے اس سرکاری دستاویز کا کیا استعمال کیا تھا۔

آصف زرداری کی میڈیا کے لوگوں کے ساتھ ایک عجیب سی Love and hate رلیشن شپ رہی ہے۔ جب وہ جیل سے باہر ہوتے ہیں تو مجھ جیسے میڈیا کے لوگ اپنا تن من دھن صرف اس پر خرچ کر دیتے ہیں کہ وہ کسی طریقے سے انہیں دنیا کا سب سے بڑا کرپٹ شخص ثابت کر کے جیل بھجوا دیں۔ جب زرداری صاحب جیل جاتے ہیں تو کچھ عرصے بعد میڈیا کو پتہ چلتا ہے کہ دراصل انہیں تو اسٹیبلشمنٹ نے محض استعمال کیا تھا کیونکہ اب وہ انہیں جیل میں رکھ کر بینظیر بھٹو کو اپنی مرضی کی شرائط پر ڈیل کرنے کے لیے مجبور کر رہے تھے۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے یہ احساس بڑھنا شروع ہو جاتا ہے کہ جناب آصف علی زرداری صاحب تو مرد حُر تھے۔ وہ نہ تو نواز شریف کے دور کے احتساب سیل کے انچارج سینیٹر سیف الرحمٰن کی طرح عدالتوں میں بھاں بھاں کر کے روتے تھے اور نہ ہی نواز شریف اور شہباز شریف کی طرح جنرل مشرف کو تحریری معافی نامے دے کر ایک ڈیل کے ذریعے سعودی عرب دس سال کے لیے فرار ہوتے تھے۔

آصف زرداری کی شکل میں ہمارے میڈیا کے پاس ایک ایسا دیو مالائی کردار آ گیا تھا جو عدالتوں میں پیشیوں کے وقت نواز شریف یا سیف الرحمٰن کی طرح رونے دھونے کے بجائے چہرے پر ایک لمبی مسکراہٹ طاری کیے ہر ایک سے ملتا تھا۔ نواز شریف اور شہباز شریف کے ڈیل کر کے ملک سے چلے جانے کے بعد لوگوں کی آنکھوں میں آصف زرداری کی قدر و اہمیت اور بڑھ گئی تھی۔ بینظیر بھٹو اپریل 1999ء میں نواز شریف کی احتساب عدالتوں کے خوف سے پہلے ہی ملک چھوڑ کر جا چکی تھیں۔ بچے کھچے دو نمبری سیاستدان چوہدری شجاعت کی قیادت میں جنرل مشرف کے دربار میں پی ایم ایل کیو کی بنیادیں رکھ کر ایک فوجی ڈکٹیٹر کے ہاتھوں پر بیعت کرنا شروع ہو گئے تھے۔ یوں لوگوں اور میڈیا کو یہ محسوس ہوا کہ آصف زرداری کرپٹ سہی لیکن بزدل ہرگز نہیں ہے، جس نے ایک بہادر بلوچ کی طرح کوئی ڈیل کر کے ملک سے فرار ہونے کی بجائے اپنے ملک کی جیل میں رہنا پسند کیا تھا۔ یہ علیحدہ کہانی ہے کہ کچھ عرصے بعد آصف زرداری صاحب اس وقت کے ڈی جی ایم آئی ندیم تاج کے ساتھ خفیہ ملاقاتیں کر کے ایک ڈیل کے ذریعے رہا ہو کر نیویارک پہنچ گئے اور پھر وہ تین سال بعد دسمبر 2007ء میں پاکستان واپس لوٹے جب بینظیر بھٹو قتل ہوئیں اور اب وہ اس ملک کے صدر ہیں۔

میرے صحافی دوست محسن رضا نے دو تین دفعہ مجھے کہا کہ تم آصف زرداری کا ایک پروفائل

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

انٹرویو اپنے اخبار کے لیے کیوں نہیں کرتے۔ فرحت اللہ بابر نے بھی ایک دو موقعوں پر کچھ ایسی ہی بات کی۔ میں نے دونوں سے کہا کہ ٹھیک ہے، آپ میری زرداری صاحب سے ملاقات کرا دیں اور میں یقیناً یہ انٹرویو کروں گا۔ یوں جون 2003ء کی ایک تپتی دوپہر میں میں راولپنڈی کی احتساب عدالت کے احاطے میں پہنچ گیا جہاں آصف زرداری ایک درخت کے نیچے صحافیوں میں گھرے بیٹھے تھے۔ پیپلز پارٹی کے پرانے جانثار کارکن قاضی سلطان محمود بھی وہاں موجود تھے۔ محسن رضا اور شعیب بھٹہ نے میرا آصف زرداری سے تعارف کروایا۔ انہوں نے مجھے کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ ابھی ہم بیٹھے ہی تھے کہ اتنی دیر میں حامد میر وہاں آ گئے۔ وہ دونوں وہاں سے اٹھ کر ایک فاصلے پر ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں گفتگو کرنے لگے اور میں صحافی دوستوں کے ساتھ ان کا انتظار کرتا رہا۔ جب وہ حامد میر سے گفتگو کر کے واپس لوٹے تو اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ گئے۔ میرا ایک دفعہ پھر ان سے تعارف کروایا گیا۔

انہوں نے خاموشی سے مجھے دیکھا۔ میرے ہاتھ سے موبائل فون لے لیا۔ میں نے سمجھا وہ شاید کسی کو ٹیلی فون کرنا چاہ رہے ہیں۔ چند لمحوں تک وہ فون کو ٹٹولتے رہے اور پھر مجھے واپس کر دیا۔ ابھی مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر میری جیب سے پین نکال لیا۔ وہ اس پین کو موبائل فون کی طرح دیر تک چیک کرتے رہے اور پھر مجھے واپس کر دیا۔ مجھے فوری طور پر کچھ سمجھ نہ آئی کہ آخر زرداری صاحب میرا فون اور قلم کیوں چیک کر رہے ہیں۔ اچانک میرے ذہن میں فلیش ہوا۔ دراصل زرداری صاحب میری تلاشی لے رہے تھے۔ وہ یہ دیکھنا چاہ رہے تھے کہ میں موبائل فون پر ان کی گفتگو ٹیپ تو نہیں کر رہا تھا یا اسی طرح پین میں کوئی ایسی ڈیوائس تو نہیں لگی ہوئی تھی جس سے ساری بات چیت محفوظ ہو رہی تھی۔ مجھے ایک لمحے کے لیے بڑی شدید کوفت ہوئی۔ کوشش کے باوجود مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے زرداری صاحب کو کہہ دیا کہ سر! اصل بات تو یہ ہے کہ میں آپ کا انٹرویو نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آپ کے انتہائی قریبی دوستوں نے مجھے اس بات پر راضی کیا کہ مجھے آپ سے مل کر آپ کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کی کہانی قلمبند کر کے اپنے اخبار میں چھاپنی چاہیے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایک صحافی ہونے کے ناطے یہ میرا حق بنتا ہے کہ میں اپنی جیب سے کوئی بھی ٹیپ ریکارڈر نکال کر آپ کے سامنے رکھ دوں تاکہ جو بھی گفتگو ہو وہ ریکارڈ پر ہو۔ پھر مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں موبائل فون میں چھپ کے ریکارڈنگ آن کر کے اس ساری گفتگو کو محفوظ کر لوں۔

زرداری صاحب نے میری طرف دیکھا اور بولے کہ سائیں ناراض ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ پہلی دفعہ مجھ سے مل رہے ہیں۔ میں آپ کو نہیں جانتا، آپ مجھے نہیں جانتے۔ میری اور آپ کی پہلی ملاقات ہے۔ کسی پر اعتماد کرنے یا اس کا اعتماد جیتنے کے لیے وقت لگتا ہے۔ آپ آتے جاتے رہیں گے تو ہمیں آپ پر بھی بھروسہ ہو جائے گا۔

مجھے خیال آیا کہ اس میں آصف زرداری کا کوئی قصور نہیں تھا۔ جب آپ سات سال ہر وقت اپنے اردگرد پولیس کی وردیاں پہنے اجنبی لوگوں میں سوتے جاگتے ہیں اور آپ کو کوئی پتہ نہیں ہوتا کہ ان میں سے کون جاسوس ہے اور کون محض اپنی ڈیوٹی دے رہا ہے تو پھر انسان کا اس طرح کا رویہ ہو ہی جاتا ہے۔

باتوں باتوں میں میں نے ان کے پوچھنے پر بتایا کہ میں نے انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کیا ہوا ہے تو وہ تھوڑے سے حیران ہوئے اور مجھ سے پوچھا کہ پھر تم جرنلزم میں کیا کر رہے ہو۔

اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا وہ خود ہی بول پڑے کہ ہاں ٹھیک ہے کہ جب آپ زندگی میں کسی بھی شعبے میں جانا چاہتے ہیں تو پھر پریکٹیکل لائف آپ کو سب کچھ سکھا دیتی ہے۔

مجھے کسی نے بتایا تھا کہ آصف زرداری بڑی اچھی سرائیکی بول لیتے ہیں۔ اس لیے میں نے بھی ان کا اعتماد جیتنے کے لیے سرائیکی میں گفتگو شروع کی تو میں نے محسوس کیا کہ ان کا رویہ میری طرف کچھ بدل گیا ہے۔ انہوں نے تھوڑا ہی سہی لیکن مجھ پر اعتماد کرنا شروع کر دیا تھا۔

ایک بات واضح تھی کہ آصف زرداری کی شخصیت میں جیل جانے کے بعد بڑی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ انہوں نے مجھے دیکھا اور مسکرا کر بولے کہ کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک Gladiator ہوں جو اپنے لوگوں کو ایک ظالم بادشاہ کے شکنجوں سے آزاد کرانے کے لیے ایک لمبی جنگ لڑ رہا ہے۔ وہ پیپلز پارٹی کے ایک ایسے جنگجو تھے جنہیں جب بھی پارٹی چاہے کسی بھی کام کے لیے استعمال کر سکتی ہے۔ چاہے وہ جیل کے اندر ہوں یا باہر۔

آصف زرداری سے جوں جوں باتیں ہونا شروع ہوئیں تو محسوس ہوا کہ وہ پیپلز پارٹی کے لیے ایک طرح کا مزاحمت کا نشان بن کر ابھرے تھے۔ ابھی بھی ان کے اردگرد سندھ اور پنجاب کے بہت سے ورکرز کھانے پینے کی چیزیں لے کر بیٹھے ہوئے تھے۔ آصف زرداری ان مٹھائیوں کے ڈبوں

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

میں سے مٹھائی اٹھا کر ایک ایک ورکر کو خود کھلا رہے تھے۔ ان کی بات سن رہے تھے اور یوں تاثر دے رہے تھے جیسے وہ ہر ایک کے خیالات کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ اس دوران وہ ٹیلی فون پر بھی مسلسل لوگوں سے بات چیت کر رہے تھے۔

آصف زرداری کو اپنے ورکروں اور دوستوں کے درمیان بیٹھا دیکھ کر میرے ذہن میں ایک ہی بات آ رہی تھی کہ ہو سکتا ہے کہ جیل کے آٹھ سالوں نے ان سے ہر چیز چھین لی ہو، لیکن انہوں نے اپنی مسکراہٹ کسی کو نہیں چھینے دی تھی۔ اس مسکراہٹ سے پارٹی کے لیڈروں اور ورکروں کو ایک ہی پیغام ملتا تھا کہ ابھی آصف زرداری نے ہتھیار نہیں ڈالے ہیں۔

جب میں نے آصف زرداری سے بات چیت کرنے کی کوشش کی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے زیادہ بات چیت کرنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ میں ان سے ان کی ابتدائی زندگی اور بعد کے سالوں کے ان پہلوؤں پر بات کرنا چاہ رہا تھا جو ابھی تک لوگوں کی آنکھوں سے پوشیدہ تھے۔ جب میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو وہ کچھ دیر مجھے دیکھتے رہے اور بولے کہ سائیں! یہ ساری باتیں دہرانے کا کیا فائدہ۔ یہ سب کچھ تو بہت پہلے چھپ چکا ہے۔ میں نے پھر بھی اپنی کوشش جاری رکھی لیکن وہ ہر سوال کا بڑا مختصر جواب دے کر بات کو ٹال جاتے۔ کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ ان کے ذہن میں ابھی کچھ Reservations باقی تھیں اور وہ اتنی آسانی سے ایک ایسے صحافی پر اعتماد کرنے کو تیار نہیں تھے جو ان سے زندگی میں پہلی دفعہ مل رہا ہو۔

باتوں باتوں میں، میں نے محسوس کیا کہ وہ چند صحافیوں سے خوش نہیں تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ وہ ان کے خلاف تیار ہونے والی سازش کا حصہ تھے اور ان کے خلاف جھوٹی کہانیاں چھاپتے رہے تھے۔ انہوں نے ایک پاکستانی ایڈیٹر کا بھی نام لیا جس نے اپنے اردو اخبار میں اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ وہ آصف زرداری کے امیج کو خراب کرنے والی مہم میں شریک تھا۔

آصف زرداری کے بقول جیل میں رہنے کا انہیں سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا تھا کہ ان کی شخصیت میں بہت زیادہ صبر آ گیا تھا جو ان میں 1996ء سے پہلے نہیں تھا۔ انہیں محسوس ہوتا تھا کہ ان کی شخصیت بدل گئی ہے۔ جیل میں لمبا عرصہ گزارنے کے بعد ان کی شخصیت پر کچھ اہم اور مثبت اثرات مرتب ہوئے تھے۔ اب وہ مذہب اور روحانیت کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔ اب وہ کسی بھی بات کو غصے میں آئے بغیر اسی طرح خرچ کر سکتے ہیں اور کسی سے غصہ یا بغض بھی نہیں رکھتے ہیں۔

آصف زرداری بولے کہ تمہیں پتہ ہے کہ جیل کی زندگی قیدی کا روزانہ امتحان لیتی ہے۔ آپ کو روزانہ ان طاقتور لوگوں سے لڑ کر زندہ رہنا پڑتا ہے جنہوں نے آپ کو جیل میں ڈالا ہوا ہوتا ہے۔ تاہم، خدا نے ان کے اندر ایک ایسی طاقت بھر دی تھی جس کی وجہ سے وہ جیل کی زندگی کو بڑے صبر اور بہادری کے ساتھ جھیل رہے تھے۔ انہوں نے جیل میں آنے سے پہلے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ ان کے اندر اتنی بہادری آ جائے گی۔

میرے لیے حیرانی کی بات یہ تھی کہ آصف زرداری کے دل میں ان لوگوں کے خلاف کوئی شکایت یا بغض نہیں تھا جنہوں نے ان پر مقدمات بنا کر انہیں جیل میں ڈالا تھا۔ جب میں نے ان سے سیف الرحمٰن کے بارے میں بات کرنا چاہی جن کی وجہ سے آج وہ جیل میں بیٹھے تھے تو آصف زرداری صرف اتنا بولے کہ چھوڑو یار سیف الرحمٰن محض ایک ایس ایچ او تھا۔ اس طرح کے پولیس ایس ایچ او روزانہ پورے پاکستان میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی میری زندگی میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یہ آتے جاتے رہتے ہیں۔ اب کون ان کے بارے میں بیٹھ کر سوچتا رہے۔

میں نے ہمت نہیں ہاری اور دوسرا سوال داغا کہ کیا اس ایس ایچ او سیف الرحمٰن نے ان کے خلاف جھوٹے کیس بنانے پر ان سے معافی مانگی تھی تو آصف زرداری بولے کہ نہ صرف اس ایس ایچ او نے بلکہ اس کے ماسٹر نواز شریف نے بھی بقول ان کے یہ گناہ کرنے پر معافی مانگی تھی۔ چوہدری نوید نواز شریف کا ایک پیغام لے کر ان کے پاس کراچی جیل آئے تھے اور ان سے معافی مانگی تھی۔ نواز شریف نے چوہدری نوید کو کہا تھا کہ وہ آصف زرداری سے جا کر درخواست کریں کہ وہ انہیں معاف کر دیں۔

میں نے زرداری صاحب سے پوچھا پھر انہوں نے نواز شریف کی اس درخواست پر کیا کہا تھا۔ آصف زرداری نے روایتی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجائی اور بولے کہ میں نے اسی لمحے یہ سوچے بغیر کہ انہوں نے میرے ساتھ کیا کیا تھا انہیں معاف کر دیا۔

میں نے آصف زرداری کے مختصر جوابات کے باوجود ہمت نہیں ہاری اور ان سے بات چیت میں لگا رہا تاکہ ان کے ماضی کی کہانی اپنے قارئین کے سامنے لا سکوں۔

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

میں نے ان سے پوچھا کہ غلام اسحٰق خان سے لے کر نواز شریف، فاروق لغاری، جنرل پرویز مشرف اور اب حالی کی حکومتوں کے درمیان جیلوں میں ان سے کیا سلوک ہوتا رہا۔ ان تمام حکمرانوں میں ان کے ساتھ جیل میں کس کی بہتر سلوک کس نے کیا تھا۔

زرداری صاحب نے جواب دیا کہ جیل جیل ہوتی ہے چاہے اس میں آپ کو دنیا بھر کی تمام سہولتیں ہی کیوں نہ فراہم کر دی جائیں۔ ان تمام حکمرانوں نے انہیں جیل میں توڑنے کی پوری کوشش کی لیکن اللہ کے کرم سے وہ اپنے پیروں پر کھڑے رہے۔

اچانک میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ زرداری صاحب کے بچوں نے اپنے قیدی باپ کے جیل جانے کے بعد اپنے آپ کو کیسے ایڈجسٹ کیا ہوگا۔ میرا سوال سن کر وہ بولے کہ میرے بچوں نے 1990ء سے لے کر اب تک مجھے زیادہ وقت جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہی دیکھا ہے۔ جب وہ بڑے ہو رہے تھے تو میں جیل بیٹھا تھا۔ انہیں یہ علم نہیں تھا کہ ان کے باپ کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ ان کی سب سے چھوٹی بیٹی آصفہ ہر وقت یہ اصرار کرتی تھی کہ وہ دوسرے بچوں کے بابا کی طرح ہر وقت ان کے ساتھ کیوں نہیں رہتے۔ ایک جج انہیں رہا کرنے پر کیوں تیار نہیں ہے۔ ایک دن تو حالت یہ ہو گئی کہ آصفہ نے اپنے باپ کو کہا کہ آج تو وہ اسے اپنے ساتھ جج کے پاس لے کر جائیں۔ وہ اس سے خود لڑائی کرے گی کہ آخر وہ اس کے باپ کو چھوڑنے پر کیوں تیار نہیں ہے۔ آصفہ نے اپنے باپ سے کہا کہ کیا اس جج کو یہ احساس نہیں ہے کہ ہمیں آپ کی کتنی ضرورت ہے۔

میں نے محسوس کیا کہ اپنے بچوں کی باتیں کرتے ہوئے آصف زرداری جو ابھی تھوڑی دیر پہلے مسلسل مسکرا رہے تھے وہ صرف جذباتی ہو گئے تھے بلکہ ان کے اندر کا باپ یکدم اپنے ارد گرد بیٹھے صحافیوں اور سیاسی ورکروں کے درمیان سیاستدان پر حاوی ہو گیا تھا۔ زرداری صاحب [illegible]

[illegible]

آزاد چھوڑنی شروع ہوئے تھی تو وہ اپنے پارٹی ورکرز کی اپنے لیے محبت اور ان کی قربانیوں کو یاد کر کے اپنے آپ کو حوصلہ دیتے۔

انہوں نے بات کا رخ بدلا اور مجھے بتانے لگے کہ تمہیں علم ہے کہ انہیں جیل میں رکھ کر بہت سارے لوگوں نے بڑے بڑے فائدے اٹھائے تھے۔ چاہے وہ پولیس والے ہوں، جیلر یا پھر جج، ان سبھوں نے ان طاقتور لوگوں سے بڑے فائدے اٹھائے تھے جو اسے جیل میں رکھنے کے خواہاں تھے۔ ان سب کو مجھے جیل میں رکھنے کے عوض اور مجھ پر تشدد کرنے کے لیے پروموشنز اور انعامات مل رہے تھے۔ بہت سارے لوگوں کی کمائیاں صرف اس لیے ہو رہی تھیں اور ان کے گھروں میں چولہا جل رہا تھا کہ انہوں نے زرداری کو جیل میں رکھا ہوا ہے۔

آصف زرداری مسکرائے اور بولے کہ باقی باتیں چھوڑیں۔ اور تو اور، اس ملک کے مختلف حکمران بھی انہیں جیل میں رکھنے کے عوض ملک پر حکمرانی کر رہے تھے۔ وہ اپنے اقتدار کو یہ جواز فراہم کر رہے تھے کہ انہوں نے آصف زرداری جیسے شخص کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے رکھا ہوا ہے۔

وہ کہہ رہے تھے کہ میرے لیے تو یہ بڑے اعزاز کی بات ہے کہ انہیں جیل میں رکھ کر بہت سارے خاندانوں کا روٹی پانی چل رہا تھا ورنہ پانچ ارب کی اس آبادی میں ایک شخص کی کیا اہمیت ہے۔

میں نے زرداری صاحب سے پوچھ لیا کہ کیا انہوں نے کبھی جیل کی سلاخوں کے پیچھے بیٹھ کر یہ نہیں سوچا کہ بہت ہو گیا تھا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ وہ جیل سے باہر آنے کے لیے ایک ڈیل کر لیں۔

ان کا بے ساختہ جواب تھا نو۔

آصف زرداری کہنے لگے کہ جیل نے انہیں ایک عجیب سی توانائی دی ہے جو انہیں جھکنے پر نہیں بلکہ طاقتور لوگوں سے لڑنے پر ہر وقت تیار رکھتی ہے۔ اصل بہادری یہ نہیں ہے کہ کسی کو پوری طاقت کے ساتھ کچل دیا جائے جیسا وہ جیل جانے سے پہلے خود بھی یہی سوچتے تھے۔ جیل میں رہنے کے بعد انہوں نے یہ سیکھا ہے کہ اصل بہادری یہ ہوتی ہے کہ آپ اپنے سامنے کھڑے طاقتور شخص کے حملوں کو کیسے برداشت کرتے ہیں [illegible]

[illegible] 1978 [illegible]

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

[illegible] انہیں ملک سے انتخابات کرانے کے لیے کہا گیا تھا [illegible]

[illegible] کامیاب ہوتے ہیں تو وہ ملک سے باہر چلے گئے اور 2007ء میں واپس لوٹے۔ ایسے

پارٹی اقتدار میں آ جائے گی۔ 2003ء میں جب آصف زرداری مجھ سے یہ باتیں کر رہے تھے تو ان پر یقین کر لینا مشکل تھا کیونکہ سارا سیٹ اپ تو جنرل مشرف کے ہاتھ میں تھا اور انہیں یہ یقین دہانی کرائی جا رہی تھی کہ اگر وہ وردی اتار دیں تو اگلے سال انہیں دوبارہ ملک میں سے انتخابات کرائے جا سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ فوجی قیادت ان سے جنرل مشرف کے لیے آسانیاں پیدا کرنے کی خاطر جیل سے رہا کر کے محض جان چھڑانا چاہ رہی تھی لیکن آصف زرداری کو راضی کرنے کے لیے وہ ملک میں سے انتخابات کرانے کا بلف دے رہی تھی۔ فوجی قیادت ہرگز ملک میں سے انتخابات نہیں چاہتی تھی۔ وہ محض آصف زرداری کو جو اس وقت جنرل مشرف کے لیے بہت بڑا خطرہ بنے ہوئے تھے انہیں جیل سے نکال کر ملک سے باہر بھیجنا چاہ رہی تھی۔ آصف زرداری بھی اسی چکر میں آ گئے تھے کہ شاید ان کی رہائی کے فوراً بعد ملک میں انتخابات ہو جائیں گے۔ بینظیر بھٹو ملک واپس لوٹ آئیں گی اور ان کی پارٹی اقتدار میں آ جائے گی لیکن انہیں نہیں پتہ تھا کہ وردی والے ان سے زیادہ اچھے سیاستدان تھے اور بہتر سیاسی چالیں چلتے تھے۔ انہوں نے 2004ء میں آصف زرداری کو رہا کیا اور ساتھ ہی یہ افواہیں اخبارات میں چھپوانا شروع کر دیں کہ انہیں ایک ڈیل کے تحت رہا کیا گیا ہے جس کے تحت وہ ملک سے باہر چلے جائیں گے اور واپس نہیں آ سکیں گے۔ بعد میں حالات نے یہ ثابت کیا کہ یہ افواہیں درحقیقت ٹھیک تھیں اور آصف زرداری 2004ء میں اپنی رہائی کے بعد ملک سے باہر گئے تو 27 دسمبر 2007ء کو اس وقت پاکستان واپس لوٹے جب بینظیر بھٹو قتل ہو چکی تھیں۔

جب آصف زرداری نے اپنی رہائی اور اپنی پارٹی کے اقتدار میں آنے کی پیشین گوئی کی تو میں نے ان سے سیدھا سادا سوال پوچھ لیا کہ کیا ان کی کرپشن کے بارے میں جو اب تک کہانیاں چھپتی رہی ہیں وہ غلط تھیں۔ زرداری صاحب نے میرے سوال کو برا نہیں مانا اور بولے کہ یہ سامنے کی بات ہے کہ کوئی بھی حکومت اپنے سیاسی مخالفین کی طاقت کو برداشت نہیں کرتی اور انہیں جھکانے کے لیے اس طرح کے حربے استعمال کرتی رہتی ہے۔ ان کی پارٹی کے بہت سارے لیڈروں اور ورکروں نے فوجی حکمرانوں کے دور میں ان سے بغاوت کی بہت بڑی قیمت چکائی تھی۔ وہ مجھے بتانے لگے کہ پاکستانی

پیپلز پارٹی نے ہمیشہ سے قربانیاں دی ہیں۔ بھٹو صاحب کو پھانسی دی گئی، شاہنواز بھٹو کو قتل ہوا اور مرتضیٰ بھٹو بھی گولیوں سے بھون دیے گئے۔ اب بینظیر بھٹو ملک واپس آنے کی اجازت نہیں دی جا رہی ہے اور ان کے خلاف بہت سارے مقدمے بنا دیے گئے ہیں۔ زرداری صاحب کے بقول بھٹو فیملی نے پاکستان میں سیاست کرنے اور طاقتور اسٹیبلشمنٹ کے خلاف بغاوت کرنے کی بہت بڑی قیمت ادا کی تھی لیکن پھر بھی بھٹو خاندان جمہوریت اور پاکستان کے لوگوں کے لیے مسلسل قربانیاں دے رہے ہیں۔

اس گفتگو کے درمیان میں نے زرداری صاحب سے پوچھا کہ کیا وہ سیکرٹ ایجنسیز کے افسران کے ساتھ ہونے والی ملاقاتوں کی تفصیلات بتانا پسند کریں گے یا انہیں جو آفرز حکمرانوں نے ان پچھلے دس سالوں میں کی تھیں۔ زرداری صاحب مسکرائے اور بولے کہ سندھ میں قائم سیاستدان ہوں۔ میں چاہوں تو سیاسی رازوں سے پردہ اٹھا کر اس ملک کی سیاست میں بہت بڑے طوفان اٹھا سکتا ہوں۔ لیکن میں یہ سیاسی راز افشا کر کے صرف ایک دن کی سیاست نہیں کرنا چاہتا۔

وہ مجھے بتانے لگے کہ ان کے سینے میں بہت سارے راز دفن ہیں۔ 1990ء سے لے کر اب تک تقریباً ہر دور میں ہر حکمران نے انہیں بہت ساری پیشکشیں کیں لیکن وہ ہرگز ان کی تفصیلات نہیں بتائیں گے۔

میں نے بات کا رخ موڑا اور ان سے پوچھا کہ ان کے خیال میں ملک میں بہتر سیاستدان کون ہیں تو وہ بولے کہ بینظیر بھٹو کے بعد نوابزادہ نصر اللہ خان اور مولانا فضل الرحمٰن حقیقی طور پر سیاستدان ہیں۔

پتہ نہیں آصف زرداری کے ذہن میں کیا آیا کہ وہ مجھے کہنے لگے کہ عمومی طور پر جو سال میں نے جیل میں گزارے ہیں ان کے بارے میں کچھ غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ وہ اب تک دس سال جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزار چکے ہیں۔ پہلی دفعہ نواز شریف کے دور میں 93-1990ء میں وہ جیل میں رہے۔ پھر فاروق لغاری نے 1996ء میں انہیں جیل میں ڈالا تھا اور اب یہ 2003ء ہے۔

انہوں نے مجھے کہا کہ تمہیں ایک بات بتاؤں کہ وہ 2004ء میں جیل سے رہا ہو جائیں گے اور اگلے سال ہی اس ملک میں نئے الیکشن ہوں گے اور ان کی پارٹی اقتدار میں آ جائے گی۔

آصف زرداری کی یہ بات تو سچ ثابت ہوئی کہ 2004ء میں انہیں رہا کر دیا گیا جس کے بعد

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!.blogspot!!.com!!

سوسائٹی ایک ایسے مرحلے سے گزر رہی ہے جس میں لوگ اب ڈکٹیٹرشپ سے سویلین رول کی طرف سفر کر رہے ہیں۔ اس طرح کی یہ سیاسی تبدیلی پاکستان میں پہلی دفعہ نہیں ہو رہی ہیں بلکہ اگر دیکھا جائے تو دنیا کے دیگر ممالک میں بھی اس طرح کی لڑائیاں لڑی جا رہی ہیں۔ انسانی تاریخ میں ایسے بہت سارے لوگوں کو پھانسیاں دی گئیں جنہوں نے اپنے دور کے ڈکٹیٹرز اور طاقتور لوگوں کے خلاف بغاوتیں کی تھیں۔ بہت سارے ممالک میں تو ایسے لوگوں کو آگ میں جلایا بھی گیا۔ سو اگر آج ان کے ساتھ یہ سب سلوک روا رکھا جا رہا ہے تو اس میں کوئی حیرانی کی بات نہیں۔ ان کے بقول آزادی حاصل کرنے کے لیے بیشتر قربانیاں دینی پڑتی ہیں اور وہ بھی اپنے حصے کی قربانی دے رہے ہیں اور اس قربانی کے ذریعے وہ لوگوں کو ڈکٹیٹرشپ سے آزادی دلوانا چاہتے ہیں۔

آصف زرداری تھوڑا سا آگے جھکے اور مجھے دیکھ کر بولے کہ ڈکٹیٹرز سیاستدانوں کی توہین کرتے رہے ہیں۔ وہ اپنے مقاصد کے لیے انہی سیاستدانوں کو استعمال بھی کرتے رہے ہیں۔ یہ اسٹیبلشمنٹ کا ایک پرانا طریقہ کار رہا ہے کہ عوام میں مقبول لیڈروں پر کرپشن کے چارجز لگا کر انہیں بدنام کر کے اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا جائے۔ [illegible] سیاستدانوں کے کھاتے میں ڈال [illegible] آپ میرا ایک کیس ہی دیکھ لیں کہ مجھ پر الزام [illegible] ایک کار [illegible] کرنے کے لیے [illegible] ڈیوٹی ادا نہیں کی تھی۔ وہ یہ [illegible] ہو گئی۔

میں نے پھر بات کا رخ موڑا اور ان سے پوچھا کہ زرداری صاحب! آپ کو کیسا لگتا ہے کہ آپ ایک ایسی خاتون کے شوہر ہیں جو اس ملک کی دو دفعہ وزیراعظم رہی ہیں تو وہ بولے کہ یہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا اور اہم تجربہ تھا۔ وہ مجھے بتانے لگے کہ دنیا بھر میں وزیراعظم کے خاوند یا ان کی بیویوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ شروع میں تو انہیں وزیراعظم کا شوہر ہونے کی وجہ سے بہت ساری مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ سیاسی لیڈرز، بیوروکریٹس اور حتیٰ کہ دوسرے بھی انہیں وزیراعظم کا خاوند تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھے۔ ان کے نزدیک وزیراعظم کے شوہر ہونے کی جاب بہت مشکل تھی تاہم انہوں نے بہت جلد ان تمام چیلنجز کے ساتھ اپنے آپ کو ایڈجسٹ کر لیا۔

میں نے زرداری صاحب سے نسبتاً زیادہ مشکل سوال پوچھ لیا کہ بہت سارے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ انہوں نے بینظیر بھٹو کے لیے بے پناہ مسائل کھڑے کیے تھے اور دراصل اس خاتون نے ان کی وجہ سے بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کیا تھا۔ زرداری صاحب نے ایک لمحے کے لیے میری طرف دیکھا۔ تھوڑی دیر وہ چپ رہے اور پھر بولے کہ یہ سارا بھٹو فیملی کے مخالفین کا پروپیگنڈا ہے۔ ان کے بقول جنرل ضیاء کے سیکرٹری انفارمیشن جنرل مجیب الرحمٰن کا یہ کارنامہ تھا جنہوں نے بھٹو خاندان کے خلاف اجتماعی غلیظ مہم شروع کی تھی۔ جنرل مجیب کا مقصد یہ تھا کہ میرے ذریعے بھٹو فیملی کو بدنام کیا جائے اور پچھلے دس سالوں میں یہ کام بڑی خوبصورتی سے آگے بڑھایا گیا تھا، لیکن وہ یہ بات بھول گئے تھے کہ بھٹو ازم لوگوں کی روحوں میں آج بھی باقی ہے۔

میں نے ان سے کہا کہ پھر آج فیصل صالح حیات جیسے پارٹی کے پرانے لیڈر یہ کہہ کر کیوں پیپلز پارٹی چھوڑ رہے ہیں کہ بھٹو ازم اس دن دفن ہو گیا تھا جس دن بینظیر بھٹو نے 1988ء میں اس ملک کی اسٹیبلشمنٹ سے ڈیل کر کے اقتدار لے لیا تھا۔

آصف زرداری بولے کہ دراصل فیصل صالح حیات جیسے لوگ پارٹی کے ساتھ غداری کو جواز فراہم کرنے کے لیے اس طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ سب لوگ جانتے تھے کہ پیپلز پارٹی کے اس گروپ نے جنرل مشرف کے ہاتھ پر بیعت اس لیے کی تھی کہ انہیں اقتدار چاہیے تھا اور وہ غداری کے مرتکب ہوئے تھے۔ اب انہیں بھٹو ازم اور پارٹی لیڈرشپ میں ہر طرح کی خامیاں نظر آئیں گی۔ یہ نہ تو کوئی انہونی بات تھی اور نہ ہی پہلی دفعہ کسی لیڈر نے بھٹو کی پارٹی سے غداری کر کے اس طرح کا جواز گھڑا تھا۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے زرداری صاحب نے مجھے ایک واقعہ سنایا کہ جب ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کے خلاف فوج نے بغاوت کی تو مولانا کوثر نیازی نے بھی یہی کچھ کیا تھا۔ انہوں نے بھٹو سے غداری کر کے جنرل ضیاء کو جائن کر لیا۔ مولانا کوثر نیازی نے اس وقت بھی یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ بھٹو کی جان بچانے کے لیے جنرل ضیاء کا ساتھ دے رہے تھے۔ کوثر نیازی اکثر کہتے تھے کہ پیپلز پارٹی کے لیڈر بھٹو کو قتل کرنا چاہتے تھے اور وہ بھٹو کی جان بچائیں گے۔

"تو کیا کوثر نیازی نے بھٹو کی جان بچالی تھی؟" آصف زرداری نے مجھ سے پوچھا۔

میں چپ رہا تو وہ بولے کہ پیپلز پارٹی کے یہ اٹھارہ ایم این ایز جنہوں نے 2002ء کے الیکشن کے بعد اپنی پارٹی چھوڑ کر جنرل مشرف کو جائن کیا، انہوں نے بھی یہی دعویٰ کیا تھا کہ وہ بینظیر بھٹو کو

www.freepdfpost.blogspot.com

allurdupdfnovels.blogspot.com

واپس لا رہی ہے تو کیا وجہ ہے کہ پھر لوٹوں کو واپس لے آتے ہیں، یہ لوگ محض اپنے فائدے اور مفادات کو پورا کرنے کی سیاست کر رہے ہیں۔

میں نے زرداری صاحب سے پوچھا کہ اگر ایسی بات تھی کہ یہ لوگ پارٹی کے ساتھ غداری کرتے رہے تھے تو پھر پارٹی لیڈرشپ انہیں دوبارہ اپنی پارٹی میں کیوں شامل کرتی رہی ہے۔ جب یہ لوگ مشکل وقت میں پارٹی چھوڑ گئے تھے تو پھر اچھے وقتوں میں انہیں واپس کیوں لایا گیا۔

آصف زرداری کے پاس اس بات کا بھی جواب موجود تھا۔ وہ کہنے لگے کہ آپ اس بات کو بھی سراہیں کہ یہ پیپلز پارٹی کی خوبصورتی ہے نہ کہ کوئی بری بات۔ لوگ اس پارٹی میں آتے ہیں، جائن کرتے ہیں، پھر اسے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور پھر کچھ عرصے بعد واپس آ کر اسے پھر جائن کرتے ہیں کیونکہ انہیں پتہ ہے کہ سیاسی طور پر زندہ رہنے کے لیے صرف ایک ہی جماعت ہے جس کا نام پیپلز پارٹی ہے۔

میں بھی اتنی آسانی سے ہتھیار ڈالنے والا نہیں تھا۔ میں نے زرداری صاحب سے ایک اور بات پوچھی کہ پیپلز پارٹی پیٹریاٹ کے ایم این ایز یہ الزام لگا رہے تھے کہ 1988ء سے لے کر اب تک پیپلز پارٹی کی قیادت ہمیشہ کمپرومائز کرتی رہی ہے اور فوجی قیادت کے ہاتھوں کھیلتی رہی ہے۔

زرداری صاحب بھی اتنی آسانی سے ہار ماننے والے نہیں تھے۔ وہ کہنے لگے کہ میاں دیکھو، پیپلز پارٹی ایک جمہوری پارٹی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہر طاقتور شخص اس پارٹی کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ جنرل اسلم بیگ سے لے کر جنرل پرویز مشرف تک سب نے یہ کوششیں کی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہم جو سیاسی فیصلے کرتے ہیں وہ کسی کمپرومائز کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

میں نے کہا کہ زرداری صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ لوگ اب یہ سمجھتے ہیں کہ جرنیلوں کے ساتھ کمپرومائز کر کے پیپلز پارٹی کمزور ہوئی ہے۔

وہ بولے کہ آپ کو یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ایکٹرز تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور پارٹی کے لیڈرز مختلف لوگوں سے مختلف ایشوز پر بات چیت اور ڈائیلاگ کرتے رہتے ہیں۔ یہ سب ایک سیاسی گیم ہوتی ہے۔ اس کا ہرگز مطلب کمپرومائز نہیں ہوتا۔ وہ کہنے لگے کہ ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جمہوری طاقتیں کبھی بھی بات چیت یا مذاکرات کی آفرز کو نہیں ٹھکراتیں۔

میں نے بات کا رخ ایک اور پھر نیب کے زرداری صاحب پر بنائے گئے کیسز کی طرف کر دیا۔

وہ بولے کہ یہ سارا احتساب کے نام پر بنایا گیا اور وہ محض جنرل مشرف کا ایک سیاسی ہتھیار تھا جس کے ذریعے وہ اپنے سیاسی مخالفین کو ہراساں کر رہے تھے۔ نیب ان کی رہائی کے بدلے ایک مخصوص قیمت مانگ رہا ہے جو ان کی پارٹی لیڈرشپ نہ تو افورڈ کر سکتی ہے اور نہ ہی دینے کو تیار ہے۔ جنرل مشرف ان کو رہا کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن اس کے بدلے وہ پیپلز پارٹی کی قیادت کو کہہ رہے ہیں کہ وہ ایل ایف او کو تسلیم کریں اور پھر ایک وردی والے صدر کو بھی مان لیں۔ یہ ہے ساری کہانی۔ لیکن میں نے جھکنے سے انکار کر دیا ہے اور اب جیل کی سلاخوں کے پیچھے بیٹھا اس کی قیمت چکا رہا ہوں۔

زرداری صاحب کہنے لگے کہ دیکھو! شروع میں تمام پارٹیز نے ایل ایف او کے خلاف بڑا رولا ڈالا جیسا کہ ایم کیو ایم نے لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا ان سب نے ایل ایف او کو تسلیم کر لیا۔ تمام سیاسی پارٹیوں نے یہ ڈرامہ کھیلا اور اپنی اپنی قیمت لے کر جنرل مشرف کے ساتھ شامل ہوتے گئے۔ باقی باتیں چھوڑو۔ یہی دیکھ لو کہ جمالی کی کابینہ میں بیٹھے وزیروں کی اکثریت پر نیب نے مقدمات بنائے ہوئے تھے لیکن ان کے بارے میں کوئی بات نہیں کرتا۔

میں نے کہا کہ زرداری صاحب! جب آپ کو پتہ ہے کہ آپ کے مخالفین آپ کے ذریعے بینظیر بھٹو کو بلیک میل کرتے ہیں تو پھر آپ اقتدار سے دور کیوں نہیں رہتے تا کہ ان کے لیے اور آپ کی پارٹی کے لیے مشکلات پیدا نہ ہوں۔ انہوں نے الٹا مجھ سے سوال پوچھ لیا کہ وہ کیوں اپنی پارٹی کی حکومت سے دور رہیں خصوصاً جب لوگوں نے انہیں ووٹ دے کر ایم این اے یا سینیٹر بنایا ہو۔ دوسروں کی طرح ان کا بھی یہ سیاسی استحقاق تھا اور اس میں کوئی بھی ایسی برائی نہیں تھی اگر وہ بینظیر بھٹو کی حکومت میں کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہوں۔ ان کی اپنی بہن نے بھی قومی اسمبلی کا الیکشن اس وقت جیتا جب وہ جیل میں بیٹھے تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ جب لوگ انہیں بےگناہ سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ حکومت کریں تو پھر کسی کو اس پر کیا اعتراض! لوگ عدالتوں کے الزامات پر یقین نہیں رکھتے کہ انہوں نے کوئی کرپشن کی تھی لہٰذا وہ انہیں ہر دفعہ ووٹ ڈالتے ہیں اور ان کے لیے سیاست میں رہنے کے لیے یہ ایک جیت ہی کافی ہے۔

میں نے کہا کہ زرداری صاحب! چلیں مان لیتے ہیں کہ غلام اسحٰق خان، نواز شریف اور جنرل

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

مشرف نے آپ پر جھوٹے کیس بنائے ہوں گے کیونکہ وہ آپ کے سیاسی مخالف تھے لیکن آپ کے پاس اس بات کا کیا جواز ہے کہ آپ کی اپنی ہی پارٹی کے لیڈر فاروق لغاری جنہیں صدر بنانے کے لیے آپ خود ووٹ مانگتے رہے تھے نے آپ کی حکومت پر کرپشن کے الزامات لگا کر اسے ڈس مس کیا تھا، انہی کے بنائے ہوئے مقدمات کی وجہ سے وہ آج جیل میں بیٹھے ہیں۔

زرداری صاحب نے کہا کہ فاروق لغاری نے دراصل پارٹی کو دھوکہ دیا تھا۔ وہ ایک دھوکے باز شخص ہے جس نے ملک کی تمام سیاسی طاقتوں کو دھوکہ دیا تھا۔

میں نے کہا کہ زرداری صاحب! کہا تو یہ بھی جاتا ہے کہ بینظیر بھٹو اور فاروق لغاری کے درمیان اختلافات آپ کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے جو آخر کار بینظیر بھٹو کی حکومت کے خاتمے کی وجہ بنے۔

میرا اگلا سوال ابھی تک پیپلز پارٹی پیٹریاٹ کے گروپ کی طرف تھا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا انہیں ایجنسیوں نے مجبور کیا تھا کہ وہ پیپلز پارٹی کے ساتھ سیاسی غداری کریں۔ وہ بولے کہ وہ اس بارے میں سو فیصد یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے۔ ان کا خیال ہے جب تک خود کوئی ٹوٹنے کے لیے تیار نہ ہو کوئی کسی کو نہیں توڑ سکتا۔ پیپلز پارٹی کا یہ گروپ خود اقتدار میں جانے کا خواہش مند تھا اور انہوں نے اپنی ان کمزوریوں کو سارا بوجھ پیپلز پارٹی کی لیڈرشپ کے کندھوں پر ڈالنے کی کوشش کی۔ یہ سب لوگ اقتدار کے بھوکے تھے اور اقتدار میں جانے کے لیے مختلف حیلے بہانے کر رہے تھے۔ انہوں نے یہ سب کچھ پارٹی اور جمہوریت کو بچانے کے نام پر کیا کیونکہ اس ملک میں لوگوں کے غم و غصے سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ اپنی پارٹی سے غداری کرتے وقت اس طرح کی کہانیاں لوگوں کو سنائیں۔

[illegible]

[illegible]

بلکہ ان کی پارٹی لیڈرشپ نے کی تھیں۔

انہوں نے میرے چہرے کے تاثرات دیکھے تو اپنی پارٹی کی پچھلی دو حکومتوں کی کارکردگی کو بیان کرنے لگے۔ وہ بولے باقی باتیں چھوڑیں۔ آپ صرف یہ دیکھیں کہ پیپلز پارٹی کے دور میں غربت کتنی کم تھی اور آج کتنی بڑھ گئی ہے۔ آپ کو سب باتیں واضح ہو جائیں گی۔

میں نے کہا زرداری صاحب! فرض کرتے ہیں کہ اگر آج آپ کو جیل سے رہا کر دیا جائے تو کیا آپ سیاست میں رہیں گے یا پھر ملک چھوڑ دیں گے۔ وہ بولے کہ رہائی کے بعد وہ پہلے اپنا علاج کرانے کے لیے ملک سے باہر جائیں گے لیکن ان کی کوشش ہوگی کہ وہ پاکستانی سیاست میں اپنا کردار ادا کرتے رہیں۔

میں نے کہا کہ زرداری صاحب! بینظیر بھٹو صاحبہ پاکستان واپس آ کر اپنی سیاسی جنگ یہاں کیوں نہیں لڑتیں تو وہ بولے ان کے خیال میں وہ یہاں سے دور بیٹھ کر اپنی سیاسی لڑائی زیادہ بہتر اور موثر انداز میں لڑ رہی ہیں۔ اگر آج وہ واپس آ جائیں تو انہیں فوری طور پر جیل میں ڈال دیا جائے گا۔

میں نے کہا کہ زرداری صاحب! یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ انصاف حاصل کرنے کے لیے عدالتوں سے رجوع کریں۔

زرداری صاحب نے قہقہہ لگایا اور بولے کہ میں کس عدلیہ کی بات کر رہا ہوں جو ابھی تک جنرل مشرف کے جاری کیے گئے پی سی او پر حلف لے کر اپنی نوکری کر رہی ہے۔ وہ بولے باقی چھوڑیں۔ اب تو وکیل یہ خود کہتے ہیں کہ یہ عدلیہ کرپٹ ہے اور وہی کچھ کر رہی ہے جو انہیں ایک فوجی حکم دیا جاتا ہے۔

زرداری صاحب نے کہا کہ پاکستانی وکیلوں نے بڑی شاندار جدوجہد کی تھی اور اب جسٹس کے پی سی او کے تحت لیے گئے حلف کے خلاف جدوجہد کر کے عدالتوں کو بےنقاب کر رہے ہیں۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

www.freepdfpost.blogspot.com

allurdupdfnovels.blogspot.com

سیف الرحمٰن کے ساتھ ہونے والی ٹیلیفونک گفتگو کو ٹیپ کر کے لندن کے ایک اخبار میں چھپوایا گیا تو ملک قیوم سے استعفیٰ لے لیا گیا تھا۔ یہ بھی کہانی ہے کہ جب 2008ء میں پیپلز پارٹی کی حکومت برسر اقتدار آئی تو یہی ملک قیوم پیپلز پارٹی کے دور میں بھی ایڈووکیٹ جنرل کے عہدے پر فائز رہے۔ اس وقت آصف زرداری صاحب کو ملک قیوم کی بڑی ضرورت تھی کیونکہ انہی کے ذریعے ہی بینظیر اور ان کے سوئٹزرلینڈ میں منی لانڈرنگ کے الزامات پر چلنے والے مقدمات کو ختم کرانا تھا۔ یہ بھی تاریخ کا عجیب المیہ ہے کہ وہی ملک قیوم جنہوں نے بینظیر بھٹو اور آصف زرداری کو ایک کرپشن کیس میں سزا سنائی تھی انہوں نے ہی ایڈووکیٹ جنرل کے اختیارات استعمال کرتے ہوئے سوئٹزرلینڈ میں ان دونوں میاں بیوی کے خلاف مقدمات ایک خط لکھ کر ختم کرا دیے تھے۔ وہ جو کبھی قاتل کے دشمن تھے آج ان کے دوست بن گئے تھے۔

آصف زرداری ابھی بھی بول رہے تھے کہ آپ پاکستان کی اس عدلیہ سے انصاف اور قانون کی حفاظت کی توقع رکھتے ہیں جو اب اس ملک کے اس قانون کی حفاظت نہیں کر رہی جس کے تحت [illegible] پاکستانی عدلیہ نے قانون کی حکمرانی کے نام پر بہت سارے [illegible] ہیں۔ ان لوگوں نے اس قانون کی حفاظت کرنے کا حلف اٹھایا تھا لیکن [illegible] آپ یہ بات کرتے ہیں۔ [illegible] بہت بھاری ہو کر رہ گئی ہے۔

میں نے آصف زرداری کی آواز میں ایک عجیب سی تلخی محسوس کی۔

میں نے کہا کہ زرداری صاحب! کیا وہ جنرل مشرف کی [illegible] اس سے پہلے حکومت سے کوئی ڈیل کرنے کے لیے تیار تھے تو وہ یہاں کیوں نہیں؟ میں ان سے ڈیل کرنے کے لیے تیار ہوں اگر جنرل مشرف اقتدار چھوڑ دیں۔ جنرل مشرف اقتدار چھوڑ کر گھر چلے جائیں۔ وہ انہیں ایک محفوظ راستہ دینے کو تیار ہیں۔

میں نے کہا زرداری صاحب! آپ جون کی اس تپتی دوپہر میں ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کر یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ جنرل مشرف کو معاف کر کے گھر جانے کے لیے ایک محفوظ راستہ دینے پر تیار ہیں لیکن ان کی پارٹی نے تو سینیٹ آف پاکستان میں ایک بل پیش کر رکھا ہوا تھا جس کے تحت قانون توڑنے والے تمام جرنیلوں کو قانونی طور پر سزا دینے کا مطالبہ کیا گیا تھا جبکہ وہ یہاں بیٹھے ان تمام جرنیلوں کو محفوظ راستہ دینے کے لیے تیار ہیں جنہوں نے ملک کے قوانین توڑ کر اپنی حکومتیں بنائی تھیں۔

زرداری صاحب بولے کہ ان کی پارٹی کے سینیٹ میں بل موو کرنے کے باوجود وہ ابھی بھی جنرل مشرف کو محفوظ راستہ دینے کے لیے تیار ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر جنرل مشرف آرام سے اقتدار سیاستدانوں کے حوالے کر کے گھر چلے جائیں تو ان پر مقدمات چلانے کے بجائے انہیں گھر جانے دینا چاہیے۔ وہ پارٹی کے اس فیصلے کے حق میں نہیں ہیں کہ ان جرنیلوں پر غداری کے مقدمات ہونے چاہئیں جنہوں نے ماضی میں قانون توڑا تھا۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہر شخص کو سیاسی طور پر [illegible] چاہیے۔ لوگ ابھی بھی سیاستدانوں کو [illegible] تیار ہیں اور انہیں اس ملک پر حکومت کرنے کا حق ملنا چاہیے۔ ہمیں وہ دن [illegible] جب لوگ اپنے سیاسی لیڈروں کی بات سننا بھی چھوڑ دیں گے اور اگر کوئی ایسا دن آیا تو یہ اس ملک کی بہت بڑی بدقسمتی ہوگی۔ اسٹیبلشمنٹ کو چاہیے کہ وہ سیاسی قوتوں کو تسلیم کرے اور انہیں اپنا سیاسی کردار ادا کرنے دے۔ لیکن یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ یہ طاقتور حلقے ابھی بھی اس بات کے لیے تیار نہیں۔

میں نے کہا کہ زرداری صاحب! آپ کی پارٹی کے وائس چیئرمین کی آئی ایس آئی کے جنرل احتشام ضمیر سے کئی ملاقاتیں ہو چکی ہیں تاکہ آپ کے ساتھ کوئی ڈیل کی جا سکے۔ زرداری صاحب نے مجھے گھور کر دیکھا اور [illegible] انکار کر [illegible] کہ جنرل احتشام ضمیر سے ملے کب تھے۔

میں نے کہا کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ پیپلز پارٹی نے مخدوم امین فہیم کی شکل میں ایک نیا محفوظ پیپلز پارٹی کا لیڈر بنا کر شاید ایک اور [illegible] کھڑا کر دیا ہے۔

وہ بولے نہیں یہ غلط بات ہے۔ پیپلز پارٹی میں بڑے عرصے سے رواج تھا کہ جب کوئی بھی بھٹو جیل جاتا تو کوئی دوسرا پارٹی کے معاملات چلانے ہوتے تھے۔ جب ذوالفقار علی بھٹو جیل گئے تو بیگم نصرت بھٹو نے پارٹی چلائی۔ اس سے بڑھ کر یہ بات کہ پیپلز پارٹی ایک ڈیموکریٹک پارٹی ہے اور اس طرح کی تبدیلیاں جمہوریت کا حصہ ہیں۔ اس پر تنقید کرنے کے بجائے اس کی تعریف ہونی چاہیے۔

میں نے زرداری صاحب کو دوبارہ ماضی کی طرف لے جانے کی کوشش جاری رکھی اور کہا کہ ان کی اپنی پارٹی پر یہ الزام لگتا ہے کہ جب سیاسی پارٹیوں اور ان کے لیڈروں کو طاقتور اسٹیبلشمنٹ کے

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

حیثیت میں جب آپ لوگ حکومت میں آئے تو انہوں نے اپنے سیاسی مخالفین کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ [illegible] کے ساتھ کام کرتے ہوئے [illegible] میں نے انہیں یاد دلایا کہ 1993ء میں جب غلام اسحٰق خان اور نواز شریف کے درمیان لڑائی شروع ہوئی تو بینظیر بھٹو نے نواز شریف کے خلاف غلام اسحٰق خان کا ساتھ دیا تھا کیونکہ غلام اسحٰق خان وہی تھے جنہوں نے 6 اگست 1990ء کو ان کی حکومت کرپشن کے الزامات لگا کر برطرف کی تھی۔ آصف زرداری پر بھی کیس انہوں نے بنائے تھے۔

زرداری صاحب نے میری اس بات سے اتفاق نہیں کیا کہ ان کی پارٹی غلام اسحٰق خان کے ہاتھوں میں کھیلی تھی بلکہ ان کے بقول انہوں نے الٹا غلام اسحٰق خان کو اپنے سیاسی مفادات کے لیے استعمال کیا تھا جنہوں نے محض تین سال پہلے ان کی حکومت ڈس مس کی تھی۔ زرداری صاحب مجھے کہنے لگے کہ تم لوگ یہ بات کیوں بھول جاتے ہو کہ وہی غلام اسحٰق خان جنہوں نے تین سال پہلے انہیں جیل میں ڈالا تھا انہوں نے ہی ان سے حلف لے کر نگران حکومت میں وزیر بنایا۔ آصف زرداری سے وزارت کا حلف لے کر غلام اسحٰق خان نے یہ اعتراف کیا تھا کہ آصف زرداری پر لگائے گئے تمام الزامات غلط تھے۔ ان کے لیے یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ کرپشن کے تمام الزامات جھوٹے تھے۔ نواز شریف اور غلام اسحٰق کے درمیان اختلافات پیدا ہو چکے تھے اور دونوں بینظیر بھٹو کی حمایت کی سیاسی طاقت حاصل کرنے کے لیے بے چین تھے۔ ان دونوں کی کشمکش کا فائدہ آصف زرداری کو ہوا کہ سب سے پہلے انہیں حوالات سے رہا کیا گیا۔ اس دوران بینظیر بھٹو ملک سے باہر چلی گئیں۔ وہاں تک بینظیر بھٹو کو نواز شریف اور غلام اسحٰق خان کے پیغامات ملے۔ دونوں بینظیر بھٹو کے ساتھ ڈیل کرنا چاہتے تھے۔ نواز شریف اور غلام اسحٰق خان اپنی اپنی سیاسی چالیں چل رہے تھے تو بینظیر بھٹو نے اپنے پتے بھی بڑی ہوشیاری سے کھیلے تھے۔

آصف زرداری [illegible] یہ سب باتیں بتا رہے تھے اور میں چپ چاپ سن رہا تھا۔ بینظیر بھٹو نے اپنے [illegible] نواز شریف اور اسحٰق خان دونوں کے ساتھ [illegible] کا حربہ استعمال کیا تھا۔ بینظیر بھٹو [illegible] نواز شریف کے اقتدار کی [illegible] بینظیر بھٹو [illegible] اپنے حق میں [illegible] انتخابات میں [illegible]

زرداری صاحب کے بقول پیپلز پارٹی نے 1993ء میں اپنی حکمت عملی کے تحت [illegible] کیا تھا۔

میں نے کہا کہ زرداری صاحب اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ 1993ء میں جو انتخابات ہوئے تھے وہ شفاف تھے۔

زرداری صاحب نے کہا میں نے کب کہا ہے کہ وہ انتخابات شفاف تھے۔ اس ملک میں تو کبھی بھی شفاف انتخابات نہیں ہوئے۔

میں نے کہا کہ زرداری صاحب سننے میں آتا ہے کہ جب آپ لوگ غلام اسحٰق خان سے مذاکرات کر رہے تھے اس وقت بینظیر بھٹو نے انہیں یہ بھی یقین دہانی کرائی تھی کہ وہ انہیں دوبارہ صدر بنوانے کے لیے اپنی پارٹی کے ووٹ دلوائیں گی۔ لیکن جب یہ موقع آیا تو پیپلز پارٹی اور اس کی قیادت اپنے وعدے سے مکر گئی اور یوں غلام اسحٰق خان کو عمر کے آخری حصے میں پشاور میں واقع اپنے گھر جانا پڑا۔

آصف زرداری بولے کہ اگر غلام اسحٰق خان اپنے آپ کو دھوکہ دینا چاہتے تھے تو یہ اور بات تھی ورنہ پیپلز پارٹی نے ان کے ساتھ اس طرح کا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔

میں نے کہا کہ زرداری صاحب! چلیں ذرا آگے چلتے ہیں۔ 1993ء میں آپ کی حکومت بن گئی۔ ماضی بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ آپ لوگوں نے ایک دفعہ پھر عدالت اور دوسرے اداروں سے لڑائی شروع کر دی۔

زرداری صاحب بولے ہرگز نہیں، یہ دراصل اسٹیبلشمنٹ تھی جو ہمارے خلاف لڑ رہی تھی۔ وہ بولے میں چیف جسٹس سجاد علی شاہ، غلام اسحٰق خان، نواز شریف اور الطاف حسین کو [illegible] ہمارے خلاف لڑ رہے تھے۔ وہ بیچارے تو وہ [illegible] سیاسی کردار تھے جنہیں [illegible] طاقتور اسٹیبلشمنٹ ہمارے خلاف استعمال کر رہی تھی۔ یہی اسٹیبلشمنٹ تھی جس نے 1996ء میں پیپلز پارٹی کی حکومت کا ایک دفعہ پھر تختہ الٹا۔ یہ اسٹیبلشمنٹ پیپلز پارٹی کو اقتدار سے باہر رکھنے کی کوشش کرتی رہی تھی [illegible] بینظیر بھٹو اقتدار سے باہر رکھنے کے لیے وہ سیاسی مخالفین کے ہاتھوں استعمال ہوتے رہے تھے۔

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

آصف زرداری کا کہنا تھا کہ جنرل اسلم بیگ، جنرل حمید گل اور جنرل اسد درانی کی طرف سے
انھوں نے 1988ء میں پیپلز پارٹی کے خلاف آئی جے آئی کے ذریعے نواز شریف اور دیگر [illegible]
[illegible] کے نام سے [illegible] تھا تاکہ بی بی کی حکومت ختم کی جا سکے اور بینظیر بھٹو
اقتدار میں نہ آ سکیں۔ پھر جنرل درانی کے ذریعے سیاستدانوں میں چالیس کروڑ روپے آئی ایس آئی
نے بانٹے تھے۔

ان کے بقول نواز شریف اسٹیبلشمنٹ کے اس بڑے کھیل میں محض ایک اداکار کا رول ادا کر
رہے تھے جبکہ [illegible] یہ اعتراف کر چکے تھے کہ وہ بینظیر
بھٹو کی حکومت گرانے کی سازش میں شریک تھے۔

زرداری صاحب نے مجھے کہا کہ میں طارق رحیم کا 1996ء میں دیا گیا وہ بیان پڑھوں جب
بینظیر بھٹو کی حکومت توڑ دی گئی تھی۔ وہ [illegible] پاکستان کی یہ بڑی خوبصورتی ہے کہ کوئی بات چھپی نہیں رہتی
اور ہر بات بہت جلد سامنے آ جاتی ہے۔

زرداری صاحب نے مجھے کہا کہ آپ دیکھیں کہ فوج اب شہباز شریف کی بیٹیوں کے ساتھ کیا
کر رہی ہے۔ ہر کسی کو پتہ ہے کہ میر ظفر اللہ جمالی کا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن جمالی
صاحب اپنے آپ کو شہباز شریف کی بیٹیوں کے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک سے بری الذمہ قرار
نہیں دے سکتے کیونکہ جمالی ہی اس ملک کے وزیراعظم تھے۔ زرداری صاحب کا خیال تھا کہ اگر
معاملات جمالی صاحب کی مرضی کے مطابق نہیں چلائے جا رہے تھے یا وہ جیسے حکومت کرنا چاہتے تھے
انھیں نہیں کرنے دی جا رہی تھی تو بہتر تھا کہ وہ استعفیٰ دے دیتے۔ وزیراعظم جمالی کو ایک فوجی
ڈکٹیٹر [illegible] کی تکمیل کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا۔ وہ تمام لوگ جو جنرل مشرف کا
ساتھ دے رہے تھے یا اس کے ساتھ کام کر رہے تھے وہ اس ملک کے خلاف ہونے والے تمام
گناہوں کے حصہ دار تھے۔

میں نے آخر وہ [illegible] سوال پوچھ لیا جس کے لیے میں کافی دیر سے کوشش کر رہا تھا۔
میں نے کہا کہ زرداری صاحب! یہ کہا جاتا ہے کہ مرتضیٰ بھٹو کو آپ نے قتل کرایا تھا۔
میرے سوال کا [illegible] مجھے انھوں نے کہا کہ وہ قسم کھاتے ہیں کہ ان لوگوں نے مرتضیٰ کو قتل کرایا تھا

[illegible] اس حقیقت سے [illegible] آنسو بہاتے رہے لیکن کسی
نے کبھی اس بات پر اعتبار نہیں کیا۔ مرتضیٰ بھٹو [illegible] میں ان لوگوں نے قتل کیا تھا جنھوں نے بینظیر بھٹو
کی حکومت توڑی تھی۔ آصف زرداری نے ایک بات [illegible] کہ جس شخص نے بینظیر بھٹو
کی حکومت توڑی تھی دراصل اسی نے ہی مرتضیٰ بھٹو کو قتل کرایا تھا۔ اب لوگوں کو اس بات کا بھی علم ہے
کہ مرتضیٰ بھٹو کا قتل بھی ایک طرح کا خونی ڈرامہ تھا [illegible] آئی ہے۔ پیپلز پارٹی
کوئی چھوٹی پارٹی نہیں ہے اور نہ ہی یہ کسی ایک علاقے یا ضلع کی پارٹی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم
پاکستان کے لوگوں کے لیے جدوجہد کرتے ہیں تو یہ طاقتور قوتیں ہمیں یا تو قتل کر دیتی ہیں یا جیلوں میں
ڈال دیتی ہیں۔

میں نے کہا کہ زرداری صاحب! اگر یہ بات ہے تو پھر ماضی کے ایک دوسرے کے خون کے
پیاسے دشمن بینظیر بھٹو اور نواز شریف آج کیسے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر جنرل مشرف کے خلاف
جدوجہد کرنے کے لیے عہد و پیماں کر رہے ہیں۔

زرداری صاحب نے سنجیدگی سے کہا کہ دیکھو یہ سیاسی جدوجہد کا دور ہے اور ہر کسی کو اس
جدوجہد میں اپنا حصہ ڈالنا چاہیے۔ سیاست میں کبھی بھی کوئی مستقل دشمنی نہیں ہوتی کیونکہ ہم کوئی ذاتی
لڑائی نہیں بلکہ ایک مشترکہ کاز کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں جس کا نام جمہوریت ہے۔ یہ لڑائی کسی ایک
شخص کے لیے نہیں بلکہ ایک کاز کے لیے لڑی جا رہی ہے۔

میں نے کہا کہ زرداری صاحب! عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ نواز شریف اور بینظیر بھٹو کی ماضی کی
سیاسی لڑائیوں نے اس ملک کی جمہوریت اور سیاسی نظام کو اتنا کمزور کر دیا ہے کہ آج فوج ایک مرتبہ پھر
اقتدار میں آ گئی ہے۔

وہ کہنے لگے کہ دراصل نواز شریف ہمیشہ سے اسٹیبلشمنٹ کے بہت نزدیک اور ان کے ڈارلنگ
رہے ہیں۔ اسٹیبلشمنٹ نے انھیں استعمال کر کے انھیں بینظیر بھٹو سے لڑایا۔ اب اسٹیبلشمنٹ کو نواز شریف
کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ اب ان کا "ڈارلنگ بچہ" کوئی اور ہے۔ اب اسٹیبلشمنٹ اپنے نئے ڈارلنگ
کو استعمال کرے گی۔ اپنے مقاصد پورے کرنے کے لیے ہماری اسٹیبلشمنٹ مختلف مواقع پر مختلف
ڈارلنگ پیدا کر کے انھیں استعمال کرتی رہتی ہے۔ اب نواز شریف کی افادیت ختم ہو گئی ہے تو

www.freepdfpost.blogspot.com

!!!allurdupdfnovels!!!!!blogspot!!!com!!!

انہیں نے اب ایک [illegible] ہے۔

[illegible] کے بعد [illegible] جنرل مشرف کے ساتھ [illegible]
پاکستان [illegible] کر رہے تھے۔

میں نے پوچھا کہ زرداری صاحب [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
سیاست میں [illegible] ہے۔

مجھے [illegible] زرداری صاحب کے [illegible]
[illegible] زرداری صاحب [illegible]
[illegible]
[illegible] تھے۔

زرداری صاحب [illegible] ایک قیدی ہوں۔ [illegible] صحافیوں کے پیچھے [illegible]
[illegible] ہے۔

میں [illegible] آصف زرداری نے میرے سوال کا ایک [illegible] جواب نہیں دیا
[illegible]
[illegible]
[illegible]
کی طرح وہ اپنے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
ہوں گے بلکہ ملک میں نئے انتخابات بھی ہوں گے اور پیپلز پارٹی اقتدار میں آئے گی۔

○○○

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] تھے۔

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
یہ [illegible] کی طرح پاکستان میں نئی شروعات چاہتے تھے۔

ایک دن پھر میرے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ لائن پر دوسری طرف پھر ڈاکٹر قیوم سومرو تھے۔ انہوں نے صرف اتنا کہا کہ صاحب آپ سے بات کریں گے۔ آصف زرداری صاحب نے ہیلو کہنے کے بعد اپنے نعرے کی تشریح کرنی شروع کر دی کہ کس طرح اس ملک کو نئی شروعات کی ضرورت ہے اور اس کے لیے انہیں ہر طبقہ فکر کے لوگوں کا تعاون درکار ہے۔ وہ کہنے لگے کہ وہ اسلام آباد آئیں گے تو صحافیوں سے ملیں گے۔

کچھ دنوں بعد ڈاکٹر قیوم سومرو کا فون آیا۔ پتہ چلا کہ آصف زرداری صاحب جو اس دوران دبئی چلے گئے تھے، 14 اپریل 2004ء کو لاہور کے ہوائی اڈے پر پاکستانی صحافیوں کے ہمراہ آ رہے تھے۔ ان کے استقبال کے لیے پورے ملک سے پیپلز پارٹی کے کارکن اکٹھے ہوں گے۔ مجھے بھی انہوں نے دبئی آنے کی دعوت دی۔

بات کچھ واضح ہو رہی تھی۔ بینظیر بھٹو کو آصف زرداری اور ان کے حامیوں نے اس بات پر قائل کر لیا تھا کہ وہ پچھلے پانچ سالوں میں پارٹی کے لیے کوئی ایسا ماحول پیدا نہیں کر سکی تھیں جس سے نہ صرف وہ واپس آ سکتیں بلکہ پارٹی بھی اقتدار میں آتی۔ زرداری صاحب کی فوجیوں سے جیل کے دنوں میں ہونے والی خفیہ ملاقاتیں رنگ لا رہی تھیں۔ فوجیوں سے بات چیت کر کے آصف زرداری کو یوں لگا کہ [illegible] پر تو اعتماد کرنے کو تیار ہے لیکن بینظیر بھٹو پر نہیں۔ یوں پی پی اور زرداری صاحب نے یہ

www.freepdfpost.blogspot.com

!!!allurdupdfnovels!!!blogspot!!!com!!!

لہذا پیپلز پارٹی ایک نئی چال چل کر دیکھتے ہیں اور اس دفعہ فوج سے ڈیل زرداری صاحب کریں گے کہ بینظیر بھٹو؟ آصف زرداری سے خفیہ مذاکرات کرنے والوں نے انہیں یہ یقین دلایا تھا کہ اگر وہ لاہور میں اپنی سیاسی قوت کا مظاہرہ کر کے دکھا دیں تو شاید جنرل مشرف کو راضی کر کے اس ملک میں نئے انتخابات کرائے جا سکتے ہیں۔ آصف زرداری نے یہی کہانی بینظیر بھٹو کو بڑی اچھی طرح پڑھا دی تھی۔ مرتے کیا نہ کرتے کی صورت میں بینظیر بھٹو آصف زرداری کے پیچھے بیٹھ کر اپنی پارٹی کی قیادت سونپنے پر تیار ہو گئی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ آصف زرداری کے دبئی سے لاہور آنے سے پہلے ڈاکٹر شاہد مسعود نے جب دونوں میاں بیوی کو ساتھ بٹھا کر اے آر وائی ٹی وی کے لیے انٹرویو کیا تو اس میں انہوں نے ایک بڑا خوبصورت سوال پوچھا تھا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ پاکستانی فوج ان پر (بینظیر بھٹو) اعتماد کرنے کو تیار نہیں ہے جبکہ ان کے شوہر آصف زرداری پر وہ بھروسہ کرنے کو تیار ہے۔ بینظیر بھٹو نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا تھا کہ پاکستانی فوجی آصف زرداری پر شاید اس لیے اعتماد کرنے لگ گئے ہیں کہ وہ ایک ملٹری کالج پٹارو سندھ کے پڑھے ہوئے ہیں جبکہ وہ (بینظیر بھٹو) ایک سویلین ہیں۔ پاکستانی فوجی ابھی بھی ایک ایسے شخص کے ساتھ ڈیل کرنے اور اعتبار کرنے پر تیار ہیں جو فوجی نہ سہی لیکن ان کے فوجی سکول میں پڑھا ہوا تھا۔

بینظیر بھٹو کا یہ جواب عقلمندوں کے لیے بطور اشارہ سمجھنے کے لیے کافی تھا کہ یہ سارا میلہ آصف زرداری پاکستانی فوج کے ان جرنیلوں سے ملاقاتوں کے بعد سجا رہے تھے جو مخدوم امین فہیم کے ساتھ رات کے اندھیرے میں ان سے ملاقاتیں کرتے تھے۔

جب میں دبئی ایئرپورٹ پر اترا تو میرے ذہن میں یہی خیال تھا کہ میں دیگر لیڈروں کی طرح بینظیر بھٹو سے بھی مل کر ان کی اسی طرح کی ایک سیاسی پروفائل کرنے کی کوشش کروں۔ میں نے ان کے ترجمان فرحت اللہ بابر سے مدد چاہی جو اس وقت اسلام آباد میں تھے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ بینظیر بھٹو سے بات کر کے وقت لے کر دیں گے۔ جب میں نے دو تین دفعہ فرحت اللہ بابر کو یاددہانی کرائی تو مجھے احساس ہوا کہ وہ مجھے محض ٹال رہے ہیں۔ میں نے بعد میں ادھر ادھر سے سن گن لی تو پتہ چلا کہ آصف زرداری نے بینظیر بھٹو پر یہ پابندی لگائی ہوئی تھی کہ وہ کسی بھی پاکستانی صحافی سے نہیں ملیں گی اور نہ ہی کوئی انٹرویو دیں گی تا کہ میڈیا کی تمام تر توجہ ان پر اور ان کے مقاصد پر فوکس رہے۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان آنے سے چند گھنٹے پہلے جب آصف زرداری نے اس ہوٹل میں آ کر پریس کانفرنس کی جہاں پاکستانی صحافی ٹھہرے ہوئے تھے تو بینظیر ان کے ساتھ نہیں آئیں۔ ان کے ساتھ صرف بلاول زرداری تھے۔ جب ہم سب لوگ دبئی ایئرپورٹ پر پہنچے تو پیپلز پارٹی کے کچھ جیالوں نے ایئرپورٹ پر زرداری صاحب کے حق میں نعرے بازی شروع کر دی۔ دو منٹ بعد دبئی پولیس کے ایک سپاہی نے آ کر صرف اتنا کہا کہ اگر اس کے بعد کسی نے نعرہ مارا تو ان سب کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ اس کے بعد کسی کونے سے کوئی آواز نہیں آئی۔

جہاز کی روانگی میں مسلسل تاخیر ہو رہی تھی۔ ہمیں کئی کہانیاں سنائی جا رہی تھیں۔ چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ ادھر پاکستان سے یہ خبریں آ رہی تھیں کہ وہاں پاکستان پیپلز پارٹی کے ورکرز چاروں صوبوں سے اکٹھے ہو کر لاہور ایئرپورٹ کی طرف جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ چوہدری پرویز الٰہی پنجاب کی روایتی ظالمانہ پولیس فورس کے ساتھ پیپلز پارٹی کے ورکروں کی ہڈیاں توڑنے میں لگے ہوئے ہیں۔ جہاز پر سوار ہونے سے پہلے آصف زرداری نے ایک عجیب سی بات کی۔ انہوں نے اپنے پارٹی ورکروں سے کہا کہ وہ ایئرپورٹ کی طرف نہ آئیں۔ جو جہاں ہے وہ وہیں رک کر بیٹھ کر دھرنا دے دے۔ جہاز کی روانگی کچھ اس طرح رکھی گئی تھی کہ اس نے صبح سویرے ہی لاہور ایئرپورٹ پر اترنا تھا۔ ہم صحافیوں کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر اتنی جلدی لاہور ایئرپورٹ پر اترنے کی کیا وجہ تھی کیونکہ اس وقت تو پارٹی ورکرز کے لیے انہیں ایئرپورٹ آ کر ریسیو کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اسی کنفیوژن میں ہم صحافی جہاز پر سوار ہوئے اور ہم نے اپنے بورڈنگ کارڈز پر لکھے ہوئے نمبروں کے مطابق سیٹیں ڈھونڈنے کی کوشش کی تو ہمیں کہا گیا کہ کسی بھی جگہ بیٹھ جاؤ کیونکہ یہ چارٹرڈ جہاز تھا۔ زرداری صاحب تمام راستہ نہیں سوئے۔ وہ ہر ایک صحافی کے ساتھ اپنے روایتی انداز میں گپ شپ کرتے رہے۔ جب جہاز صبح سویرے لاہور کی فضاؤں میں پہنچا تو یکدم ماحول میں گرمی آ گئی۔ ڈاکٹر شاہد مسعود سب سے زیادہ پھرتیاں دکھا رہے تھے۔ وہ کبھی بھاگ کر پائلٹ کے کیبن میں جاتے تو کبھی آصف زرداری کے کان میں سرگوشیاں کرتے پائے جاتے۔ آہستہ آہستہ یہ بھنبھناہٹ شروع ہو گئی کہ شاید جہاز کو لاہور ایئرپورٹ پر نہ اترنے دیا جائے۔ آخر بریکنگ نیوز ڈاکٹر شاہد مسعود نے ہی سرگوشی کی شکل میں ایک دو صحافیوں کو دی کہ کھیل ختم ہو گیا ہے۔ ہمیں پھر بھی یقین نہیں آ رہا تھا لیکن جب جہاز ایئر

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdf!!novels!!blogspot!!com!!

پورٹ پر اترا اور وہاں جو کچھ ہمیں دیکھنے کو ملا اس سے یہ اندازہ ہو گیا کہ ڈاکٹر شاہد مسعود کی بات ٹھیک تھی کہ جہاز اترنے سے پہلے ہی زرداری صاحب کا فوجی جرنیلوں کے ساتھ کیا گیا معاہدہ ہوا میں ہی ختم ہو چکا تھا۔ اس معاہدے کے واحد گواہ مخدوم امین فہیم آصف زرداری صاحب کی بغل میں تھے۔ جہاز کے اندر کسی کو کوئی اندازہ نہیں تھا کہ ایئرپورٹ پر چاروں طرف پھیلے ہوئے پنجاب پولیس کے کمانڈوز کیا کرنے والے تھے۔ پیپلز پارٹی کے چند جیالوں نے آصف زرداری کا مورال بلند کرنے کے لیے نعرے بازی شروع کر دی۔ کافی دیر تک جہاز کے دروازے بند رہے۔ یہ نعرے گونجتے رہے۔ آخر جہاز کا دروازہ کھلا اور اس کے ساتھ ہی یہ نعرے یکدم بند ہو گئے۔ ایک نوجوان ایس پی بہت اپنے کمانڈوز کے ساتھ اندر آیا۔ زرداری صاحب نے اسے دور سے آواز دے کر اپنے پاس بلایا اور کہا کہ تمہارے پاس گرفتاری کا وارنٹ ہوگا۔ وہ دکھاؤ اور مجھے لے جاؤ۔ ایس پی بہت نے آتے ہی آصف زرداری کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھا۔ ہمارے ذہن میں تھا کہ شاید آصف زرداری اور ان کے جیالے اس گرفتاری پر مزاحمت کریں گے اور ایئرپورٹ سے باہر نکل کر اپنی پارٹی کے جلوس کی قیادت کریں گے۔ ایک ہی لمحے میں ساری بازی پلٹ گئی تھی۔ آصف زرداری اپنے ساتھیوں کے امین مخدوم امین فہیم کا ہاتھ پکڑ کر دوسرا ہاتھ ایس پی بہت کے ہاتھ میں ڈال کر تیزی سے ہوائی جہاز سے اترے اور سیڑھیوں کے ساتھ کھڑی ہوئی مرسیڈیز میں بیٹھ کر وہاں سے سیدھے لاہور میں واقع اپنے زرداری ہاؤس کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم صحافی ہکا بکا ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور ہمیں کچھ نہیں آ رہی تھی کہ اب کیا ہو گا۔ ہم تو یہ کچھ کر دن گئے تھے کہ شاید ہم پاکستانی تاریخ کے ایک اہم واقعے اور تبدیلی کے عینی شاہد بننے والے تھے کہ آصف زرداری کے لاہور ایئرپورٹ پر اترتے ہی ملک میں نئے انتخابات کا اعلان ہو جائے گا اور بقول ان کے ان کی پارٹی اقتدار میں آ جائے گی۔

ہمیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس ملک میں انقلاب آئے یا نہ آئے، تھوڑی دیر بعد ہم صحافیوں کے سروں پر چوہدری پرویز الٰہی کے کمانڈوز کی شکل میں ایک قیامت ضرور آنے والی تھی۔ جونہی ہم صحافی جہاز سے باہر نکلے چوہدری پرویز الٰہی کے حکم پر ہمیں ایک لائن میں کھڑا کر کے ان کمانڈوز نے ہماری انتہائی بدتمیزی کے ساتھ تلاشی لینا شروع کر دی۔ سب صحافیوں کو کہا گیا کہ اپنے موبائل اور کیمرے پولیس کے حوالے کر کے چپ چاپ بسوں میں جا کر بیٹھ جائیں۔ وہ اس وقت تک باہر نہیں نکل سکتے تھے جب

ٹی وی چینلز سے تھا۔ یہ سارے صحافی جن میں انتہائی سینئر قابل احترام دوست بھی شامل تھے جو پہلے پہنچ جائے اور جہاز کے سفر کی وجہ سے پہلے ہی چڑچڑے ہوئے ہو رہے تھے۔ اوپر سے آصف زرداری صاحب ان کی نظروں کے سامنے ہی اپنا کھیل کھیل کر نکل گئے تھے۔ وہ صحافی جو اس امید پر پچھلے دو دنوں میں پاکستان سے دبئی اور دبئی سے اب لاہور کا سفر کر کے اس امید پر آئے تھے کہ شاید وہ تاریخ کو اپنی آنکھوں کے سامنے بنتے دیکھیں گے وہ اب پرویز الٰہی کی پولیس کے ہاتھوں ذلیل ہونے والے تھے۔ میں لاہور کے صحافیوں کو یہ داد دوں گا خصوصاً ماہر میر کو جنہوں نے پنجاب پولیس کے ان کمانڈوز کو اپنے لیپ ٹاپ، موبائل فونز اور کیمروں کو ہاتھ نہیں لگانے دیا۔ ان سب نے وہیں ہوائی جہاز پر اعلان کیا کہ وہ کسی بھی صورت میں ان پولیس والوں کو یہ چیزیں چھیننے کی اجازت نہیں دیں گے۔ صحافی بھی بپھرے ہوئے تھے تو کمانڈوز کو بھی چوہدری پرویز الٰہی نے ہدایات دے رکھی تھیں کہ ان تمام صحافیوں کی تواضع کرنی ہے جو جرأت کر کے آصف زرداری کے ساتھ ان کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے آ رہے تھے۔ کافی دیر تک صحافیوں اور پولیس والوں میں سخت جملوں کا تبادلہ ہوتا رہا۔ آخر پولیس والوں نے صحافیوں کو دھکے دے کر نکالنا شروع کر دیا۔ پولیس کمانڈوز کے دھکوں کا سب سے زیادہ شکار ہمارے دوست مظہر طفیل ہوئے جنہیں بڑے برے طریقے سے ان کمانڈوز نے مارا۔ کچھ اور صحافیوں کو بھی مارنے کی کوشش کی گئی۔ وہاں بڑا عجیب سا منظر تھا۔ صحافی کہہ رہے تھے کہ آصف زرداری انہیں جان بوجھ کر پنجاب پولیس کے کمانڈوز کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود اپنی جان بچا کر نکل گئے تھے۔ انہیں چاہیے تھا کہ وہ پہلے ان صحافیوں کو باحفاظت ایئرپورٹ سے نکلواتے اور اس کے بعد ہی وہ ایس پی بہت کا ہاتھ پکڑ کر جہاز سے باہر نکلتے لیکن وہ تو بہت جلدی میں تھے۔ یوں پنجاب پولیس کے کمانڈوز نے صحافیوں پر تشدد کرنے کے بعد ان کے موبائل فونز اور کیمرے قبضے میں لے لیے۔ اس وقت کے ایس ایس پی آپریشنز آفتاب چیمہ کی زیر قیادت پنجاب پولیس کے کمانڈوز ایک طرف صحافیوں کو مار رہے تھے تو دوسری طرف چیمہ صاحب پانی کی بوتلیں صحافیوں میں بانٹ رہے تھے۔

سیکرٹ ایجنسیوں نے بڑی چالاکی سے آصف زرداری کے غبارے سے ہوا نکال دی تھی۔ ان کے آٹھ سالہ جدوجہد اور کریڈیبلٹی خاک میں مل گئی تھی۔ ہم سب کو پتہ چل گیا تھا کہ ڈی جی ایم آئی جنرل ندیم تاج کے ساتھ ہونے والی ڈیل ناکام ہو گئی یا کر دی گئی یا سرے سے اس کا وجود ہی

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

نہیں تھا۔ آصف زرداری کو وہ پہلے ہی جنرل مشرف نے جیل سے باہر نکالنا تھا کیونکہ اب تو ہر اخبار، کالم نگار اور صحافی انہیں مرد حر کا درجہ دیکر انہیں نیلسن منڈیلا بنانے پر تل گیا تھا۔ وہ جنرل مشرف کے لیے قیدی کی صورت میں ایک پرابلم بنتے جا رہے تھے۔ یوں انہیں نئے انتخابات اور اقتدار کی رام لیلا سنا کر پہلے دبئی اور پھر دبئی سے لاہور بلوا کر چوہدری پرویز الٰہی کے ہاتھوں ذلیل کرا کرا ایکسپوز کر دیا گیا۔ بینظیر بھٹو کو شاید ان تمام باتوں کا احساس تھا لیکن وہ چاہتی تھیں کہ آصف زرداری خود ان فوجی جرنیلوں کے ہاتھوں کچھ سبق سیکھیں۔

چند دنوں بعد جب ہنگامہ تھما تو وہی آصف زرداری جو چوہدری پرویز الٰہی کی حکومت کا تختہ الٹ کر لاہور پر قبضہ کر کے ملک میں نئے انتخابات اور اپنی پارٹی کو اقتدار دلانے کے لیے دبئی سے آئے تھے، وہ واپس دبئی کچھ اس انداز سے گئے کہ میڈیا کو بھی کئی دنوں تک کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ پھر سننے میں آیا کہ وہ دبئی سے جا کر نیو یارک کے ایک ہسپتال میں دل کے عارضے میں مبتلا ہو کر داخل ہو گئے۔ پھر سننے میں آیا کہ وہ اب نیو یارک میں بیٹھ کر بینظیر بھٹو کے امریکیوں سے مذاکرات کرانے کے لیے لابنگ کر رہے تھے۔ آہستہ آہستہ پاکستانی میڈیا اور عوام انہیں بھول گئے کہ ایک دن پتہ چلا کہ بینظیر بھٹو کو قتل کر دیا گیا ہے اور آصف زرداری دبئی سے چکلالہ ایئر بیس پہنچ کر ان کا جسد خاکی گڑھی خدا بخش لے جانے کے لیے تین سال بعد اس ملک کا صدر بننے کے لیے واپس آ رہے تھے۔

آفتاب احمد خان شیر پاؤ

آفتاب احمد شیر پاؤ کا سیاستدان بننے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ ایک دن خبر ملی کہ ان کے بھائی حیات خان شیر پاؤ کو قتل کر دیا گیا ہے۔ اس لمحے انہوں نے فیصلہ کرنا تھا کہ فوج میں رہیں یا خاندان کی سیاسی گدی سنبھالیں۔ انہوں نے آرمی چھوڑی اور سیاستدان بننے کا فیصلہ کیا۔

جب وہ سیاست میں آئے تو انہیں پتہ چلا کہ انہیں تو تقریریں بھی کرنی ہیں لیکن انہیں صحیح اردو بولنی نہیں آتی تھی۔ جتنی دیر میں وہ سیاست اور اردو سیکھتے اتنی دیر میں جنرل ضیاء ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دے چکے تھے۔ آفتاب احمد شیر پاؤ بھٹو صاحب کی بیٹی کے پاس آئے، اسے اپنے ساتھ لیا اور صوبہ سرحد کے مختلف علاقوں میں جلسوں سے خطاب کرانے لے گئے۔ سرحد کے گورنر جنرل فضل حق تک یہ بات پہنچی تو انہوں نے شیر پاؤ کو جنرل ضیاء کے ساتھ ملانے کے لیے بڑی تگ و دو کی۔ شیر پاؤ نے اپنے مرحوم بھائی کی پارٹی چھوڑنے سے انکار کر دیا۔

بینظیر بھٹو صاحبہ نے بھی شیر پاؤ کی پارٹی کی خدمات کو سراہنا شروع کر دیا تھا۔ جنرل ضیاء کی طیارے کے کریش میں موت واقع ہو چکی تھی اور پیپلز پارٹی پہلی دفعہ بینظیر بھٹو کی قیادت میں بھٹو صاحب کی طلسماتی شخصیت کے بغیر انتخابات لڑنے جا رہی تھی۔ سرحد میں شیر پاؤ صاحب نے کوشش کی کہ صوبے کی دیگر مضبوط سیاسی پارٹیاں اے این پی اور جے یو آئی کے ساتھ مل کر ایک سیاسی اتحاد بنا کر

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

الیکشن ہرا جائے۔ دونوں جماعتوں کے لیڈروں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اس طرح ان کے اپنے ووٹر پارٹی خلاف ہو جائیں گے اور انہیں ووٹ نہیں دیں گے۔ دلچسپ بات ہے کہ جب انتخابات کے نتائج کا اعلان ہوا تو پتہ چلا کہ پیپلز پارٹی اسمبلی میں اتنی نشستیں لے چکی ہے کہ وہ شیر پاؤ کو صوبے کا وزیر اعلیٰ بنا سکتی ہے۔

میں نے شیر پاؤ سے وہی روایتی سوال پوچھا کہ کیا پارٹی کو 1988ء میں اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ ڈیل کر کے اقتدار میں آنا چاہیے تھا۔ شیر پاؤ صاحب بولے کہ بالکل! پارٹی کا یہ فیصلہ ٹھیک تھا۔ یہ علیحدہ بات تھی کہ بینظیر بھٹو نے اپنی حکومت کو کیسے چلایا۔ شیر پاؤ صاحب کا خیال تھا کہ دراصل گیارہ سال بعد پیپلز پارٹی کو ملک میں اقتدار مل رہا تھا۔ پارٹی کے ورکروں نے بہت قربانیاں دی ہوئی تھیں۔ اگر یہ موقع بھی ضائع کر دیا جاتا تو پارٹی ورکر بہت مایوس ہوتے۔ یہ ایک علیحدہ کہانی ہے کہ کیسے پارٹی کے لیڈر اپنے پارٹی ورکروں کی امیدوں پر پورے اترنے میں ناکام رہے اور بینظیر بھٹو کی حکومت توڑ دی گئی۔ تاہم ورکروں نے بینظیر بھٹو کے خلاف لگائے گئے الزامات پر یقین کرنے سے انکار کر دیا۔

جب 1989ء میں بینظیر بھٹو کو ہٹانے کے لیے تحریک عدم اعتماد پیش کی گئی تو پنجاب میں موجود نواز شریف کیمپ سے ایک پیغام بھیجا گیا تھا کہ یہ تحریک عدم اعتماد کامیاب نہیں ہوگی کیونکہ نواز شریف غلام مصطفیٰ جتوئی کو وزیر اعظم نہیں دیکھنا چاہتے تھے جو بینظیر بھٹو کی حکومت ختم ہونے کے بعد اس عہدے کے لیے امیدوار تھے۔

بینظیر بھٹو اور شیر پاؤ 1990ء میں پیپلز پارٹی کی ختم ہونے والی حکومت میں نواز شریف کے کردار کو نہیں بھولے تھے۔ یہی وجہ تھی جب 1993ء میں نواز شریف اور غلام اسحاق خان کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہوئے تو شیر پاؤ نے غلام اسحاق خان اور بینظیر بھٹو کے درمیان ایک خفیہ ڈیل کرائی تھی۔ پیپلز پارٹی کی حکومت کو پتہ چل گیا تھا کہ نواز شریف غلام اسحاق خان کے اس آئینی اختیار کو ختم کرنا چاہتے تھے جس کے تحت وہ ان کی حکومت اور پارلیمنٹ کو ڈس مس کر سکتے تھے۔ نواز شریف کو غلام اسحاق خان کے ہاتھ کاٹنے کے لیے پیپلز پارٹی کی سپورٹ کی ضرورت تھی کیونکہ ان کے پاس ہاؤس میں اتنے ووٹ نہیں تھے کہ وہ اکیلے یہ ترمیم لا سکتے۔ نواز شریف اپنی بھرپور کوششوں میں لگے ہوئے تھے کہ وہ اپنے آپ کو ایک آزاد اور خودمختار وزیر اعظم کے طور پر پارلیمنٹ، عوام اور میڈیا کے سامنے پیش کریں۔ تاہم نواز شریف اور غلام اسحاق خان کے درمیان اصل جھگڑا اس وقت شروع ہوا جب ایک

کہ اس وقت کے چیف آف آرمی سٹاف جنرل آصف نواز جنجوعہ وفات پا گئے۔ ایک یہ مسئلہ کھڑا ہو گیا کہ نیا آرمی چیف کون ہوگا۔ بات یہاں تک جا پہنچی کہ غلام اسحاق خان اور نواز شریف نے ایک دوسرے سے [illegible] بند کر دیا۔ یہ وہ وقت تھا جب پیپلز پارٹی کی قیادت نے نواز شریف اور غلام اسحاق خان کے درمیان جاری اس جنگ سے سیاسی فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ [illegible] آرمی چیف بنایا گیا [illegible] کے آخری دنوں رات سارا نقشہ بدل گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نواز شریف اور غلام اسحاق خان میں اختلافات بڑھتے گئے۔ نواز شریف کی اسلام آباد حکومت کو اس وقت سب سے بڑا دھچکا [illegible] جب [illegible] نے نواز شریف کی قیادت سے علیحدگی دے دی۔

سیاسی جنگ بچ چکا تھا اور اس کھیل کے سارے پتے اب بینظیر بھٹو کے ہاتھ میں آ چکے تھے۔ نواز شریف اور غلام اسحاق خان دونوں نے بینظیر بھٹو سے رابطہ کیا۔ وہ اب اس پوزیشن میں آ گئی تھیں کہ جس کے سر پر چاہتیں اقتدار کا تاج رکھ دیتیں۔ یہ پیپلز پارٹی کی قیادت کا بہت بڑا امتحان تھا کہ کیسے وہ اس تمام تر سیاسی منظر نامے سے بڑی ہوشیاری کے ساتھ خدا کی طرف سے بھیجے گئے اس موقع سے فائدہ اٹھائے۔ پیپلز پارٹی نے پاور پالیٹکس کی اور آنے والے دنوں میں وہ سارے فائدے حاصل کیے جو ان موقعوں پر سیاستدان اپنی مختلف چالیں چل کر حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نواز شریف کیمپ میں فرسٹریشن بہت زیادہ تھی کیونکہ بینظیر بھٹو کی سپورٹ کے بغیر غلام اسحاق خان نواز شریف حکومت کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

جب بینظیر بھٹو کو نواز شریف نے قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی برائے وزارت خارجہ کا چیئرمین بننے کی پیشکش کی تو پیپلز پارٹی کے لیڈروں نے محترمہ کو اس بات پر قائل کیا کہ وہ یہ آفر قبول کر لیں۔ تاہم سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کے کچھ ارکان بینظیر کے اس فیصلے سے خوش نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ بے کار کی کوشش تھی۔ نواز شریف کیمپ بینظیر بھٹو کے اس دوستانہ سٹائل پر بہت خوش ہوا۔ وہ سمجھے کہ بات بن گئی تھی۔ نواز شریف نے بینظیر بھٹو کو پیغام بھجوایا کہ وہ انہیں اپنی حکومت میں ڈپٹی پرائم منسٹر بنانے پر تیار تھے اگر وہ غلام اسحاق خان کا ساتھ نہ دیں۔ وہ پاکستان میں ایک اور سیاسی حکومت کو ڈس مس کرنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ نواز شریف بینظیر بھٹو کے ساتھ پارلیمنٹ میں ایک طاقتور سیاسی اتحاد بنانا چاہتے تھے۔ نواز شریف نے یہاں تک پیشکش کی کہ وہ پیپلز پارٹی کے کسی بھی لیڈر کو غلام اسحاق خان کے جانے

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

کے بعد ملک کا صدر بنانے کے لیے حمایت کریں گے۔

بینظیر بھٹو ایک بہت بڑے مخمصے کا شکار تھیں۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کیا جائے۔ نواز شریف سے بدلہ لینے کا بڑا اچھا موقع تھا جنہوں نے 1988-90 میں ان کی پہلی حکومت کو انہی غلام اسحاق خان کے ساتھ مل کر ڈس مس کرایا تھا اور خود وزیراعظم بن گئے تھے۔ آج وہی غلام اسحاق خان اور نواز شریف ایک دوسرا کا گلا کاٹنے پر تلے ہوئے تھے۔

دوسرے، بینظیر بھٹو کے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ یہ غلام اسحاق خان سے بدلہ لینے کا بڑا اچھا موقع تھا جنہوں نے کرپشن کے الزامات لگا کر ان کی حکومت ختم کی تھی، ان کے خاوند آصف علی زرداری کو ڈھائی سال جیل میں رکھا اور ان کے خلاف مقدمات بنائے۔ آج موقع تھا کہ وہ نواز شریف کے ہاتھوں غلام اسحاق خان کو سیاسی طور پر ذلیل کرا کر ان سے بدلہ لے لیں۔

پارٹی کے اندر سے بھی بینظیر بھٹو پر یہ دباؤ تھا کہ وہ ایک ڈیموکریٹ ہونے کے ناطے نواز شریف کا ساتھ دیں کیونکہ وہ پاکستانی عوام، میڈیا اور ورکرز کے سامنے غلام اسحاق خان کی سپورٹ کا جواز پیش نہیں کر سکیں گے۔ ساری عمر کے لیے پیپلز پارٹی کی قیادت پر یہی دھبہ لگا رہے گا کہ انہوں نے پارلیمنٹ سے منتخب شدہ ایک وزیراعظم کے بجائے اسٹیبلشمنٹ کے نمائندے جس نے ان پر کرپشن کا الزام لگا کر ان کی حکومت توڑی، کی حمایت کی تھی۔

آفتاب شیرپاؤ سے پوچھا گیا تو انہوں نے بینظیر بھٹو کو یہ مشورہ دیا کہ وہ نواز شریف کے بجائے غلام اسحاق خان کی حمایت کریں کیونکہ ایک ایسے صدر سے انہیں زیادہ سیاسی فائدے ملنے کی توقع ہے جس کے پاس پارلیمنٹ اور حکومت کو توڑنے کے اختیارات ہیں۔

بینظیر بھٹو اور غلام اسحاق خان کے درمیان جو لوگ خفیہ مذاکرات کرا رہے تھے انہیں بتایا گیا کہ وہ صدر کے کیمپ تک یہ پیغام پہنچائیں کہ وہ نواز شریف کی حکومت کو برطرف کر کے اس ملک میں نئے انتخابات کرانے کا اعلان کریں۔ غلام اسحاق خان کی طرف سے خفیہ مذاکرات کرنے والے لوگ اس بات کے لیے تیار نہیں تھے۔ پیپلز پارٹی اور غلام اسحاق خان کیمپ کے درمیان یہ خفیہ ملاقاتیں شیرپاؤ کے اسلام آباد میں واقع گھر پر جاری رہیں۔

پنجاب کے علاوہ باقی تین صوبوں کے وزرائے اعلیٰ غلام اسحاق خان کے وفادار تھے اور یہ بات نواز شریف کو سب سے زیادہ پریشان کر رہی تھی۔

جب بھی پارٹی کی میٹنگز ہوتیں تو بینظیر بھٹو ہمیشہ اس بات کی مخالفت کرتیں کہ ان کی غلام اسحاق خان کے ساتھ ملاقات ہونی چاہیے۔ تاہم، فاروق لغاری اور شیرپاؤ کو یہ اچھی طرح پتہ تھا کہ بینظیر بھٹو غلام اسحاق خان کے ساتھ ڈیل کرنا چاہتی تھیں جنہوں نے ان کی پہلی حکومت کو کرپشن چارجز پر ڈس مس کیا تھا۔ آخر فاروق لغاری اور شیرپاؤ بینظیر بھٹو کو غلام اسحاق خان سے ملانے لے گئے اور یوں ان دونوں کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ طے پایا۔ جب بینظیر بھٹو اور غلام اسحاق خان ایک کمرے میں اکیلے بیٹھے مذاکرات کر رہے تھے تو بینظیر بھٹو نے شیرپاؤ سے کہا کہ وہ بھی ان مذاکرات میں شامل ہو جائیں۔ بینظیر اور غلام اسحاق کے درمیان بہت سنجیدہ بحث و مباحثہ جاری تھا۔ غلام اسحاق خان اس بات پر بضد تھے کہ صرف قومی اسمبلی توڑی جائے گی اور صوبائی اسمبلیاں اپنا کام کرتی رہیں گی۔

بینظیر بھٹو شیرپاؤ سے یہ پوچھنا چاہ رہی تھیں کہ جو لوگ پارٹی کی طرف سے مذاکرات کر رہے تھے ان کے غلام اسحاق خان کیمپ سے کس طرح کے مذاکرات ہوئے تھے۔ شیرپاؤ نے بینظیر بھٹو اور غلام اسحاق خان کو بتایا کہ مذاکرات میں یہ بات طے ہوئی تھی کہ قومی اسمبلی اور چاروں صوبائی اسمبلیاں توڑی جائیں گی۔ اس پر غلام اسحاق خان نے کہا کہ وہ صوبائی اسمبلیوں کو توڑنے کا معاملہ بعد میں دیکھیں گے۔ پہلے وہ قومی اسمبلی کو برخاست کریں گے۔ غلام اسحاق خان نے بینظیر بھٹو کے ساتھ ملک کے نئے نگران وزیراعظم کا نام بھی ڈسکس کیا۔ جب انہیں یہ بتایا گیا کہ بلخ شیر مزاری اس ملک کے نئے وزیراعظم ہوں گے تو بینظیر بھٹو نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔

غلام اسحاق خان نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہوئی تھیں۔ ان کے ذہن میں بھی ایک گیم پلان موجود تھا۔ وہ بینظیر بھٹو کی مدد سے پہلے نواز شریف سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے اور پھر اپنے وفادار صوبائی وزراء اعلیٰ کی مدد سے قومی اسمبلی کے لیے نئے انتخابات کرا کر اپنی مرضی کی پارلیمنٹ وجود میں لانا چاہ رہے تھے۔ غلام اسحاق خان کا پلان تھا کہ پیپلز پارٹی کو چالیس سے پچاس سیٹیں ملیں گی۔ ایک ایسی پارلیمنٹ کو اپنی مرضی سے چلانا آسان ہو گا جس میں کسی پارٹی کی اکثریت نہیں ہو گی اور یوں غلام اسحاق خان اپنی مرضی سے اسلام آباد میں ایک کمزور سی حکومت تشکیل دے کر ایوان صدر سے پورے ملک پر حکومت کریں گے۔ پیپلز پارٹی کی قیادت کو احساس ہو گیا تھا کہ ان کے ساتھ کھیل کھیلا جا رہا تھا

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

[illegible] نواز شریف [illegible] غلام اسحاق خان [illegible] وزیراعظم [illegible]

[illegible] شکل میں آ گیا۔

چونکہ حکومت میں غلام اسحاق خان کو شکست دینے کے بعد نواز شریف ایک فاتح کی طرح وزیراعظم ہاؤس میں داخل ہوئے اور [illegible] پارٹی کی [illegible] جب نواز شریف اور غلام اسحاق خان میں [illegible] شروع ہو گئی۔ ایک دوسرے کے خلاف نئی سیاسی چالیں چلنا شروع کی گئیں۔ نواز شریف کو پنجاب میں حق حکمرانی کے لیے ایک طرف الطاف حسین [illegible] دیا گیا تو [illegible] سرحد میں میر افضل نے وزیر اعلیٰ کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ پنجاب میں صورتحال اتنی خراب ہو گئی کہ اس وقت کے آرمی چیف جنرل وحید کاکڑ کو مداخلت کرنا پڑی اور یوں غلام اسحاق خان اور نواز شریف دونوں کو استعفیٰ دے کر گھر جانا پڑا۔

اب ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا کہ اس ملک میں نئے انتخابات کون کرائے گا۔ سرتاج عزیز کہیں سے معین قریشی کا نام لے کر آئے اور انہیں نگران وزیراعظم بنا دیا گیا۔

میں نے شیر پاؤ سے پوچھا کہ عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ بینظیر بھٹو نے غلام اسحاق خان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ نواز شریف حکومت کو ڈس مس کرنے کے جواب میں انہیں دوسری دفعہ ملک کا صدر بنائیں گی لیکن وہ وقت آیا تو انہوں نے فاروق لغاری کو صدر بنا کر ان سے دھوکہ کیا۔

شیر پاؤ نے اس بات سے انکار کیا کہ بینظیر بھٹو نے بھی اس طرح کا وعدہ غلام اسحاق خان سے کیا تھا۔

میں نے کہا کہ شیر پاؤ صاحب اچھی چھوڑیں، یہ بتائیں کہ بینظیر بھٹو اور فاروق لغاری کے

[illegible] اختلافات کیسے اور کیوں ہوئے۔

شیر پاؤ نے مجھے ایک نئی کہانی سنائی۔

ان کے خیال میں بینظیر بھٹو کا فاروق لغاری کو صدر بنانے کا فیصلہ [illegible]

[illegible]

فاروق لغاری پہلے ان سے کہیں [illegible] ملک کے [illegible] صدر بننا چاہتے تھے [illegible] لغاری صاحب کو پیپلز پارٹی کے ایک لیڈر کے طور پر [illegible] چاہیے تھا۔

بینظیر بھٹو اور فاروق لغاری کے درمیان کئی اختلافات پیدا ہو چکے تھے۔ حالات روز بروز تیزی سے بگڑتے جا رہے تھے۔ دونوں کے درمیان سب سے پہلے جو اختلافات چیف جسٹس سجاد علی شاہ اور نئے ایئر چیف کی تقرری پر ابھرے۔ بینظیر بھٹو عباس خٹک کو نیا ایئر چیف لگانا چاہ رہی تھیں۔ حالات بگڑنے کے باوجود بینظیر بھٹو کو آخری لمحے تک یہ یقین تھا کہ فاروق لغاری ان کی حکومت کو ڈس مس نہیں کریں گے۔ تاہم، بینظیر بھٹو کے ساتھ ایک پرابلم تھا کہ وہ اچانک ایک بڑا سخت موقف اختیار کر لیتی تھیں جس سے شیر پاؤ جیسے لوگوں کے لیے پرابلم پیدا ہو جاتے تھے کہ وہ دونوں کے درمیان کوئی فیصلہ کن رول ادا کر سکیں۔ سجاد علی شاہ کا اس لڑائی میں رول بہت اہمیت اختیار کر چکا تھا خصوصاً جب بینظیر بھٹو نے مرتضیٰ بھٹو کے قتل کے بعد ایوان صدر کے مکینوں پر قاتل ہونے کا الزام لگایا تھا۔ بینظیر بھٹو کے ایوان صدر کے مکینوں پر مرتضیٰ کے قاتل ہونے کے پیچھے بھی کہانی کچھ یوں تھی کہ جس رات مرتضیٰ کو قتل

www.freepdfpost.blogspot.com

allurdupdfnovels.blogspot.com

www.freepdfpost.blogspot.com

!!!allurdupdfnovels!!!blogspot!!!com!!!

دوسری طرف جنرل جہانگیر کرامت بھی اپنی کوششوں میں لگے ہوئے تھے کہ کسی طرح سے بینظیر بھٹو اور فاروق لغاری کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے۔ ایک مرحلے پر تو جنرل جہانگیر کرامت نے بینظیر بھٹو کو یہ بھی آفر کی کہ وہ انہیں اپنے ساتھ لے کر فاروق لغاری کے پاس جائیں گے تاکہ دونوں کے درمیان پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کو دور کیا جا سکے۔

بینظیر بھٹو نے جہانگیر کرامت کا شکریہ ادا کیا لیکن انہوں نے ان کی پیشکش شائستگی سے یہ کہہ کر مسترد کر دی کہ وہ فاروق لغاری کے ساتھ اپنے اختلافات دور کرنے کے لیے آرمی چیف کو اس میں ملوث نہیں کریں گی۔ بینظیر بھٹو نے شیر پاؤ کو بتایا کہ وہ چیف آف آرمی سٹاف کی اس معاملے میں مدد نہیں لیں گی۔

شیر پاؤ نے بی بی کو مشورہ دیا کہ وہ فاروق لغاری کے ساتھ پیدا ہونے والے اختلافات کو ایک ایک کر کے حل کریں لیکن بینظیر بھٹو ان سارے اختلافات کو ایک ہی میٹنگ میں بیٹھ کر ختم کرنا چاہتی تھیں۔

شیر پاؤ نے یاد کیا کہ معاملات بہت پہلے ہی بگڑنا شروع ہو گئے تھے۔ بینظیر بھٹو اس بات پر بہت پریشان تھیں کہ کیا فاروق لغاری آصف زرداری سے وفاقی وزیر کا حلف لینے سے انکار تو نہیں کریں گے۔ جب شیر پاؤ نے یہی بات فاروق لغاری سے کی تو انہوں نے آگے سے جواب دیا کہ وہ بینظیر بھٹو کی طرف سے بھیجی گئی دو چیزوں پر کبھی اعتراض نہیں کریں گے۔ ایک یہ کہ اگر وہ کسی شخص کا نام انہیں بھیجتی ہیں کہ ان سے وزیر کا حلف لیا جائے تو وہ ضرور حلف لیں گے۔ دوسرے وہ اگر انہیں یہ سفارش بھیجتی ہیں کہ قومی اسمبلی توڑ دی جائے تو وہ فوراً توڑ دیں گے۔

بینظیر بھٹو اور فاروق لغاری کے درمیان تعلقات اب پوائنٹ آف نو ریٹرن تک پہنچ چکے تھے۔ حالات کسی ایک وجہ سے اس نہج پر نہیں پہنچے تھے۔ ایک دن ایوان صدر میں سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد ججوں کی تقرری کے مسئلے پر صدر اور وزیراعظم کے نمائندوں کے درمیان ایک میٹنگ ہوئی۔ صدر کی طرف سے خواجہ طارق رحیم، احمد سعید اعوان اور شاہد حامد نے شرکت کی۔ بینظیر بھٹو کی طرف سے وزیر قانون رضا ربانی، اس وقت کے لاء سیکرٹری اور آفتاب شیر پاؤ اس میٹنگ میں شریک ہوئے۔ یہ میٹنگ اسی وقت ہی ختم ہو گئی جب دونوں اطراف کے لوگوں نے اس مسئلے کو حل کرنے کے بجائے ایک دوسرے پر طنز کرنا شروع کر دیے۔

بینظیر بھٹو کو پتہ چل چکا تھا کہ معاملات بہت بگڑ گئے تھے۔ وہ پھر بھی کوششوں میں لگی ہوئی تھیں کہ شاید بگڑی بات کہیں بن جائے۔ بینظیر بھٹو نے ایک رات شیر پاؤ کو پشاور فون کیا اور انہیں کہا کہ فوری طور پر اسلام آباد پہنچیں۔ وہ شیر پاؤ کے ساتھ فاروق لغاری سے ملنا چاہ رہی تھیں۔ آفتاب شیر پاؤ ابھی اسلام آباد کے لیے روانہ نہیں ہوئے تھے کہ بینظیر بھٹو نے بارہ بجے کے قریب 5 نومبر 1996ء کو فون کر کے شیر پاؤ کو بتایا کہ اب انہیں اسلام آباد آنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ فاروق لغاری ان کی حکومت توڑ چکے ہیں۔ بینظیر بھٹو نے کہا کہ اب وہ آرام سے کل اسلام آباد آ جائیں۔

فاروق لغاری نے بینظیر حکومت توڑتے ہی پرائم منسٹر ہاؤس آنے جانے والے راستے بند کرا دیے۔ کسی کو بینظیر بھٹو سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ آفتاب شیر پاؤ وہ واحد لیڈر تھے جنہیں بینظیر بھٹو سے ملنے کی اجازت دی گئی۔

اپنی حکومت کے توڑے جانے کے اگلے روز بینظیر بھٹو نے فاروق لغاری کو فون کیا اور ان سے پوچھا کہ ان کی حکومت کیوں توڑی گئی تھی۔ فاروق لغاری نے آگے سے جواب دیا کہ ہاں، وہ ان کی حکومت کو ڈس مس کر چکے ہیں۔ بینظیر بھٹو نے ان سے پوچھا کہ صوبائی اسمبلیوں کا کیا بنے گا۔ فاروق لغاری نے جواب دیا کہ وہ صوبائی اسمبلیوں کو بھی ڈس مس کریں گے۔

ٹیلی فون پر ہونے والی اس گفتگو کے درمیان میں فاروق لغاری نے بینظیر بھٹو کو یہ بھی پیشکش کی کہ وہ انہیں نگران سیٹ اپ میں شامل لوگوں کے ناموں کی فہرست بھی دکھا دیں گے۔

جب آفتاب شیر پاؤ ایک برطرف وزیراعظم سے پرائم منسٹر ہاؤس میں ملے تو انہوں نے بینظیر بھٹو کو یہ مشورہ دیا کہ وہ فاروق لغاری کے ساتھ رابطے میں رہیں کیونکہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔

بینظیر بھٹو نے شیر پاؤ سے کہا کہ وہ رضا ربانی کو ساتھ لے کر فاروق لغاری سے ملنے جائیں تاہم رضا ربانی مقررہ وقت پر وہاں نہیں پہنچے اور یوں شیر پاؤ کو فاروق لغاری سے ملنے کے لیے اکیلے جانا پڑا۔

لغاری نے شیر پاؤ کو بتایا کہ انہوں نے اتنا بڑا قدم کیوں اٹھایا تھا اور پھر وہ انہیں ان لوگوں کے نام بتانے لگے جو نگران حکومت کو چلائیں گے۔

باتوں باتوں میں فاروق لغاری نے شیر پاؤ سے کہا کہ وہ صوبے کے چیف منسٹر کے طور پر کام

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

کرتے رہیں لیکن شیر پاؤ نے سختی سے انکار کر دیا۔ فاروق لغاری نے اسی رات [illegible]
[illegible] صوبہ سرحد کے گورنر جنرل خورشید نے اسی رات [illegible]
فاروق لغاری نے بینظیر کی حکومت کو توڑ دیا تھا۔ فاروق لغاری کو [illegible]
[illegible] شیر پاؤ کی حکومت کی [illegible] کرے۔

میں نے شیر پاؤ صاحب سے پوچھا کہ وہ پیپلز پارٹی کے اتنے قریب تھے [illegible]
تھیں کہ انہوں نے پیپلز پارٹی چھوڑ کر اپنی پارٹی بنائی اور آج ایک قومی [illegible]
حکومت میں وفاقی وزیر [illegible] ہیں۔ وہ [illegible] کے خلاف [illegible]
[illegible] ایک [illegible] کام کرتے ہیں۔

شیر پاؤ کے چہرے پر [illegible] تاثرات دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ جس طرح [illegible]
پیپلز پارٹی چھوڑنی پڑی تھی اس پر انہیں ابھی بھی تکلیف ہے۔ پارٹی انہوں نے نہیں چھوڑی تھی بینظیر
بھٹو نے ان کی وفاداری پر شک کرتے ہوئے انہیں پارٹی سے [illegible] کیا تھا۔

شیر پاؤ نے ایک اور کہانی سنائی۔

جب فاروق لغاری نے بینظیر بھٹو کی حکومت توڑی تو شیر پاؤ کو اچانک محسوس ہوا کہ پارٹی کے
لیڈروں کا سارا غصہ ان پر نکل رہا ہے۔ ان تمام لوگوں نے اپنی توپوں کا رخ ان کی طرف کر لیا ہے۔
باتوں باتوں اور سرگوشیوں میں یہ [illegible] گفتگو ہونے لگی کہ وہ فاروق لغاری کے رشتہ دار ہیں۔ انہیں
[illegible] جانے کا [illegible] بینظیر بھٹو کی حکومت توڑنے کے فیصلے میں ان کی بھی فاروق لغاری کے لیے
[illegible] شامل تھی۔

شیر پاؤ مجھے بتانے لگے کہ انہیں ان کی مرضی کے بغیر پیپلز پارٹی کا سینئر وائس پریذیڈنٹ بنایا گیا
تھا۔ بینظیر بھٹو چاہتی تھیں کہ وہ (شیر پاؤ) پارٹی چلائیں اور وہ پارٹی کے [illegible] معاملات کو دیکھیں
گی۔ [illegible] شیر پاؤ نے [illegible] علی بھٹو کی [illegible] پر یہ بات سب پر واضح کر دی کہ وزیر اعظم
[illegible] بینظیر بھٹو [illegible] شیر پاؤ [illegible] چاہتے تھے کہ پیپلز پارٹی کی 1997ء کے الیکشن میں [illegible]
[illegible] سے الیکشن کرایا جائے گا۔ شیر پاؤ چاہتے تھے کہ پارٹی کے اندر ایک [illegible]
[illegible] جنہوں نے بینظیر بھٹو کو اس بات پر راضی کر

پارٹی قائد آفتاب شیر پاؤ [illegible] کیا جا سکتا ہے۔

میں نے شیر پاؤ سے پوچھا کہ [illegible] پارٹی چھوڑنے کے بعد [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] نہیں کہیں گے۔

آفتاب شیر پاؤ کے [illegible] بینظیر بھٹو سے کسی قسم کی [illegible] ان کے خلاف
ایک [illegible] بھی نہیں کہیں گے حالانکہ انہیں پارٹی میں [illegible] کیا گیا۔ پارٹی کی قیادت
نے ان کے خلاف پروپیگنڈہ کیا۔ [illegible] کو [illegible] کرنے کے بجائے ان [illegible] کو یاد کرتے
ہیں جب سب مل کر پیپلز پارٹی میں کام کرتے تھے۔ وہ اس مرحلے پر بھی [illegible] لوگوں کو خوش کرنے کے
لیے بینظیر کو گالیاں نہیں دیں گے اور نہ ہی اپنی زندگی کے اس پارٹی میں گزرے برسوں کو [illegible] چند
لوگوں کی خاطر خراب کریں گے۔

شیر پاؤ نے کہا کہ اگرچہ اب وہ پیپلز پارٹی کا حصہ نہیں رہے تھے لیکن وہ اب بھی اس پارٹی کے
ان [illegible] پر اپنا دعویٰ رکھتے ہیں جو پارٹی کو بھٹو صاحب وراثت سے ملے تھے۔ ایک ایک روایت
جس کے تحفظ کے لیے ان سمیت پیپلز پارٹی کے سب لیڈروں نے جیلیں کاٹی تھیں۔ اب کوئی بھی شخص
ان سے وہ سیاسی [illegible] نہیں چھین سکتا چاہے آج وہ پیپلز پارٹی میں ہیں یا نہیں۔

شیر پاؤ نے کہا کہ یہ وہ پیپلز پارٹی تھی جس کو بھی اس کے نظریات کی وجہ سے ووٹ ملتے تھے۔
اب اس پارٹی کو محض برادریوں کی ایک دوسرے سے چپقلش کی وجہ سے ووٹ پڑتے تھے۔ لوگ پیپلز
پارٹی کے امیدوار کو اس لیے ووٹ دیتے ہیں کیونکہ گاؤں میں ان کا مخالف گروپ پاکستان مسلم لیگ
کے امیدوار کو سپورٹ کر رہا ہوتا ہے۔ پیپلز پارٹی محض گاؤں میں چلنے والی مقامی سیاسی اور [illegible]
[illegible] بھٹو صاحب [illegible] پیپلز پارٹی
[illegible] ہو چکا ہے۔

www.freepdfpost.blogspot.com

!!!allurdupdfnovels!!!blogspot!!!com!!!

سلطان محمود قاضی

ایک سیاسی ورکر جو آصف زرداری کے لیے رول ماڈل بنا

جب میں آصف علی زرداری صاحب سے ملنے کے لیے راولپنڈی کی احتساب عدالت میں گرمیوں کی ایک تپتی دوپہر میں گیا تھا تو میں نے ایک بات فوراً محسوس کی تھی کہ وہاں ان کے اردگرد مجمعے میں موجود جو دوست اور پارٹی ورکر بیٹھے تھے ان میں سے اگر وہ کسی کو سب سے زیادہ عزت اور احترام دے رہے تھے وہ بمشکل تین فٹ کا انسان تھا۔ میں بڑا حیران ہوا کہ آخر چھوٹے سے قد والے اس انسان میں ایسی کیا غیر معمولی بات تھی کہ زرداری صاحب جیسا شخص بھی نہ صرف ان کی بات غور سے سن رہا تھا بلکہ اس طرح سر ہلا رہا تھا جیسے ان کا کہا ہوا ہر لفظ حرف آخر ہو۔ میں زرداری صاحب سے بڑی دیر تک گپ شپ کرتا رہا لیکن بار بار میری نظر اس شخص کی طرف اٹھ جاتی۔ مجھے یہ بہت برا لگ رہا تھا کہ میں زرداری صاحب سے انٹرویو چھوڑ کر ان سے یہ پوچھوں کہ یہ شخص کون ہے۔

میں نے اپنے انٹرویو کے دوران زرداری صاحب سے پوچھ لیا کہ انہوں نے ساری عمر عیاشی بھری زندگی گزاری تھی، پھر ان کے اندر اتنی جرأت کہاں سے آ گئی تھی کہ انہوں نے آٹھ سال جیل میں گزار دیے۔ زرداری صاحب نے اپنی انگلی اٹھائی اور اپنے سامنے مجمعے میں بیٹھے ہوئے اسی چھوٹے قد والے شخص کی طرف اشارہ کر کے مجھے کہا کہ ہو سکتا ہے یہ شخص تمہیں قد میں بہت چھوٹا لگ رہا ہو لیکن

سلطان محمود قاضی، ذوالفقار علی بھٹو کے ہمراہ

یہ بڑے بڑے قد آوروں سے بڑا شخص ہے۔ جب میں اسے دیکھتا ہوں تو میرا حوصلہ بڑھتا ہے اور میں جیل کے کمرے میں واپس جا کر نئے سرے سے سختیاں جھیلنے کے لیے تیار ہو جاتا ہوں۔

مجھے زرداری صاحب کی یہ بات سن کر یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنا چھوٹا سا آدمی بھلا زرداری صاحب کے لیے کیسے ایک رول ماڈل ہو سکتا ہے۔

میں سمجھا کہ شاید زرداری صاحب نے حسب عادت مجھ سے کوئی مذاق کیا ہے۔

جونہی زرداری صاحب کا انٹرویو ختم ہوا تو میں نے فوراً بڑی بے چینی سے اپنے ایک صحافی دوست سے پوچھا کہ یار یہ کون آدمی ہے؟ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور بولا کہ آپ اس کو

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

نہیں جائے۔ میں نے پر اسا منہ بنایا اور کہا کہ حضور اگر میں جانتا ہوتا تو آپ سے ایک ایسا انسان پہلی درخواست نہ کرتا۔

میرے دوست نے کہا کہ اس کا نام سلطان محمود قاضی ہے۔ یہ شخص پانچ سال تک جیل میں بھی اس وجہ سے گزار کر آیا ہے کہ اس پر الزام تھا کہ اس نے جنرل ضیا کو بھٹو کو پھانسی دینے کے بعد قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ یہ راولپنڈی کی پیپلز پارٹی کے جیالوں میں سب سے قد آور جیالا سمجھا جاتا ہے جس سے کسی دور میں جنرل ضیا جیسا آمر بھی مرعوب رہتا تھا۔

مجھے ایک شدید جھٹکا لگا اور میں نے غیر ارادی طور پر مڑ کر اس تین فٹ کے انسان کو دیکھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہمارے اردگرد چلتے پھرتے کچھ ایسے کردار بھی ہیں جن کا ہو سکتا ہے قد تو بہت چھوٹا ہو لیکن ان کے اندر چھپا انسان ہم جیسے لوگوں سے شاید قد کاٹھ میں کئی گنا بڑا نکلتا ہے۔

مجھے آصف زرداری صاحب کے دل میں قاضی سلطان کے لیے موجود عزت اور احترام کی کچھ ایک لمحے میں آ گئی تھی۔ میں ایک قدم آگے بڑھا، احترام کے ساتھ جھکا اور اپنا ہاتھ قاضی صاحب کی طرف بڑھایا۔ وہ مجھے پہلے ہی زرداری صاحب کا انٹرویو کرتے دیکھ کر سمجھ چکے تھے کہ میں کون ہوں۔ وہ بڑے احترام سے ملے۔ میں نے ان سے ان کا نمبر لیا اور چپکے سے عدالت کے احاطے سے باہر نکل آیا۔

قاضی سلطان سے جب ملاقات ہوئی تھی اس وقت ان کی عمر 55 برس تھی۔ اب سات برس بعد جب یہ کتاب لکھی جا رہی ہے تو وہ 62 برس کے ہو چکے ہیں۔ ایک عام سیاسی ورکر کے لیے اس سے بڑا خراج تحسین کیا ہو سکتا ہے کہ بھرے مجمعے میں آصف زرداری جیسا بندہ اس بات کا اعتراف کرے کہ قاضی سلطان کو دیکھ کر ان کے اندر جیل کی سختیاں جھیلنے کی ہمت پیدا ہوئی تھی۔

قاضی 1949ء میں جب پیدا ہوا تو پوری فیملی کو ایک بہت بڑا جھٹکا لگا۔ سب لوگوں کے لیے اس کے وجود کے ساتھ گزارہ کرنا ایک مشکل کام ہو گا۔ لیکن اس کی ماں کو ایک لمحے کے لیے بھی یقین نہ تھا کہ اس کے گھر ایک ایسا بیٹا پیدا ہوا ہے جس کا قد بڑھ نہیں سکتا ہے۔ جب وہ تھوڑا بڑا ہوا تو اس کے اپنے رشتہ دار اور گلی محلے کے لوگوں نے مذاق اڑانا شروع کیا۔ لوگ اس کو دیکھ کر قہقہے لگاتے۔ ایک دکھیاری ماں اسے گود میں اٹھائے ہوئے مزاروں پر پھرتی رہتی۔ ماں نے پیروں فقیروں سے تعویذ لیے کہ شاید اس کے بیٹے کا قد بڑھ جائے۔ قاضی نے بھی سوچ لیا تھا کہ وہ اپنے چھوٹے قد کو اپنی کمی بھی پا مال میں رکاوٹ نہیں بننے دے گا۔ اس نے سکول جانا شروع کیا۔ جب اس نے میٹرک پاس کر لیا تو اس نے فیصلہ کیا کہ اب اس کو مزید کام نہیں کرنے دے گا اور وہ نوکری کرے گا۔ سب سے پہلے وہ ایک ہوٹل گیا۔ ہوٹل کے سپرنٹنڈنٹ نے اسے دیکھتے ہی ایک طنزیہ قہقہہ لگایا۔ جب قاضی صاحب نے نوکری کی درخواست کی تو اس نے بڑی نفرت کے ساتھ اسے باہر نکال دیا۔ اس پندرہ سالہ لڑکے پر یہ پہلا ایک شدید دھچکا تھا۔ وہ وہاں سے نکلا اور ایک اطالوی ڈاکٹر کے پاس چلا گیا جس کا اپنا ایک ہوٹل تھا۔ جب وہ ہوٹل میں بیٹھا اس غیر ملکی ہوٹل کے مالک سے ملنے کا انتظار کر رہا تھا تو وہاں کام پر پاکستانی ملازم تھا انہوں نے اس پر جملے کسنا شروع کر دیے۔ وہ چپ چاپ بیٹھا سب کی باتیں سنتا رہا۔ آخر جب اسے اس اطالوی کے کمرے میں لے جایا گیا تو اس غیر ملکی نے اٹھ کر اس کا استقبال کیا اور آنے کی وجہ پوچھی۔ اس نے کوئی دوسری بات کیے بغیر قاضی صاحب کو بتایا کہ آج سے وہ اس کے ہوٹل میں نوکری کرے گا۔

وہ خوش خوش گھر واپس لوٹا، لیکن اسے پتہ نہیں تھا کہ ابھی زندگی نے اس کے ساتھ کچھ مذاق اور کرنے تھے۔ ابھی اس کی نوکری کی خوشی ختم نہیں ہوئی تھی کہ کچھ عرصے بعد وہ ہوٹل سی ڈی اے کے کنٹرول میں آ گیا۔ اس کے پاکستانی بھائیوں نے اس پر ایک نئے سرے سے انتہائی گھٹیا مذاق کرنے شروع کر دیے۔ اس اطالوی نے بڑی سختی سے سب کو منع کیا ہوا تھا کہ کوئی بھی اس کے ساتھ کوئی بھونڈا سا مذاق بھی نہیں کرے گا۔ اس کے جاتے ہی یہ سلسلہ پھر شروع ہو گیا تھا۔ وہ چپ چاپ اپنے ہی پاکستانیوں کی باتیں برداشت کرتا رہا۔ کچھ دنوں بعد وہ ہوٹل کینیڈا کی ایک فرم نے خرید لیا اور قاضی صاحب کو دوبارہ وہی عزت اور مقام مل گیا جو اس ہوٹل کے اطالوی مالک کے دور میں ملا تھا۔

ایک دن قاضی صاحب نے پڑھا کہ ذوالفقار علی بھٹو نام کا کوئی شخص ایک نئی سیاسی جماعت بنا رہا ہے۔ اخبار میں بھٹو صاحب کی پارٹی کا منشور پڑھتے ہوئے ایک جگہ قاضی صاحب کی نظریں رک گئیں۔ اس میں لکھا تھا کہ بھٹو صاحب کی نئی جماعت اس معاشرے کے تمام طبقات کو بغیر کسی امتیاز کے عزت دے گی۔ قاضی صاحب کے لیے یہ نئی بات تھی۔ اب تک انہوں نے ہر جگہ اپنا قد چھوٹا ہونے کی وجہ سے امتیازی سلوک کا ہی سامنا کیا تھا۔ اب کوئی ایک ایسا شخص پیدا ہو گیا ہے جو یہ وعدہ کر رہا ہے کہ وہ

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

سب کے ساتھ یکساں سلوک کرے گا اور انہیں عزت دے گا۔

یہ سب کچھ سوچ کر قاضی صاحب نے پیپلز پارٹی کو جائن کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ اس معاشرے میں عزت کے ساتھ رہ سکیں۔ ابھی دنوں بھٹو صاحب کے کچھ دوست امریکہ سے ملنے کے لیے پاکستان آئے اور وہ اسی ہوٹل میں ٹھہرے جہاں قاضی صاحب کام کرتے تھے۔ بھٹو صاحب نے خورشید حسن میر سے کہا کہ وہ امریکہ سے آنے والے مہمانوں کا خاص خیال رکھیں۔ قاضی صاحب نے ہوٹل کے ملازم ہونے کے ناطے بھٹو صاحب کے ان مہمانوں کی بڑی خدمت کی اور وہ پیپلز پارٹی کے لیڈروں کے قریب آ گئے۔ قاضی صاحب بھٹو صاحب سے اتنے متاثر ہو چکے تھے کہ کسی کو بتائے بغیر وہ ان کی شان میں ایک نظم بھی لکھ چکے تھے۔ کسی نے وہ نظم جا کر بھٹو صاحب کو سنائی تو وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ بھٹو صاحب نے خورشید حسن میر اور نصراللہ خٹک سے کہا کہ وہ اس شخص سے ان کی ملاقات کروائیں جس نے ان پر یہ نظم لکھی ہے۔ بھٹو صاحب کے علم میں نہیں تھا کہ جس شخص نے یہ نظم لکھی ہے اس کا قد بمشکل تین فٹ تھا۔ ان دونوں نے بھٹو صاحب کو مذاقاً کہا کہ اب ان کی پارٹی واقعی 'Deep rooted' ہے کیونکہ اب ان کی پارٹی میں ایک ایسا ورکر بھی شامل ہو چکا ہے جس کا قد بمشکل تین فٹ ہے!

نصراللہ خٹک نے قاضی صاحب کو بتایا کہ بھٹو صاحب ان سے ملنا چاہتے ہیں اور وہ اسی کام کے لیے اسلام آباد آ رہے ہیں۔ جب ہوٹل کے عملے میں یہ خبر پھیلی کہ بھٹو صاحب ہوٹل کے ملازم قاضی صاحب سے ملنا چاہتے ہیں تو وہ سب ششدر رہ گئے۔ دوسری طرف قاضی صاحب جو ساری عمر لوگوں کے اچھالے گئے مذاق اور جگتیں سنتے آئے تھے وہ اندر سے خوفزدہ تھے کہ پتہ نہیں بھٹو صاحب انہیں دیکھ کر کیا ردعمل ظاہر کریں۔ ہو سکتا ہے کہ بھٹو صاحب انہیں دیکھ کر شدید مایوس ہوں اور اپنے سامنے تین فٹ قد کے نوجوان کو دیکھ کر ان کے منہ سے بے ساختہ ہنسی نکل جائے۔ قاضی صاحب سوچتے رہے کہ ان کے لیے وہ دکھ اور درد برداشت کرنا مشکل ہو جائے گا اگر بھٹو صاحب جیسے خوبصورت شخصیت کے مالک نے ان کا دوسروں کے سامنے صرف اس وجہ سے مذاق اڑایا کہ ان کا قد چھوٹا ہے۔ قاضی صاحب انہی وسوسوں اور اندیشوں میں گھرے ہوئے تھے کہ انہیں بتایا گیا کہ بھٹو صاحب ہوٹل پہنچ چکے ہیں اور اپنے کمرے میں ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ دھڑکتے دل اور کانپتی ٹانگوں کے ساتھ قاضی صاحب بھٹو صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے جن کے ساتھ مصطفیٰ کھر اور خورشید حسن میر بھی بیٹھے تھے۔ بھٹو صاحب قاضی صاحب کو دیکھ کر فوراً کھڑے ہو گئے۔ مصطفیٰ کھر اور خورشید حسن میر بھی بھٹو صاحب کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ بھٹو صاحب چند قدم آگے بڑھے، قاضی صاحب سے جھک کر ہاتھ ملایا اور بتایا کہ وہ ان سے ذاتی طور پر ملنا چاہتے تھے۔ جب وہ کمرے میں موجود صوفوں پر بیٹھ گئے اور ماحول دھیرے دھیرے بہتر ہوا تو قاضی صاحب نے بھٹو صاحب کو یہ بات بتا دی کہ وہ ان سے ملنے سے کیوں خوفزدہ تھے۔ بھٹو صاحب کے چہرے کا رنگ ایک دم بدل گیا اور تھوڑے سے غصے کے ساتھ بولے کہ آپ نے بھلا یہ کیسے سوچ لیا تھا کہ میں آپ پر اس وجہ سے ہنسوں گا یا مذاق کرنا شروع کر دوں گا کہ آپ کا قد چھوٹا ہے۔ بھٹو صاحب نے قاضی صاحب سے کہا کہ آج کے بعد کبھی بھی یہ نہیں سوچنا کہ میرے جیسا بندہ صرف اس وجہ سے لوگوں پر ہنسے گا کہ ان کے قد چھوٹے رہ گئے ہیں۔

جب سلطان محمود قاضی صاحب میرے سامنے بیٹھے آج سے پینتیس سال پہلے کے اس واقعے کو یاد کر رہے تھے کہ کس طرح بھٹو صاحب نے انہیں بے پناہ عزت اور احترام دیا تو میں محسوس کر سکتا تھا کہ ایک عام سیاسی ورکر کے لیے اس کی زندگی میں اس سے بڑا لمحہ کبھی نہیں آ سکتا تھا اور ورکر بھی خصوصاً ایسا جس نے ساری عمر اس معاشرے میں پھیلے اپنے جیسے انسانوں کی جگتوں اور غلیظ جملوں کا سامنا کیا ہو محض اس وجہ سے کہ قدرت نے اسے صرف تین فٹ کا پیدا کیا تھا۔

باتوں باتوں میں قاضی صاحب نے بھٹو صاحب کو بتایا کہ چونکہ وہ اس ہوٹل میں ان کے مہمان ہیں لہٰذا ان کے سارے اخراجات وہ اپنی جیب سے ادا کریں گے۔ بھٹو صاحب قاضی صاحب کی یہ بات سن کر بہت متاثر ہوئے اور بڑی شائستگی سے ان کا شکریہ ادا کر کے انہیں بل دینے سے منع کیا۔

بھٹو صاحب ان سے ملنے کے بعد کراچی چلے گئے۔ پتہ نہیں اس ملاقات کا ان پر کیا اثر ہوا تھا کہ بھٹو صاحب نے کراچی سے قاضی صاحب کو شکریے کا ایک خط بھیجا۔

اسی اثناء میں وہ ہوٹل جہاں قاضی صاحب کام کرتے تھے وہ ایک پاکستانی چوہدری نیاز احمد کو بیچ دیا گیا جنہیں کچھ عرصہ قبل جنرل یحییٰ خان نے کرپشن چارجز پر [illegible] کر دیا تھا۔ قاضی صاحب کے اندر ایک سیاسی ورکر جاگ چکا تھا۔ انہوں نے اخبار میں ایک بیان دے کر ہوٹل میں یونین بنانے کا اعلان کیا۔ جب یہ خبر چوہدری نیاز احمد نے پڑھی تو وہ آگ بگولا ہو گئے اور انہوں نے فوری طور پر قاضی

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

صاحب کو نوکری سے ڈس مس کر دیا۔ جب یہ خبر کسی طرح بھٹو صاحب کے کانوں تک پہنچی تو انہوں نے خورشید میر اور مصطفیٰ کھر سے کہا کہ وہ فوری طور پر چوہدری نیاز سے بات کر کے قاضی صاحب کو نوکری پر بحال کرائیں۔

چوہدری نیاز احمد تک بھٹو صاحب کا یہ پیغام پہنچایا گیا لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ کچھ دنوں بعد بھٹو صاحب اسلام آباد آئے اور انہوں نے مصطفیٰ کھر اور خورشید میر کی موجودگی میں چوہدری نیاز احمد سے فون پر درخواست کی کہ وہ قاضی صاحب کی نوکری بحال کر دیں کیونکہ وہ انہیں بہت عزیز ہیں۔ جب چوہدری نیاز احمد نے بھٹو صاحب کی درخواست سنی تو وہ بولے کہ قاضی صاحب نے ان کے خلاف ایک اخباری بیان جاری کیا ہے۔ اس پر بھٹو صاحب نے چوہدری نیاز احمد سے یہ کہا کہ وہ قاضی صاحب کے بیان کی وجہ سے انہیں پہنچنے والی زحمت پر معذرت خواہ ہیں۔

تاہم پتہ نہیں چوہدری نیاز کے ذہن میں کیا بات سمائی ہوئی تھی کہ انہوں نے بھٹو صاحب کی درخواست اور معذرت کو مسترد کر دیا اور قاضی صاحب کو نوکری پر بحال کرنے سے انکار کر دیا۔

چوہدری نیاز احمد کا انکار سن کر بھٹو صاحب بڑے غصے سے بولے:

”ٹھیک ہے پھر نیاز صاحب میں نے آپ سے کوئی اتنی بڑی چیز نہیں مانگ لی تھی کہ میرے سوری کرنے کے باوجود بھی آپ قاضی صاحب کو نوکری پر بحال کرنے پر تیار نہیں ہوئے۔ میں دو مہینے انتظار کر لیتا ہوں پھر آپ کو بھی دیکھ لیں گے۔“

فون بند کر کے بھٹو صاحب قاضی صاحب کی طرف مڑے اور بولے کہ آپ صرف دو مہینے انتظار کریں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

قاضی صاحب نے مسکرا کر بھٹو صاحب سے کہا کہ سر! میں اس ملک میں نئے انقلاب کے لیے سب کچھ بھگتنے کو تیار ہوں۔

ٹھیک دو مہینے بعد بھٹو صاحب اس ملک کے صدر بن گئے۔ صدر بنتے ہی بھٹو صاحب نے فون اٹھایا اور پہلا حکم یہی جاری کیا کہ قاضی صاحب کو نوکری دی جائے۔

پتہ نہیں بھٹو صاحب کے ذہن میں کیا آیا کہ دس ماہ بعد اچانک ایک دن بھٹو صاحب نے کسی سے پوچھا کہ کیا چوہدری نیاز احمد ابھی بھی اس ہوٹل کو چلا رہا ہے جہاں سے قاضی صاحب کو نکال دیا گیا تھا۔ بھٹو صاحب نے فوراً آرڈر دیے کہ چوہدری نیاز کو ہوٹل کی انتظامیہ سے نکال دیا جائے۔

قاضی صاحب کے لیے یہ بڑی بات تھی کہ بھٹو صاحب جیسے لیڈر نے ان کی نوکری کی خاطر ہوٹل کے مالک سے سوری کیا، صدر بنتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ انہیں نوکری دی اور جس شخص نے انہیں نوکری سے نکالا تھا اسے ہوٹل کی انتظامیہ سے نکال دیا۔ قاضی صاحب اب اس پیپلز پارٹی میں شامل ہو چکے تھے جو بھٹو صاحب کی پارٹی تھی۔ جب تک بھٹو صاحب اقتدار میں رہے قاضی محمود سٹیلائٹ ٹاؤن وارڈ راولپنڈی کے پارٹی صدر رہے۔ جب بھی پارٹی کی میٹنگ ہوتی بھٹو صاحب انہیں بے پناہ عزت دیتے جس سے ان کا اپنی پارٹی میں مقام بہت بلند ہو گیا۔ بھٹو صاحب اس وجہ سے بھی قاضی صاحب کے لیے احتراماً کھڑے ہو جاتے تھے تاکہ پارٹی کا کوئی دوسرا لیڈر یا ورکر ان کی توہین نہ کرے اور نہ ان پر کوئی جملہ کسے۔

اسی اثناء میں وہ ہوٹل مستقل طور پر بند ہو گیا اور قاضی صاحب ایک مرتبہ پھر سڑک پر آ گئے۔ کسی نے یہ بات بھٹو صاحب کے کانوں تک پہنچائی کہ ان کا پسندیدہ پارٹی ورکر پھر بے روزگار ہو گیا ہے۔ بھٹو صاحب نے فون اٹھایا اور انہیں PTDC ہوٹلز کا ڈپٹی منیجر مقرر کرنے کے آرڈرز کر دیے۔

سلطان محمود قاضی ایک صبح اٹھے تو پتہ چلا کہ وہ لیڈر جس نے انہیں عزت اور نوکری دی تھی اس کی حکومت پر ایک فوجی جنرل نے قبضہ کر لیا ہے اور وہ اس وقت گرفتار ہیں۔ قاضی صاحب کے لیے وقت آ گیا تھا کہ وہ اس شخص کے لیے اپنی وفاداری کا ثبوت دے جس نے اس کی نوکری کی خاطر ہوٹل کے مالک سے سوری تک کر لیا تھا۔ قاضی صاحب نے سارے کام چھوڑ دیے اور پارٹی کے ورکروں کو منظم کرنا شروع ہو گئے۔ گرفتاریوں سے بچانے کے لیے قاضی صاحب نے پیپلز پارٹی کے ورکروں کو اپنے گھروں میں چھپانا شروع کر دیا۔ بھٹو صاحب کی رہائی کے لیے انہوں نے مظاہرے کرانے کا انتظام کیا۔ اپنے گھر کا روٹی پانی چلانے کے لیے وہ نوکری کے ساتھ ساتھ ان سیاسی ورکروں کو بھی اکٹھا کرنے میں لگے ہوئے تھے جو ان دنوں ملک میں مارشل لاء لگنے کی وجہ سے یکدم تتر بتر ہو گئے تھے۔

ایک دن قاضی صاحب کو پتہ چلا کہ پیپلز پارٹی کے راولپنڈی کے صدر نے ہاتھ کھڑے کر دیے ہیں اور وہ جنرل ضیاء کے خلاف مظاہرہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ پارٹی ورکروں نے ہمت ہاری اور انہوں نے قاضی صاحب سے پوچھا کہ کیا وہ پارٹی کے راولپنڈی چیپٹر کے جنرل

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

کاروائی جاری رکھیں گے۔

قاضی صاحب حیرت سے دیکھتے رہ گئے کہ وہ اس جماعت [illegible]

اچانک قاضی صاحب کی آنکھوں میں ایک چمک آ گئی اور انہوں نے مجھے بتایا [illegible] ان کی سیاسی جدوجہد کی [illegible]

[illegible]

عباسی صاحب نے قاضی صاحب کو بتایا کہ وہ سیاسی جدوجہد چاہتے ہیں [illegible] اپنی پارٹی سے باقاعدہ [illegible] نے قاضی صاحب کو خبر دی [illegible]

قاضی صاحب پارٹی کے لیے [illegible] کے علاوہ [illegible] کر سکتے تھے کہ جب بھٹو صاحب کے وکیل راولپنڈی میں ان کا کیس لڑنے کے لیے ہوٹل میں آ کر ٹھہرتے تو وہ ان کی بڑی آؤ بھگت کرتے۔ بچے، بیگم اور دوسرے لوگ راولپنڈی کے فلیش مین ہوٹل میں آ کر ٹھہرتے اور وہ ان کے لیے جو سہولتیں ہوٹل میں پیدا کر سکتے تھے وہ کرتے۔

ایک دن بیگم بھٹو نے انہیں بتایا کہ بھٹو صاحب فلیش مین ہوٹل کے کھانے کے بڑے شوقین تھے۔ اس کے بعد وہ بھٹو صاحب کے لیے ہوٹل سے کھانا بھی ان کے لیے بھجواتے تھے۔

جس دن بھٹو صاحب کو راولپنڈی کورٹ نے سزا سنائی اس دن قاضی صاحب نے راولپنڈی شہر میں ایک بہت بڑے مظاہرے کا انتظام کیا۔ انہیں اسی دن گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ یہ پاکستانی تاریخ میں پہلی دفعہ ہوا تھا کہ تین فٹ کا ایک سیاسی ورکر اتنا قد آور ہو گیا تھا کہ جنرل ضیاء کی حکومت نے اسے گرفتار کر کے جیل میں رکھنا مناسب سمجھا۔

قاضی سلطان محمود کی سیاسی زندگی اب شروع ہو رہی تھی۔

گرفتاری سے قبل قاضی صاحب کو یہ سمجھ آ چکی تھی کہ بھٹو صاحب کے کیس کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ میڈیا کے محاذ پر بھی جنگ لڑیں۔ انہوں نے کہیں سے بی بی سی کے مارک ٹیلی کا پتہ ڈھونڈ نکالا۔ ان دنوں مارشل لاء ہونے کی وجہ سے اخبارات کو اجازت نہیں تھی کہ وہ بھٹو کے حق میں خبریں چھاپیں۔ بی بی سی ایک واحد ذریعہ رہ گیا تھا جس سے پاکستانیوں کو پتہ چلتا کہ ان کے ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ مگر مارک ٹیلی کا وہ [illegible] چکا تھا [illegible] ایک ایک لفظ پر پاکستانی یقین کرتے [illegible] بی بی سی اردو سروس [illegible]

قاضی صاحب نے مارک ٹیلی کو بی بی سی کے [illegible]

[illegible]

پارٹی کے [illegible] قاضی صاحب نے [illegible]

[illegible]

ایک دن [illegible] گرفتار کر کے جیل میں [illegible]

پھر جیل [illegible] بھٹو صاحب [illegible] پارٹی کے دوسرے لوگ تو جیل کی [illegible] قاضی صاحب کے لیے جیل میں یہ سب کچھ برداشت کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔

بارہ دن بعد قاضی صاحب کو رہا کر دیا گیا۔

○○○

قاضی صاحب جیل سے باہر اس لیے نہیں آئے تھے کہ وہ چپ کر کے گھر بیٹھیں گے اور اپنی وکالت کریں گے۔ انہوں نے ایک نئے سرے سے پارٹی ورکروں کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ ان کے جوش اور جذبے میں اس وجہ سے بھی تیزی آ گئی تھی کہ عدالتیں بھٹو صاحب کو پھانسی دینے کا حکم سنا چکی تھیں۔

ایک دن قاضی صاحب کو پھر گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔

ایک صبح جیل میں یہ خبر پھیل گئی کہ بھٹو صاحب کو پھانسی دے دی گئی ہے۔ قاضی صاحب اور پارٹی کے دیگر ورکرز جیل میں ایک دوسرے کے گلے لگ کر دھاڑیں مار مار کر روتے رہے۔ پارٹی کے یہ ورکرز جیل کی سلاخوں کے پیچھے سے اور تو کچھ نہیں کر سکتے تھے لیکن ان سب نے ایک دوسرے سے قسم کھائی کہ وہ بھٹو صاحب کی پھانسی کا بدلہ لیں گے۔

ایک دن قاضی صاحب کو ایک فوجی عدالت کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہاں ایک میجر صاحب جج

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

کی کرسی پر براجمان تھے جس نے انہیں نو ماہ کی قید با مشقت سنادی۔ قید کے علاوہ انہیں تین ہزار روپے جرمانہ بھی کیا گیا۔

میجر نے سر اٹھا کر طنزیہ نظروں سے اپنے سامنے کھڑے تین فٹ کے سیاسی ورکر کو دیکھا۔ اس کے اندر کا روایتی جٹ بار تھوڑی دیر کے لیے باہر نکلا اور بولا کہ مجھے تم پر ترس آرہا ہے کہ تم جیل کیسے کاٹو گے۔

قاضی صاحب نے آگے سے مسکرا کر جواب دیا کہ میجر صاحب! آپ پریشان نہ ہوں۔ میں افتخار تاری اور دیگر کی طرح جیل میں آنسو نہیں بہاؤں گا۔ میں بڑی عزت اور شان سے اپنے جیل کے دن گزار کر جنرل ضیاء سے دوبارہ لڑنے کے لیے واپس راولپنڈی کی سڑکوں پر آؤں گا۔

قاضی صاحب کا دل ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ میجر کے کمرے سے نکلنے سے پہلے وہ مڑے اور بولے

"میجر صاحب! آپ لوگوں کا کام اس ملک کی سرحدوں اور اس کی عوام کی حفاظت کرنا ہے۔ آپ کیسے لوگ ہیں۔ آپ نے ایک ایسے شخص کو پھانسی لگا دی جو آپ کے نوے ہزار فوجی بھارتی جیلوں سے واپس لے آیا تھا۔"

میجر کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ اور تو کچھ نہیں کرسکتا تھا اس نے حکم دیا کہ اس تین فٹ کے مجرم کو میانوالی جیل بھیج دیا جائے۔

قاضی صاحب نہ جیل میں روئے اور نہ ہی وہاں ماتم کیا کہ ان کے ساتھ کتنا بڑا ظلم کیا گیا ہے۔ جب وہ بڑی بہادری سے نو ماہ بعد جیل کاٹ کر رہا ہوئے تو پارٹی کے ورکروں نے انہیں کندھوں پر اٹھا لیا۔ وہ اب ان کے لیے مزاحمت کا ایک نشان بن کر ابھرے تھے۔ پارٹی کے ورکر یہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ ایک تین فٹ کا انسان اتنی بہادری اور ہمت کا مظاہرہ کرے گا۔

قاضی صاحب مارشل لاء حکومت کے لیے ایک مستقل درد سر بن چکے تھے۔ باقی تو انہیں چھوڑیں۔ مارشل لاء ڈپٹی ایڈمنسٹریٹر جنرل کے ایم عارف نے پی ٹی وی کی انتظامیہ پر دباؤ ڈالا کہ وہ قاضی سلطان محمود کو نوکری سے نکال دیں۔ (یہ وہی جنرل ہیں جنہوں نے کتاب Working

with Zia' لکھی ہے۔)

قاضی صاحب اب ان باتوں سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ اب ان کے لیے زندگی کا مقصد سرکاری نوکری کرنا نہیں بلکہ اس بھٹو کی پارٹی کے لیے کام کرنا تھا جس نے نہ صرف انہیں زندگی میں پہلی دفعہ عزت دی تھی بلکہ انہیں نوکری پر بحال کرانے کے لیے ہوٹل کے منیجر سے سوری تک کیا تھا۔

قاضی صاحب کو پتہ نہیں تھا کہ ابھی بھٹو صاحب کے عشق میں انہوں نے کچھ مزید امتحان بھی پاس کرنے تھے۔ 3 مارچ 1981ء کو جونہی پی آئی اے کے طیارے کے اغوا کی خبر پھیلی تو سب سے پہلے قاضی صاحب کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ راولپنڈی جیل سے انہیں گوجرانوالہ جیل بھیج دیا گیا۔ 8 اپریل کو انہیں آخر شاہی قلعے لاہور بھیج دیا گیا۔ جب قاضی سلطان شاہی قلعہ پہنچے تو انہیں پتہ چلا کہ وہاں فیصل صالح حیات، جہانگیر بدر، شفقت محمود اور دیگر پارٹی لیڈران پہلے سے ہی وہاں قید تھے۔ ان دنوں شاہی قلعہ پیپلز پارٹی کے ورکروں کے لیے ایک خوف اور وحشت کی علامت بن چکا تھا لیکن قاضی صاحب پھر بھی تین ماہ تک وہاں رہے۔

جب قاضی صاحب جیل سے واپس آئے تو انہیں ایک دفعہ پھر 27 دسمبر 1981ء کو گرفتار کر لیا گیا۔ اب کی دفعہ ان پر ایک پولیس کانسٹیبل کو قتل کرنے کا الزام لگایا گیا تھا۔ شاید کسی کو کوئی تھوڑی سی شرم آگئی تھی کہ بھلا تین فٹ کا ایک انسان چھ فٹ کے کانسٹیبل کو کیسے قتل کرسکتا تھا لہٰذا انہیں ایک ہفتے بعد رہا کر دیا گیا۔

قاضی صاحب جیل سے آئے تو انہوں نے دوبارہ سیاسی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ 25 مارچ 1982ء کو انہیں ایک مرتبہ پھر گرفتار کر لیا گیا۔ راولپنڈی سے انہیں لاہور لے جایا گیا۔ کچھ دن انہیں سی آئی اے کے چونا منڈی سنٹر میں رکھا گیا۔ وہاں سے انہیں ایک دفعہ پھر شاہی قلعے بھیج دیا گیا۔ مارشل لاء حکومت کا دل اس سے بھی نہیں بھرا۔ انہوں نے قاضی صاحب کو لال قلعہ بھیج دیا جہاں بھارتی جاسوسوں سے تفتیش کی جاتی تھی۔ قاضی صاحب کو وہاں ایک 7x4 فٹ کے ایک تاریک کمرے میں پھینک دیا گیا۔ وہ چودہ دن تک اس کمرے میں تشدد اور ذلالت برداشت کرتے رہے۔ لال قلعے سے نکال کر انہیں دوبارہ شاہی قلعے لایا گیا اور آخر میں انہیں کوٹ لکھپت جیل بھیج دیا گیا۔ انہیں سب سے خطرناک قیدیوں کی فہرست میں ڈال دیا گیا۔ وہاں ہر رات انہیں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں

www.freepdfpost.blogspot.com

alllurdupdfnovels.blogspot.com

[illegible] دیتا تھا/تھیں۔

ایک صبح انہیں بتایا گیا کہ آج انہیں جیل کے اندر ہی ایک فوجی عدالت میں پیش ہونا ہے [illegible] وہاں ایک فوجی میجر ایک [illegible] صاحب کر رہے ہیں۔ قاضی صاحب کے خلاف چارج شیٹ پڑھ کر سنائی گئی۔ جس میں کہا گیا کہ آپ کی [illegible] کے ساتھ مل کر جنرل ضیاء کو قتل کرنے کی سازش تیار کرنے کا الزام تھا۔

ایک موقع پر قاضی صاحب نے عدالت سے پوچھا کہ انہوں نے جنرل ضیاء کو قتل کرنے کی کوشش کب کی تھی؟ انہیں بتایا گیا کہ وہ یہ کام 1968ء میں کرنا چاہتے تھے۔

قاضی صاحب نے اپنی طرف سے میجر صاحب کو سمجھانے کی کوشش کی کہ جناب والا جنرل ضیاء کو 1968ء میں کیسے قتل کرنے کا پروگرام بنا سکتے تھے جب جنرل ضیاء کو جانتا بھی کوئی نہیں تھا اور سب سے بڑھ کر اس وقت جنرل ضیاء کو قتل کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔

میجر صاحب نے شرمندہ ہونے کے بجائے الٹا قاضی صاحب کو یہ کہہ کر لاجواب کر دیا کہ شاید مجھ سے پڑھنے میں کوئی غلطی ہوئی ہو اور یہ سال 1968ء نہیں بلکہ 1978ء ہو گا۔ اپنی خفت مٹانے کے لیے میجر صاحب بولے کہ بائی دا وے اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ اگر تم نے جنرل ضیاء کو قتل کرنے کی سازش 1968ء میں کی تھی۔ اصل بات تو یہ ہے کہ تم نے جنرل ضیاء کو قتل کرنے کی سازش تیار کی تھی جس کی تمہیں سزا ملنا ضروری ہے۔

یہ کہہ کر میجر صاحب نے انہیں تین سال کی سزا کا حکم سنا دیا۔ وہیں سے انہیں [illegible] جیل بھیج دیا گیا۔ تین سال بعد 15 جون 1985ء کو انہیں کل ساڑھے پانچ سال جیل کاٹنے کے بعد جیل سے رہا کر دیا گیا۔ (اس سزا میں ڈھائی سال کا وہ عرصہ بھی شامل ہے جو وہ اس تین سال کی سزا سے پہلے مختلف جیلوں میں گزار چکے تھے۔)

قاضی صاحب پانچ سال جیل کاٹنے کے بعد اب ایک تھکے ہوئے سیاسی ورکر بن چکے تھے [illegible] انہوں نے [illegible] This is a larger than life۔

جب [illegible] بے نظیر بھٹو اور نصرت بھٹو پاکستان سے باہر تھیں۔ انہوں نے [illegible]

ایک [illegible] 1978ء [illegible] سے [illegible] جب وہ انہیں [illegible] جیل میں [illegible] ملتی تھیں۔

پاکستان پیپلز پارٹی [illegible] 10 اپریل 1986ء کو بے نظیر بھٹو [illegible] لاہور [illegible] لوگوں کے ہجوم نے ان کا استقبال کیا [illegible] قاضی صاحب کو اپنے کندھوں پر اٹھایا اور جب بے نظیر بھٹو [illegible] اپنے گلے میں پڑے ہوئے [illegible] قاضی صاحب کی طرف پھینکے [illegible] بے نظیر بھٹو صرف قاضی صاحب کو جانتی ہیں بلکہ وہ ان کے جیل میں گزارے ہوئے پانچ سالوں سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔

قاضی صاحب پر لاہور کے جلسے میں پھول پھینک کر بھی بے نظیر بھٹو کی تسلی نہیں ہوئی۔ جب دو دن بعد 18 اپریل کو راولپنڈی میں پارٹی کا جلسہ ہوا تو پارٹی کے بڑے بڑے لیڈروں کی موجودگی کے باوجود بے نظیر بھٹو نے کہا کہ قاضی صاحب ہی اس جلسے کے سٹیج سیکرٹری ہوں گے۔ بے نظیر بھٹو نے خود ذاتی طور پر قاضی صاحب سے کہا کہ آج انہوں نے جس جلسے سے خطاب کرنا ہے وہ اس کے سٹیج سیکرٹری کے فرائض سرانجام دیں گے۔

قاضی صاحب کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بے نظیر بھٹو نے انہیں بتایا کہ قاضی صاحب میرے پاپا آپ کی بہت عزت کرتے تھے۔ وہ آپ سے بہت پیار کرتے تھے اور آپ میرے سگے بھائیوں کی طرح ہیں۔

قاضی صاحب سے کچھ نہ بولا گیا اور وہ جواب میں صرف اتنا [illegible] آپ [illegible]

[illegible]

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

جنت، باقی اس وقت پر قد آور لیڈر اپنے گھروں کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے چپک رہے تھے۔

جذبات سے عاری بینظیر بھٹو ہوتی۔ یہی کہ کوئی بھی شاہی قلعے نہیں گیا تھا۔ قاضی صاحب بھی چھ ماہ تک سختیاں جھیلتے رہے۔ پارٹی کے لیے اس سے بڑی اور کوئی قربانی نہیں ہو سکتی۔

میں نے محسوس کیا کہ قاضی صاحب مجھے یہ ساری باتیں بتاتے ہوئے خود بھی ان لمحوں میں کھو گئے تھے جب بینظیر بھٹو نے اس مشن کے سیاسی ورکروں کو اپنی پارٹی کے قد آور لیڈروں سے بھی زیادہ پیار اور عزت دی تھی۔ قاضی صاحب نے بتایا کہ بینظیر بھٹو انہیں اپنا سا عزت اور احترام دیتی تھیں اور پارٹی کے معاملات میں ان کی بات بڑے غور سے سنتی تھیں۔ یہی وجہ تھی جب 2002ء کے انتخابات میں لاہور میں ہونے والی ایک پارٹی میٹنگ میں پارٹی کے امیدواروں کو ٹکٹیں دینے کا فیصلہ ہو رہا تھا تو بینظیر بھٹو نے جو اس وقت دبئی میں تھیں اور ٹیلیفون پر اس میٹنگ میں شریک تھیں، اس وقت تک آخری فیصلہ کرنے سے انکار کیا جب تک انہیں یہ نہیں بتا دیا گیا کہ قاضی سلطان صاحب بھی اس میٹنگ میں شریک ہیں۔ بینظیر بھٹو نے قاضی صاحب سے پوچھا کہ وہ انہیں پارٹی کے نامزد امیدواروں کی سیاسی قوت کے بارے میں اپنی رائے دیں۔ جب قاضی صاحب نے اپنی رائے دی تو بینظیر بھٹو نے اس رائے کا احترام کیا۔

اس سے قبل جب 1988ء میں بینظیر بھٹو پہلی دفعہ برسر اقتدار آئیں تو پارٹی نے اپنے ورکروں کو بے پناہ عزت دی اور پارٹی کے معاملات پر بھی ان کی بات کو اہمیت دی جاتی۔ یہی وجہ تھی جب 1989ء میں بینظیر بھٹو کے خلاف قومی اسمبلی میں تحریک عدم اعتماد پیش کی گئی تو پارٹی کے ورکروں نے اپنی حکومت کے حق میں ایک بہت بڑا جلوس نکالا۔ جب 1990ء میں غلام اسحٰق خان نے بینظیر بھٹو کی حکومت کو برطرف کیا تو پارٹی کے ورکر سڑکوں پر نکل آئے۔ قاضی صاحب کو اس بات کا گلہ تھا کہ جب دوسری دفعہ بینظیر بھٹو صاحبہ اقتدار میں آئیں تو پارٹی لیڈر بہت بدل چکے تھے۔ سیاسی ورکروں کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔ لیڈروں اور ورکروں کے درمیان فاصلہ بڑھ گیا تھا۔ قاضی صاحب کو محسوس ہوا کہ اس پارٹی کے ورکر اور لیڈر دونوں کہیں کھو گئے تھے۔ پارٹی قیادت نے اپنی لائن بدل لی تھی۔ ان لوگوں کو زیادہ اہمیت ملنے لگی جنہیں بھٹو صاحب کے کاز سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ محض اپنی جیبیں بھر رہے تھے۔ فاروق لغاری سکول آف تھاٹ پارٹی میں امیر لوگوں کو شامل کرنے پر کام کر رہا تھا۔ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے پارٹی کے ورکروں کی حوصلہ شکنی کی اور وہ یہ بھول گئے کہ پارٹی کے ورکر ہی ان کی اصل

طاقت تھے۔ یہی وجہ تھی جب 5 نومبر 1996ء کو فاروق لغاری نے بینظیر حکومت کو ڈس مس کیا تو پارٹی کے تھکے ہوئے اور مایوس کارکن نہ ہی سڑکوں پر احتجاج کرنے آئے اور نہ ہی ووٹ ڈالنے کے لیے پولنگ اسٹیشن پر گئے۔

تاہم پارٹی کے دوسرے مایوس کارکنوں کے برعکس قاضی صاحب اپنی پارٹی کے ساتھ وفادار رہے۔ اگرچہ پارٹی لیڈروں کے رویے سے قاضی صاحب کے دل میں شکوہ پیدا ہوتا تھا، نواز شریف کی حکومت کے خلاف احتجاج کرنے پر قاضی صاحب کو ایک دفعہ جیل بھیج دیا گیا۔

تاہم قاضی صاحب نے مجھے بتایا کہ انہوں نے نواز شریف کی حکومت میں جیل کاٹی جو ایک بھی کرتے ہیں اور سیاسی مخالفوں کو جیل میں ڈال دیتے ہیں۔ سیاسی جماعتیں ایک سیاسی ورکر کو کس طرح تربیت کرتی ہیں جو بعد میں سیاسی ورکروں کو جیلوں میں ایک مجرم کی طرح ڈال دیتے ہیں۔

میں نے قاضی صاحب سے پوچھا کہ بینظیر بھٹو کے دور حکومت میں ان سے کیا غلطیاں ہوئیں جس سے وہ ایک دفعہ پھر اسٹیبلشمنٹ کے ہاتھوں اس کرسی سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔

قاضی صاحب کا کہنا ہے کہ دراصل بینظیر بھٹو صاحبہ دوسری دفعہ پارٹی کے ورکروں سے وہ تعلق رکھنے میں ناکام رہیں جو انہوں نے ماضی میں ان کے ساتھ رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب مرتضیٰ بھٹو قتل کیا گیا تو بینظیر بھٹو کی حکومت کے لیے سڑکوں پر کوئی نہیں آیا کیونکہ لیڈروں اور پارٹی ورکروں کے درمیان وہ رابطہ ختم ہو چکا تھا جو ایک سیاسی جماعت کی جان ہوتا ہے۔ بدقسمتی تھی کہ اس وقت تک کسی کو اس بات کا احساس نہیں تھا۔

جب نواز شریف دوسری دفعہ اقتدار میں آئے تو ان پر دو تہائی اکثریت کا نشہ چڑھا ہوا تھا۔ قاضی سلطان محمود پر نواز شریف حکومت میں بہت سارے مقدمے درج کر کے انہیں جیل بھیج دیا گیا۔ اب قاضی صاحب جولائی 2003ء میں میرے ساتھ بیٹھے اپنے پورے سیاسی ماضی کو کھنگال رہے تھے تو اس وقت بھی وہ راولپنڈی، گوجر خان، کوٹلی ستیاں، اسلام آباد، چکوال، داؤد خیل، اٹک اور دیگر شہروں میں بینظیر پارٹی کے لیے سیاسی ریلیاں نکالنے کے الزام میں پولیس کو مطلوب تھے۔

نواز شریف کے بعد جنرل مشرف اقتدار میں آئے اور لیگل فریم ورک آرڈر کے خلاف ایک مظاہرے کا بندوبست کرنے پر قاضی صاحب کے نام ایک دفعہ پھر پرچہ درج کر دیا گیا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

allurdupdfnovels.blogspot.com

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfbooks!!blogspot!!com!!

قاضی صاحب ایک مطمئن انسان ہیں۔ وہ اپنے بھتیجوں اور خاندان کے دیگر لوگوں کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔ لوگ اب ان کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ وہ اس بات پر بڑا فخر کرتے ہیں کہ پیپلز پارٹی کے ورکر ہیں اور سب سے بڑھ کر ذوالفقار علی بھٹو سے لے کر نصرت بھٹو، بینظیر بھٹو، زرداری صاحب تک سب لوگ ان کی عزت کرتے رہے ہیں۔

میں نے قاضی صاحب سے پوچھا کہ اب وہ آنے والے دنوں میں اپنا کیا سیاسی مستقبل دیکھ رہے ہیں تو وہ بولے کہ میری زندگی کی خواہش ہے کہ میں پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر سینیٹر بنوں۔ 2003ء کے مارچ میں ہونے والے انتخابات میں زرداری صاحب نے کوشش کی تھی کہ مجھے پارٹی کا ٹکٹ مل جائے لیکن پنجاب میں سیٹیں کم ہونے کی وجہ سے میرا نام ڈراپ کر دیا گیا تھا۔

زرداری صاحب واقعی یاروں کے یار ہیں۔ وہ 2003ء میں قاضی سلطان محمود کو پنجاب سے سینیٹ کا ٹکٹ تو نہ دلوا سکے لیکن بینظیر بھٹو کے قتل کے بعد جب 2008ء میں وہ پارٹی کے کو چیئرمین بنے تو انہوں نے اپنے پہلے چند کاموں میں سے جو ایک کام کیا وہ یہ تھا کہ انہوں نے قاضی سلطان محمود کو پیپلز پارٹی کی سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کا ممبر بنا دیا جہاں یوسف رضا گیلانی، مخدوم امین فہیم، راجہ پرویز اشرف، صفدر عباسی، رحمان ملک، نواب یوسف تالپور، قائم علی شاہ، شاہ محمود قریشی، احمد مختار، رضا ربانی، خورشید شاہ جیسے لوگ بیٹھتے ہیں۔ میرا خیال ہے آصف زرداری نے بھٹو کے اس سیاسی ورکر کو جس کو جنرل ضیاء کو قتل کرنے کی سازش کے جرم میں پانچ سال سزا دی گئی تھی، وہ عزت دی ہے جو انہیں شاید سینیٹر بن کر بھی نہ ملتی۔

جنرل محمد امجد

غالباً 2003ء کی بات ہے کہ میں اور انگریزی اخبار ڈان کے دوست رپورٹر ارشد شریف جو آج کل ڈان کے انگریزی چینل ڈان نیوز کے اسلام آباد میں بیورو چیف ہیں، اکٹھے قومی اسمبلی کا وقفہ سوالات کرتے تھے۔ ارشد شریف بہت ہی ٹیلنٹڈ صحافی ہیں۔ وہ ان صحافیوں میں سے ہیں جن کی میں بے پناہ عزت کرتا ہوں۔

ایک دن میں وقفہ سوالات سے ذرا لیٹ ہوا تو میں نے ارشد شریف کو قومی اسمبلی کی لابی میں تیزی سے جاتے ہوئے دیکھا۔ میں ان کے پیچھے دوڑا تو پتہ چلا کہ موصوف اس وقت وزارت دفاع کے پارلیمانی سیکرٹری میجر تنویر حسین (گلوکارہ طاہرہ سید کے بھائی) کے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔ میرے پوچھنے پر ارشد بتانے لگے کہ دراصل تھوڑی دیر پہلے ایک سوال کے جواب میں میجر صاحب نے قومی اسمبلی کو بتایا تھا کہ فوجی فاؤنڈیشن کی ایک شوگر مل کی فروخت میں خاصی بے ضابطگیاں ہونے پر تحقیقات جاری ہیں۔

میں حیران ہوا کہ اس طرح کی خرید و فروخت اور اس میں بے ضابطگیاں بڑی عام سی بات ہے۔ ارشد نے میری طرف دیکھا اور کہا جناب عالی! یہ کوئی عام بات نہیں ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ فوجی فاؤنڈیشن کا ایم۔ ڈی کون ہے۔ میں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو ارشد شریف بولے کہ حضور اس لیے آپ

www.freepdfpost.blogspot.com

allurdupdfnovels.blogspot.com

اس خبر کی اہمیت نہیں سمجھ رہے۔ جنرل محمد امجد اس فوجی فاؤنڈیشن کے چیئرمین ہیں جس پر یہ الزام لگ رہا ہے کہ اس کی فروخت میں خاصی بے ضابطگیاں ہوئی ہیں۔

میرے ذہن میں فوری طور پر جنرل امجد کا نام کلک نہیں ہوا۔ ارشد نے مسکراتے ہوئے کہا کہ جناب یہ وہی موصوف ہیں جو پہلے نیب کے چیئرمین تھے اور جنہوں نے احتساب کے نام پر 12 اکتوبر 1999ء کے بعد جو بھی ان کے ہاتھ چڑھا انہوں نے اسے اٹھا لیا۔ گرفتاری پہلے کی گئی اور الزامات بعد میں عائد کیے گئے۔

میں چونک پڑا۔ میں نے ارشد سے کہا استاد یہ تو واقعی بڑی خبر ہے۔

خیر، مختصر تو یہ ہے ہماری ملاقات ختم ہوئی۔ ہم دونوں نے بیٹھ کر وہ خبر بنائی۔ اس خبر کی مختصر تفصیلات کچھ یوں تھیں کہ سندھ میں فوجی فاؤنڈیشن کی ایک اپنی شوگر مل تھی۔ جنرل امجد اس کے ایم ڈی بنے تو اسے فروخت کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔ دو تین پارٹیوں سے بات چیت ہوئی۔ ایک پارٹی نے 37 کروڑ میں وہ مل خریدنے میں دلچسپی ظاہر کی۔ دوسری پارٹی نے اس کی بولی تیس کروڑ روپے لگائی۔ فوجی فاؤنڈیشن نے وہ شوگر مل تیس کروڑ روپے والے کے ہاتھ بیچ دی۔ اس خوش قسمت انسان نے دو تین دن بعد وہی شوگر مل 37 کروڑ بولی لگانے والی پارٹی کو بیچ دی۔ یوں راتوں رات اس نیک انسان نے بغیر کچھ کیے سات کروڑ روپے کما لیے۔ بعد میں پتہ چلا کہ جن صاحب کو یہ تیس کروڑ روپے کی مل بیچی گئی تھی وہ جنرل صاحب کے خیر خواہوں میں سے تھے۔

جب یہ خبر ڈان اور دی نیوز میں چھپی تو اس پر خاصا واویلا ہوگیا۔ سینیٹ کے اجلاس میں فرحت اللہ بابر نے اس پر اچھی خاصی تقریر کی اور معاملے کو قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی برائے دفاع میں بھیج دیا گیا۔

اس سٹوری کے چھپنے کے اگلے دن بعد فوجی فاؤنڈیشن نے انگریزی اخباروں میں ایک بہت بڑا اشتہار دیا جس میں بغیر اس بات کے انکار کیے کہ سرکاری طور پر اس ڈیل کے خلاف تحقیقات ہو رہی تھیں محض یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ سب اچھا تھا۔

آصف زرداری، یوسف رضا گیلانی اور دیگر اپوزیشن کے رہنما، جیلوں میں جنرل امجد کی چلائی ہوئی نیب کے ہاتھوں سزائیں بھگت رہے تھے۔ آج جنرل امجد خود کرپشن کے الزامات کا سامنا کر رہے تھے۔ یوں پیپلز پارٹی نے اس سکینڈل کو خوب اچھالنے کا فیصلہ کیا اور بات بڑھنی شروع ہوگئی۔

ایک دن میں قومی اسمبلی میں تھا کہ مجھے اعلیٰ پائے کی جرنلسٹ بینا سرور کا فون آیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ جنرل امجد ان کے انکل ہیں اور آج کل ان خبروں کی وجہ سے بڑے پریشان ہیں۔ بینا نے مجھے اتنا کہا کہ آپ اگر مناسب سمجھیں تو ان کا پوائنٹ آف ویو لے لیں۔ باقی آپ کی مرضی کہ آپ نے کیا اور کیسے لکھنا ہے۔

میں بینا سرور کی اس بات کی داد دوں گا کہ انہوں نے مجھے ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں کہا کہ چونکہ جنرل امجد ان کے انکل ہیں لہٰذا میں کچھ ان کا خیال کروں جیسے عموماً ہم صحافی لوگ ایک دوسرے کو اپنے دوستوں یا قریبی رشتہ داروں کو اس طرح کی صورتحال میں پار کرتے رہتے ہیں۔ وہ ہمارے جنگ گروپ میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ صحافت میں مجھ سے بہت سینئر ہیں لہٰذا میں توقع کر رہا تھا کہ شاید وہ مجھے اپنے انکل پر کچھ ہاتھ ہولا رکھنے کا کہیں گی لیکن انہوں نے خالصتاً ایک پروفیشنل بات کی کہ مجھے ان کا پوائنٹ آف ویو بھی لے لینا چاہیے۔

بات چل نکلی ہے تو میں آپ کو یہ بھی بتاتا چلوں کہ شاید بینا سرور کو یاد نہ ہو کہ 90 کی دہائی کے وسط کی بات ہے، وہ لاہور میں دی نیوز آن سنڈے کی انچارج تھیں۔ میں ان دنوں نیا نیا صحافت میں آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں دی نیوز کے لاہور میں واقع دفتر میں دی نیوز آن سنڈے کے ہی ادارے ملتان کے اچھے صحافی خالد حسین سے ملنے چلا گیا۔ خالد حسین سے تو ملاقات نہ ہوسکی تاہم بینا سرور سے مل لیا۔ وہ اس وقت کمپیوٹر پر بیٹھی کام کر رہی تھیں۔ تمام روایتی صحافیوں کی طرح انہوں نے بھی کمپیوٹر سکرین سے نظریں ہٹائے بغیر مجھ سے دو تین منٹ بات کی۔ مجھ سے پوچھا کہ میں ملتان میں بیٹھ کر کس طرح کی رپورٹنگ کر سکتا ہوں۔ میں نے دو تین آئیڈیے انہیں بتائے۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ان دنوں ایم کیو ایم ملتان میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بینا سرور بولیں کہ اب اس کا کیا فائدہ؟ ایم کیو ایم کا شوشہ پٹ گیا تھا۔ ان کو تو ملتان سے کوئی اچھا رسپانس نہیں ملا تھا۔ اب مردہ گھوڑے میں جان ڈالنے کا کیا فائدہ۔ دو تین منٹ کی گفتگو کے بعد میں نے اجازت لی کیونکہ مجھے احساس ہوگیا تھا کہ وہاں دال نہیں گلنے والی۔

مجھے یقین ہے کہ بینا سرور کو یہ ملاقات ہرگز یاد نہیں ہوگی کیونکہ اس طرح کے کئی نوجوان گاؤں سے آنکلتے ہیں اور اخباروں کے دفتروں میں پھرتے رہتے ہیں اور میں بھی ان میں سے ایک تھا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

!!!allurdupdfnovels!!!blogspot!!!com!!

www.freepdfpost.blogspot.com

allurdupdfnovels.blogspot.com

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

جنرل ہیں اور میں ایک صحافی ہوں اس وجہ سے یقیناً آپ کا خیال کرتا ہوں کہ آپ ہماری بہتر رہنمائی کر سکنے کے اہل ہیں۔

میں رپورٹر کی حیثیت سے کسی شخص کو مشورہ دینے پر یقین نہیں رکھتا۔

اتنی دیر میں میں نے محسوس کیا کہ لوہا گرم تھا۔ جنرل صاحب میری باتیں سننے کے موڈ میں تھے۔ میری گفتگو کا رخ بدلا اور میں نے تھوڑی دیر کی گفتگو کے بعد انہیں اس بات پر راضی کر لیا کہ مجھے اس دور کی کچھ کہانیاں بتائیں جب وہ نیب کے چیئرمین تھے۔

جنرل امجد بار بار اپنے امیج کے بارے میں بہت فکرمند تھے جو ان کے بقول میری خبروں سے بہت بری طرح تباہ ہوا تھا۔ اب وہ چاہتے تھے کہ اس امیج کو دوبارہ بہتر کیا جائے۔

میں دل ہی دل میں مسکرایا کہ بھلا جو چیز ایک دفعہ بگڑ جائے اسے کیسے ٹھیک کیا جا سکتا ہے۔

میں نے کہا کہ جنرل صاحب! اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ آپ مجھے ذرا کھل کر نیب کے چیئرمین کی حیثیت سے کچھ واقعات سنائیں تاکہ لوگوں کو پتہ چلے کہ آپ کتنے اچھے تھے اور آپ کو کیوں اور کیسے وہاں سے ہٹایا گیا۔

میں نے محسوس کیا کہ جنرل امجد ان دنوں کے بارے میں بات کرنے میں کچھ تذبذب کا شکار تھے۔ خیر، میں نے بھی ہمت نہیں ہاری اور یوں جنرل امجد پہلی دفعہ کسی صحافی کو انٹرویو دینے کے لیے تیار ہو گئے۔

جنرل امجد نے اپنی کرسی سے ٹیک لگائی۔ وہ اپنے ماضی میں کھو گئے اور میں کافی کی چسکیاں لینے لگا۔

12 اکتوبر 1999ء کو جنرل امجد اس وقت میجر جنرل تھے۔ شام کو گالف کھیل کر راولپنڈی میں واقع اپنے گھر واپس گئے تو انہیں پتہ چلا کہ جنرل مشرف کو واپس [illegible] کر کے جنرل ضیاء الدین بٹ کو آرمی چیف لگا دیا گیا تھا۔ [illegible] جنرل امجد کے جنرل مشرف اور جنرل بٹ دونوں سے اچھے تعلقات تھے۔ [illegible] 1995ء [illegible]

پہلے بھی قریب تھے کہ وہ جی ایچ کیو میں بیٹھ کر بہت سارے اہم معاملات ڈیل کرتے تھے جن کا آرمی چیف جنرل مشرف سے براہ راست واسطہ رہتا۔

میں نے جنرل امجد سے پوچھا کہ ان کا اپنا ذاتی خیال کیا تھا کہ فوج کو مارشل لاء لگانا چاہیے تھا۔ وہ کہنے لگے کہ آرمی مختلف انداز میں کام کرتی ہے۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے انہوں نے کہا کہ جب 1988ء میں جنرل ضیاء کی موت کے بعد جنرل اسلم بیگ نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ مارشل لاء نہیں لگائیں گے تو پوری فوج نے انہیں سپورٹ کیا، لیکن اسی فوج نے جنرل مشرف کا ساتھ دیا جب انہوں نے 12 اکتوبر کو مارشل لاء لگایا۔ اس سے آپ کو آرمی کی تربیت کا اندازہ ہو جائے گا۔

ایک دن جنرل امجد کو بلا کر یہ کہا گیا کہ آج کے بعد انہوں نے پاکستان میں بے رحمانہ قسم کا احتساب کرنا ہے۔

جنرل امجد بڑے حیران ہوئے کہ آخر انہیں جنرل مشرف نے اس کام کے لیے کیوں چنا تھا۔ اپنی تقریر میں جنرل مشرف نے ان کے کندھوں پر ذمہ داری اور بڑے حادثی جب میڈیا کے لوگوں کو انہوں نے خود یہ بتایا کہ ایک دن انتہائی ایماندار اور اچھے آرمی آفیسر کو نیب کا چیئرمین لگا دیا گیا تھا۔ جنرل امجد کو جنرل مشرف کی 16 اکتوبر 1999ء کو کی گئی تقریر سے یہ اندازہ ہوا کہ فوج اب کس رخ پر سیاستدانوں اور بیوروکریٹس کا احتساب کرنا چاہتی تھی۔

جنرل مشرف نے جنرل امجد کو بلا کر کوئی بات نہیں سمجھائی کہ انہوں نے کیا کرنا تھا۔ جنرل امجد کو صرف اتنا بتایا گیا کہ انہوں نے ہر ایک کے خلاف کارروائی کرنی تھی اور احتساب کرنا تھا۔

جنرل مشرف کے ان الفاظ نے جنرل امجد کو وہ اعتماد دیا کہ پھر انہوں نے مڑ کر پیچھے نہیں دیکھا۔ جنرل امجد کے نزدیک سب سے آسان ٹارگٹ وہ لوگ تھے جنہوں نے بینکوں کے قرضے واپس نہیں کیے تھے اور جن کی فہرست فوری طور پر مل گئی تھی۔ جنرل صاحب نے فوری طور پر بینکوں کے [illegible] جنرل امجد نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ [illegible] 186 [illegible] 16 [illegible] 1999 [illegible]

www.freepdfpost.blogspot.com

!!!allurdupdfnovels!!!blogspot!!!com!!!

قرضے واپس کر دیں ورنہ وہ فوری ایکشن لیں گے۔ جوں جوں یہ ڈیڈ لائن قریب آتی جا رہی تھی، جنرل امجد بینکوں کے چیفس کے ساتھ ان بڑے مجرموں کی فہرستیں بنانے میں مصروف تھے جو قرضے واپس نہیں کر رہے تھے۔ 17 نومبر کو انہیں ان 28 لوگوں کی فہرست دی گئی جو جان بوجھ کر بینکوں کے قرضے واپس نہیں کر رہے تھے۔ بینکوں کی رپورٹ کے مطابق 211 ارب روپے کے قرضے واپس نہیں کیے گئے تھے۔ 146 ارب کے قرضوں کی وصولی ممکن تھی کیونکہ وہ بینک کے ساتھ ایک معاہدے کے تحت چل رہے تھے جبکہ 90 ارب روپے کا قرضہ واپس ملنے کی امید نہیں تھی۔ جنرل امجد نے احتساب کو ترجیح دیتے ہوئے ٹیکس چوری، فراڈ، لینڈ مافیا، اسمگلنگ، بھتہ خوری اور معمولی کی کرپشن کے خلاف ایکشن لینے کا فیصلہ کیا۔ جونہی ان کمیٹی کی فہرست بنی تو پتہ چلا کہ لینڈ اسکینڈل، ٹیکس چوری، ڈیوٹی کرپشن اور رشوت سے بھی کئی گنا زیادہ تھے۔ کیونکہ بعد میں نیب نے حکمت عملی بدلی اور سیاستدانوں کو ٹارگٹ کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا۔

میں نے جنرل صاحب سے پوچھا کہ یہ بتائیں کہ یہ فیصلہ کس نے کیا تھا کہ احتساب کی اس فہرست میں صرف سیاستدانوں اور بیوروکریٹس کو نشانہ بنایا جائے گا جبکہ ججوں، جرنیلوں اور صحافیوں سے کوئی نہیں پوچھے گا؟ یا یہ کہ ان تین طاقتور اداروں کو احتساب سے باہر رکھا گیا تاکہ انہیں اپنے ساتھ ملا کر سیاستدانوں اور بیوروکریسی کے خلاف اپنی مرضی کا ایکشن لیا جاسکے یا پھر ان کے ذہن میں یہ تھا کہ ان تین اداروں کے لوگوں کو ہاتھ نہیں لگانا تھا۔

جنرل امجد نے جواب دیا کہ یہ فیصلہ انہوں نے خود ہی کیا تھا کہ صحافیوں اور ججوں کا احتساب نہیں ہوگا کیونکہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کے قانون کی ضرورت صرف سیاستدانوں اور بیوروکریٹس کے لیے تھی۔

میں نے کہا کہ جنرل صاحب! آپ کو تو جنرل مشرف نے اپنے سیاسی مخالفین کی سیاسی وفاداریاں تبدیل کرنے کے لیے استعمال کیا تھا تاکہ وہ اس ملک کے جمہوری ادارے چھوڑ کر اپنے فوجی اقتدار کو جائز بنا سکیں۔ جنرل امجد نے اس بات سے اتفاق نہیں کیا۔ وہ بولے کہ وہ تو سب لوگوں کے خلاف احتساب کر رہے تھے۔

اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے وہ مجھے بتانے لگے کہ انہوں نے [illegible] کے تمام سیاسی پارٹیوں میں موجود کرپٹ لوگوں کے خلاف کارروائی شروع کی تھی۔ باتوں ہی باتوں میں وہ اس بات کا انکشاف کر گئے کہ ان کے بعد آنے والے نیب کے چیئرمین نے یقیناً ان لوگوں کے خلاف تحقیقات کی ہوں گی جن کے خلاف ان کے دور میں فائلیں بنائی گئی تھیں اور جو جنرل مشرف کے سیاسی دوست بن چکے تھے۔

ان کا اشارہ یقیناً جنرل خالد مقبول کی طرف تھا۔

جنرل کا خیال تھا کہ وہ اس ملک میں کوئی احتساب نام کی چیز بحال نہیں کر رہے تھے۔ اس سے پہلے سیف الرحمٰن بھی نواز شریف کے دور میں یہی کچھ کر رہے تھے۔ اب کی دفعہ فرق صرف اتنا تھا کہ نیب کے پاس احتساب بیورو سے زیادہ پاور تھی۔ نئی فوجی حکومت نے پرانے احتساب کے قوانین کو [illegible] کر کے ان کو حقیقی معنوں میں نافذ کر دیا تھا۔

میں نے کہا کہ جنرل صاحب! آپ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdf!!novels!!blogspot!!com!!

کیا کہ جب تک وہ نیب میں رہے ہیں، جنرل مشرف نے انہیں ایک دن بھی کسی کو گرفتار کرنے سے روکا ہو یا [illegible]
نہیں کہا۔ انہیں ایک طرح کا فری ہینڈ دیا گیا تھا۔

میں نے کہا کہ جنرل صاحب! آپ کی یہ پوزیشن تو یہ کہہ رہی ہے کہ آپ نے ان اہم
سیاستدانوں کو گرفتار کیا جنہوں نے پی ایم ایل کیو میں شامل ہونے سے انکار کیا تھا۔

جنرل امجد نے مجھے ایک عجیب سی بات کی کہ جب اٹھے تو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ کس سیاستدان
کا کس پارٹی سے تعلق تھا۔ یہاں کسی کو کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ ایک سیاستدان کتنے دن ایک پارٹی میں
گزارتا ہے اور دوسرے ہی دن کوئی اور پارٹی جوائن کر لیتا ہے۔ پاکستان مسلم لیگ بھی اسے جنرل [illegible]
[illegible] ہونے میں بھی [illegible] وقت لگتا ہے۔ [illegible]
کی پارٹی کے سیاستدانوں کو اس لیے بھی گرفتار کیا گیا تھا کہ پچھلے [illegible] ان [illegible]
کے [illegible] تھی اور اب تک بھی ان [illegible] ہوا تھا۔

میں نے کہا کہ جنرل صاحب اس طرح کے احتساب میں تو پھر بہت سارے سوالات پیدا ہوتے
ہیں جیسا کہ پاکستان مسلم لیگ (ن) کے خواجہ آصف کے کیس میں ہوا تھا جنہیں [illegible]
[illegible] گرفتار کر دیا گیا تھا؟ آپ نے خواجہ آصف سے [illegible]

جنرل امجد بولے کہ انہوں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی تھی کہ وہ اس طرح کا [illegible]
[illegible] کسی کو گرفتار کرنے سے پہلے نیب بہت سارا ہوم ورک کرتا تھا۔ جبکہ انہوں نے
یہ بات تسلیم کی کہ ہو سکتا ہے اس دوران ان سے کچھ غلط فیصلے بھی ہوئے ہوں۔

میں نے کہا کہ جنرل صاحب! اگر آپ کا یہ موقف مان لیا جائے کہ آپ سیاستدانوں کے
خلاف [illegible] کارروائی کر رہے تھے تو پھر مجھے پتہ ہے کہ آپ نے سابق [illegible]
گیلانی کو [illegible] الزامات پر گرفتار کیا [illegible] آڈٹ رپورٹ میں وسیم سجاد پر بھی لگے
تھے لیکن جب وسیم سجاد جنرل مشرف کے ساتھ مل گئے تو آپ نے انہیں ہاتھ تک نہیں لگایا۔

جنرل امجد نے مجھے اس کا بڑا عجیب جواب دیا اور بولے کہ خواجہ آصف اور [illegible] کے کیس
کے علاوہ انہیں کسی اور کیس کے [illegible] کا علم نہیں تھا۔

میں نے کہا کہ جنرل صاحب! [illegible] آپ کو بتایا [illegible] اس کی وجہ پوچھی کہ آپ نے

[illegible] کیا گیا تھا۔ اب نئے سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لیے نیب کے نئے چیئرمین کی
ضرورت تھی۔

جنرل امجد کو خیال تھا کہ یہ ایک پروفیشنل ادارہ تھا کیونکہ انہیں ترقی دے کر کور کمانڈر مقرر کیا گیا
تو وہ اس سے خوش تھے۔ نیب کے چیئرمین کی حیثیت سے انہیں ایک بات کا فائدہ تھا کہ ان پر کسی
طرف سے کوئی دباؤ نہیں تھا۔

میں نے کہا کہ اگر جنرل مشرف آپ کی کارکردگی سے مطمئن تھے تو پھر انہوں نے ایک دن یہ
کیوں سوچا کہ اب جنرل امجد کی جگہ نیب میں کسی نئے چیئرمین کی ضرورت تھی۔

جنرل امجد بولے کہ وہ اس بارے میں کوئی تبصرہ نہیں کر سکتے کہ انہیں ہٹانے کا فیصلہ کیوں کیا گیا
تھا۔ انہوں نے اس بات کی بھی تصدیق کی کہ انہیں ہٹانے سے پہلے ان سے کوئی مشورہ نہیں کیا گیا اور
ان سے کہا گیا کہ وہ کسی نئے عہدے میں کام جاری رکھیں۔

جنرل امجد نے ایک نئی بات کا انکشاف کیا کہ جب 2001 میں انہیں نیب سے ہٹایا جا رہا تھا تو
اس وقت وہ بہت سارے آرمی افسروں کے خلاف مختلف الزامات پر تحقیقات کر رہے تھے۔

میں نے کہا کہ جنرل صاحب! کیا آپ ان آرمی افسروں کے نام بتانا پسند کریں گے [illegible]
[illegible] مشکل تھا۔ جب میں نے انہیں [illegible] کہا کہ جب [illegible]
کے خلاف کرپشن کیسز پر کام کر رہے تھے تو اس وقت انہیں نیب سے ہٹا دیا گیا تھا۔

میں نے کہا کہ جنرل صاحب! چودھری [illegible] اور دوسرے [illegible]
سیاستدانوں کے خلاف نیب اس طرح پہلے سے کیسوں پر کام نہیں کر رہا تھا جیسے [illegible]
سیاستدانوں کے ساتھ پر کام جاری تھا۔

جنرل امجد نے کہا کہ ان [illegible] بہت سارے سیاستدانوں کے خلاف تحقیقات کر رہا
تھا اگر ان لوگوں کے خلاف تحقیقات کے دوران الزامات ثابت نہیں ہوئے ہوں گے تو شاید انہیں
گرفتار نہ کیا گیا ہوگا۔ ایک بات تو طے تھی کہ میرے جانے کے بعد وہ کرپشن کے [illegible]
بند کیے گئے ہوں گے۔

میں نے کہا کہ جنرل صاحب! آپ ابھی بھی پاکستانی تاریخ کے اس اہم باب کے بارے میں

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels.blogspot.com!!

[illegible]

تاہم وہ کسی صورت بھی ان چھ جب آرمی آفیسروں کے نام بتانے کو تیار نہیں تھے جن کے خلاف وہ تحقیقات کر رہے تھے۔

جنرل امجد سے ملنے کے بعد ایک بات کا مجھے ضرور احساس ہوا کہ فوجی ہمارے جیسے سویلینز کو اسی وقت ڈرانے میں کامیاب ہوتے ہیں جب انہوں نے وردی پہنی ہوئی ہو یا پھر کرپشن کے نام پر انہوں نے ملک پر مارشل لاء لگایا ہوا ہو۔ جب ان پر خود کرپشن کا الزام لگے تو پھر میرے جیسے ایک عام صحافی کو اپنا دوست ڈکلیئر کر کے اس سے مشورے مانگنے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔

جنرل امجد کے چہرے پر شوگر مل سکینڈل کی پھیلی ہوئی وحشت کے بارے میں سوچتا ہوا میں ان کے دفتر سے باہر نکل آیا کہ کیا یہ وہی جنرل تھا جو کسی زمانے میں پاکستانی سیاستدانوں، بیوروکریسی، بزنس مین اور دیگر لوگوں کے لیے ایک دہشت بنا ہوا تھا۔

میر ظفر اللہ خان جمالی

[illegible] دوسرے بہتر صحافی دوست عامر الیاس رانا جمالی صاحب کے بڑے قریب تھے۔ ان دونوں نے میری بڑی ہمت افزائی کی کہ مجھے جمالی صاحب سے ملنا چاہیے۔

جب میں ان سے ملنے کے لیے ان کے سوٹ میں پہنچا تو بمشکل ایک دو لوگ وہاں بیٹھے تھے۔ جمالی صاحب اپنے ٹیلی فون خود اٹینڈ کر رہے تھے۔ وہ تین افراد جمالی صاحب کو یہ احساس دلانے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ ابھی بھی اس ملک کے وزیر اعظم ہیں۔ یہ سب کچھ ایک ڈراؤنے خواب کی طرح تھا جو ان کی آنکھ کھل جانے کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گا اور پھر وہی پرانی شان و شوکت، سکیورٹی، پروٹوکول کی لمبی لمبی گاڑیاں، ہوٹر کی آوازیں، ایم این ایز کی لمبی قطاریں، واہ واہ کا شور، بھاگتے صحافیوں کے پوچھے ہوئے سوالات، ٹی وی کیمروں کا رش سب کچھ لوٹ آئے گا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

!!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

جمالی صاحب کے چہرے پر پھیلی ہوئی اداسی اور مایوسی ایک واضح پیغام دے رہی تھی کہ ملک کے سردار کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ ان کے ساتھ دھوکہ ہوا تھا۔ استعفیٰ دینے سے صرف ایک دن پہلے ہی انہوں نے ہمارے صحافی دوست ابصار عالم کو یہ انٹرویو دیا تھا کہ وہ کہیں نہیں جا رہے تھے اور نہ ہی ان سے کسی نے استعفیٰ مانگا تھا۔ شاید انہیں اس چیز کا احساس اور دکھ زیادہ تھا کہ کسی نے ان کے ساتھ دھوکہ کیا تھا۔ جب پوری دنیا میں ان کے استعفیٰ کی خبریں گردش کر رہی تھیں تو طاقت کے ایوانوں میں بیٹھے ہوئے لوگ انہیں یہ یقین دلا رہے تھے کہ یہ سب جھوٹ تھا۔ وہ ہی وزیراعظم رہیں گے۔ ایک طرف ایک نیا وزیراعظم ڈھونڈا جا رہا تھا تو دوسری طرف انہیں یہ یقین دہانیاں کرائی جا رہی تھیں کہ وہ تسلی رکھیں۔ جمالی صاحب کے کمرے میں ایک سوگ کی سی کیفیت واضح طور پر محسوس کی جا سکتی تھی۔ میں بھی پہلے سے بیٹھے ہوئے سوگواروں کی قطار میں بیٹھ گیا۔ سلام دعا کے بعد جمالی صاحب نے اسلام آباد کے ایک اردو اخبار کے مشہور صحافی کا نام لیا اور کہا کہ شکر کریں ان کی وجہ سے میری ملاقات ہو رہی تھی۔ ان کا پروگرام تو بلوچستان جانے کا تھا لیکن اس صحافی دوست نے اصرار کیا کہ آج شام ان کے گھر پر کھانے کی دعوت کھا کر ہی وہ بلوچستان جائیں۔ وہ صحافی دوست کے اصرار کے سامنے انکار نہیں کر سکے اور یوں آج شام انہوں نے اس کے گھر پر کھانا کھانے جانا تھا۔ جونہی میں نے جمالی صاحب سے رسمی سوال و جواب کرنے شروع کیے تو انہوں نے اپنے ٹیلی فون آپریٹر کو کہا کہ اب کسی کو اندر کال نہیں ملانی۔ ہماری بات چیت کو چند لمحے ہی گزرے تھے کہ ان کے انٹرکام کی بیل بجی۔ جمالی صاحب نے غصے سے فون اٹھا کر آپریٹر کو کہا کہ میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ اندر فون نہیں دینا۔ ایک لمحہ آپریٹر کی بات سن کر چپ رہے۔ ریسیور کو پکڑ لیا۔ دوسری طرف سے کسی سے مختصری بات کی۔ ان کے چہرے کا رنگ یکدم فق ہو گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ کسی نے کوئی ایسی بات کہہ دی تھی جس کی وہ توقع نہیں کر رہے تھے۔

میں نے یہ سمجھا کہ شاید یہ فون انہیں کسی سیکرٹ ایجنسی کی طرف سے آیا تھا جنہوں نے مجھے انٹرویو دینے سے روکنے کی کوشش کی تھی کہ جمالی صاحب شاید کہیں ضرورت سے زیادہ ہی انکشافات نہ کر دیں۔

میں چپ رہا اور کوئی بات نہیں پوچھی۔

جمالی صاحب تھوڑی دیر اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے رہے۔ مجھے کچھ نہیں آ رہی تھی کہ ٹیلی فون کرنے والا کون تھا اور اس نے ایسی کونسی بات کہہ دی تھی کہ جس سے جمالی صاحب یکدم بے چین اور مزید افسردہ ہو گئے تھے۔ آخر ان سے رہا نہ گیا اور بول پڑے کہ یہ میرے اسی صحافی دوست کا فون ہے جس نے آج اپنے گھر پر میرے کھانے کی دعوت رکھی ہوئی تھی۔ وہ یہ کہہ رہا تھا کہ آج اسے کوئی ضروری کام تھا لہٰذا یہ دعوت کینسل۔ جب جمالی صاحب پھر کبھی بلوچستان سے واپس اسلام آباد آئیں گے تو وہ دوبارہ انہیں گھر کھانے پر بلائے گا۔

جمالی صاحب کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور دوسرا جا رہا تھا۔ وہ محض اپنے اس صحافی دوست کے اصرار پر دو دن سے بلوچستان ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے اور اب وہی دوست انہیں یہ کہہ رہا تھا کہ اسے کوئی اور ضروری کام پڑ گیا ہے۔

اتنی دیر میں فون کی بیل دوبارہ بجی۔ جمالی صاحب نے غصے سے ریسیو کیا اور صرف اتنا کہا کہ میں ان سے بات نہیں کرنا چاہتا۔ پتہ چلا کہ یہ وہی صحافی دوست تھے جنہوں نے جمالی صاحب کو دوبارہ فون کیا تھا۔

جمالی صاحب کو شاید پہلا دھچکا اس وقت لگا ہو گا جب جنرل مشرف کا انہیں یہ پیغام ملا ہو گا کہ وہ استعفیٰ دے دیں اور اب انہیں اپنے صحافی دوست کی کال ریسیو کر کے کہ اس نے رات کا کھانا کینسل کر دیا تھا دوسرا بڑا دھچکا لگا تھا۔ انہیں شاید پہلی دفعہ یہ احساس ہوا کہ اب وہ اس ملک کے وزیراعظم نہیں رہے جبھی تو وہی صحافی دوست جو گھنٹوں پرائم منسٹر ہاؤس کے ارد گرد ہی منڈلاتے پھرتے تھے کہ کب جمالی صاحب ملنے کے لیے بلا لیں، اب انہیں اپنے گھر پر کھانا کھلانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس صحافی دوست کا پیغام جمالی صاحب کے لیے واضح تھا کہ اب وہ وزیراعظم نہیں رہے لہٰذا ایک روایتی صحافی سے ایک روایتی سلوک کی توقع رکھیں۔

جمالی صاحب کے ساتھ وہ گھنٹے بلوچستان ہاؤس میں گزارنے کے بعد میں سیدھا گھر آیا [illegible] پاکستان مسلم لیگ نواز کے لیڈر ظفر علی شاہ کے بیٹے کے [illegible] ملاقات [illegible] وہی صحافی تھے جنہوں نے [illegible] ظفر اللہ جمالی [illegible] میں نے ان سے پوچھا کہ جناب آپ [illegible]

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

صاحب کو کھانے پر بلایا ہوا تھا۔

اس صحافی نے جمالی صاحب اور ان کی بیگم کو اس گھر میں جس نے انہیں کہا تھا کہ کھانے پر گھر آ جائیں تو
پھر مجھے خیال آیا کہ ظفر اللہ جمالی صاحب کے بیٹے کی وجہ سے تھا اب انہوں نے پیغام بھیج دیا کہ جناب
کسی دوسرے دن آ جائیں تو آپ کو کھانا کھلا دیں گے۔ ابھی میں ادھر مصروف ہوں۔

مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ بات شاید جمالی صاحب کو لگ گئی ہو گی۔ کیا ہم صحافی واقعی اتنے خود غرض
ہو جاتے ہیں کہ ایک دن پہلے تک اسی وزیر اعظم سے ملنے کے لیے ہم گھنٹوں انتظار کرتے تھے اور آج
اسے ایوان سے [illegible] کے کام پر بلایا ہوا تھا اور اب ضروری کام مجھے [illegible]
[illegible] کر دیا تھا۔

میں نے بہت دنوں بعد ظفر اللہ جمالی کو یہ واقعہ سنایا تو وہ خود بتانے لگے کہ ان اور ان کے ساتھ
کیے گئے کہ پہلے وہ بار سے صحافی دوست مجھے بتاتے ہیں کوئی بڑی بات تھی۔ وہ جمالی صاحب کو کھانا
کھلانے کے بعد رات کو بارہ ایک بجے تک میرے گھر پر بیٹھے رہتے تو بھی میرے لیے کوئی اچھا
مسئلہ نہیں تھا۔

میں اسلام آباد جولائی 1998ء میں آیا تھا اور سنا تھا کہ اس شہر کے حکمرانوں، صحافیوں، بیورو
کریٹس اور سیاستدانوں پر کبھی بھروسہ نہ کرنا کیونکہ یہ وقت اور طاقت کے ساتھ بدل جاتے ہیں۔ میں
نے کبھی اس بات پر یقین نہیں کیا تھا لیکن آج چھ سال بعد میں مجبور ہو گیا کہ اس بات پر ایمان لے آؤں
کہ واقعی اسلام آباد میں وفاداریاں اور دوستیاں ایک لمحے میں ختم اور ٹوٹتی ہیں۔ جب تک کسی کی
ضرورت رہتی ہے تو ہم اس کے نخرے اٹھاتے ہیں اور جس لمحے یہ احساس ہو گیا کہ وہ بندہ اب ہمارے
کسی کام کا نہیں رہا تو ہم آنکھیں ماتھے پر رکھنے میں ایک سیکنڈ بھی نہیں لگاتے۔

○○○

میرے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے جمالی صاحب کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر ان سے کون سی ایسی خطا
ہو گئی تھی کیونکہ وہ تو اپنی حدود میں رہ کر اپنا کام کر رہے تھے۔ جب سے وہ وزیر اعظم بنے تھے تو وہ وہی
کچھ کر رہے تھے جو انہیں بتایا گیا تھا۔ پھر ان سے استعفیٰ کیوں لیا گیا؟ انہوں نے تو کبھی بھی اپنی اوقات

سے باہر جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جمالی صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ میں تو جنرل مشرف اور
چوہدری برادران کے کہنے پر ہی سب کچھ کر رہا تھا۔ اب ان سے کیا غلطی ہو گئی ہے۔

میں جمالی صاحب کے اس سوال سے اندازہ لگا رہا تھا کہ وہ یہ جاننے کا خواہاں تھا کہ انہیں وزیر اعظم
ہٹانے کا فیصلہ کس نے کیوں اور کب کیا تھا۔

جمالی صاحب روز اول سے پریشان تھے کہ ان کے بعد چوہدری برادران، پرویز الٰہی اور شوکت
عزیز اور پیچھے ان سے تو لوگ ان سے ملنے کے لیے آتے تھے اور انہوں نے آ کر انہیں یہ بتایا
تھی کہ جنرل مشرف نے انہیں وزیر اعظم ہٹانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ چوہدری برادران نے انہیں بتایا کہ
جنرل مشرف انہیں اس لیے وزیر اعظم رہنا ہے [illegible]
کہ لے [illegible] ہو گیا ہے اور شوکت عزیز ان کے کام آ گئے ہیں۔ جمالی صاحب نے چوہدری برادران
کیا کہ آخر [illegible] کہ وہ خود وزیر اعظم بن جائیں لیکن فیصلہ ہو چکا تھا کہ وزیر اعظم کو ہٹانا ہے اور
جمالی چونکہ پاکستان مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل کے طور پر [illegible] سے پہلے تھے اس لیے انہیں
وزیر اعظم بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔

میں نے کہا کہ جمالی صاحب کیا یہ ممکن تھا کہ چوہدری برادران آپ کو اس لیے وزیر اعظم بنانا
چاہتے تھے کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ پنجاب سے فاروق لغاری، ہمایوں اختر اور خورشید قصوری میں سے
کسی ایک کو وزیر اعظم بنایا جائے۔ پنجاب میں چوہدری پرویز الٰہی کے وزیر اعلیٰ بننے کے بعد اگر اسی
صوبے سے کسی اور کو وزیر اعظم لایا جاتا تو شاید چوہدریوں کی طاقت متاثر ہوتی اور ان کو انجیکشن لگتی۔ ایک
طرف پنجاب میں طاقت کے دو مراکز بن جاتے تو دوسری طرف پروٹوکول کے تحت پرویز الٰہی کو ہر وقت
چار ان میں سے کسی ایک کو ایئر پورٹ ریسیو اور الوداع کرنا پڑتا۔

میرا یہ لمبا سوال سن کر جمالی صاحب چپ رہے اور انہوں نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔

میں نے بھی ہمت نہیں ہاری اور اسی سانس میں ایک اور سوال پوچھ ڈالا کہ جمالی صاحب کیا
کل چوہدری صاحبان نے انہیں اپنے سیاسی مقاصد کے لیے وقتی طور پر تو استعمال نہیں کیا ہے اور اب
اب ان کی ضرورت ختم ہو گئی تھی اور دور دور تک ہمایوں اختر، فاروق لغاری یا خورشید قصوری کے وزیر اعظم
بننے کے امکانات نہیں تھے تو انہوں نے دودھ میں سے مکھی کی طرح انہیں نکال کر باہر پھینک دیا تھا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

!!all!!urdupdf!!novels!!blogspot!!com!!

www.freepdfpost.blogspot.com

!!a!!!!urdupdf!!novels!!!blogspot!!!com!!

تاہم جمالی صاحب کو اس بات کا احساس تھا کہ ان کے ایک اتحادی کو ان کے خلاف
استعمال کیا گیا تھا۔ وہ آج بھی جنرل مشرف کو اچھا سمجھتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ
میں جمالی کی یہ بات ماننے پر تیار ہوں کہ آج بھی اپنی پارٹی کے سربراہ انہیں کو تسلیم
کرتے ہیں اور اگر انہوں نے جنرل مشرف کو پاس کیا ہوتا تو شاید اس میں کوئی بڑی بات ہو گی۔

میں نے کہا کہ جمالی صاحب! اب جب آپ وزیر اعظم نہیں رہے تو آپ کیا محسوس کرتے
ہیں۔ وہ بولے کہ ان کے پاس باتیں کرنے کو تو بہت تھیں لیکن یہ موقع مناسب نہیں تھا۔ ایک ان سب
لوگوں کو وزیر اعظم ہاؤس سے چلے جانا ہوتا ہے اور وہاں بیٹھے ہوئے شخص کو اس بات کے لیے تیار رہنا
چاہیے۔

میں نے محسوس کیا کہ جمالی صاحب ابھی بھی ایک صدمے کی حالت میں تھے اور اپنی زندگی کے
ان سب سے اچھے ڈیڑھ سال کے بارے میں جو انہوں نے وزیر اعظم ہاؤس میں گزارے تھے کوئی بات
کرنے کو تیار نہیں تھے۔

میں نے کہا کہ جمالی صاحب! آپ نے استعفیٰ دینے سے قبل ایک رات پہلے اپنے ایک پی
ٹی وی انٹرویو میں یہ کہا تھا کہ آپ استعفیٰ نہیں دیں گے۔ وہ بولے کہ میں آپ کو بڑی سنجیدگی سے بتا رہا
ہوں کہ انہیں واقعی یہ پتہ نہیں تھا کہ اگلی صبح ان سے استعفیٰ لے لیا جائے گا۔ انہوں نے جو کچھ بھی کہا تھا وہ
سچ تھا کہ اس وقت تک ان سے کسی نے استعفیٰ دینے کی بات نہیں کی تھی۔ انہیں 26 جون 2004ء کو
ایوان صدر بلایا گیا۔ وہاں جانے سے قبل انہوں نے قرآن پاک پڑھا اور خدا سے دعا کی کہ وہ انہیں صحیح
فیصلہ کرنے کی ہمت عطا کرے۔ انہیں سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ کسی طرح ملک کا جو سیاسی
نظام چل رہا ہے اسے کوئی نقصان نہیں ہونا چاہیے۔ وہ اپنے استعفیٰ کو ذاتی انا کا مسئلہ نہیں بنانا چاہتے
تھے کیونکہ ماضی میں بھی بہت سارے وزرائے اعظم کو اس دور کے صدور ڈس مس کرتے رہے تھے تو سب
وزرائے اعظم گھروں میں گئے جہاں بڑی بڑی کوئی انکوائریاں ہوئی گئیں لیکن نتیجہ کچھ حاصل نہیں ہوا۔

جمالی صاحب بولتے رہے کہ انہوں نے اپنے سیاسی کیریئر میں اب تک چار پانچ حکومتوں کو
اقتدار میں آتے اور جاتے دیکھا تھا اور انہیں اس بات کا احساس تھا کہ اب کی دفعہ اگر ایک اور سیاسی
حکومت ان کے کسی فیصلے یا ضد کی وجہ سے ڈس مس ہو گئی تو شاید اس سے کسی کا بھی بھلا نہ ہوگا۔

میں نے کہا کہ جمالی صاحب! آپ کیا کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے کسی مرحلے پر اپنی اسمبلیاں
ختم کرنے کو سوچا ہو۔

جمالی صاحب نے ایک ہی سیکنڈ میں جواب دیا کہ جب اس طرح کی کوئی صورتحال پیدا
ہوتی ہے تو چیف ایگزیکٹو یا وزیر اعظم کے پاس کئی آپشنز آ جاتے ہیں۔ ان کے پاس اختیارات تھے لیکن وہ ہرگز نہیں
چاہتے تھے کہ اس پارلیمنٹ کو ختم کریں جس کی عمر ابھی ڈیڑھ سال بھی نہیں ہوئی تھی۔ اسی پارلیمنٹ نے
انہیں وزیر اعظم بنایا تھا۔ سب ایم این ایز کو ایک دفعہ پھر سے الیکشن لڑنا پڑتا۔ انہوں نے پارلیمنٹ کو
بچانے کا فیصلہ کیا کیونکہ پارلیمنٹ کے جانے کا مطلب ہوتا کہ وہ سارا نقصان اٹھانا پڑ جاتا ہے۔
کہانی کی یہ تھی کہ ایک ایک کر کے آٹھ لوگ علیحدہ شروع ہو گئی تھیں جو انتہا میں منتقل کر دی گئی
تھیں۔

میں نے کہا کہ جمالی صاحب! آپ کے اور چوہدری پرویز الٰہی کے تعلقات کب اور کیوں خراب
ہونا شروع ہوئے تو وہ بولے کہ دراصل وہ فیصل صالح حیات کی دعوت پر شاہ جیونہ جھنگ عرس کی
تقریبات میں شرکت کرنے چلے گئے تھے۔ یہ گستاخی چوہدری پرویز الٰہی کو بہت بری لگی۔ پہلے وہ بات
تھی کہ چوہدری پرویز الٰہی یہ بات نہیں سمجھے کہ ایک وزیر اعظم ہونے کے ناطے وہ کیسے اپنے وزرا
یا اتحادی اس طرح کی درخواست کو نظر انداز کرتے۔

جمالی صاحب نے کہا کہ اب انہیں ایسا لگتا ہے کہ چوہدری پرویز الٰہی اور گجرات والے اس بات پر
سے ناراض ہو گئے تھے کہ وہ فیصل صالح حیات کے گھر کیوں گئے تھے۔

میں نے کہا کہ جمالی صاحب! کیا آپ کو کبھی کسی مرحلے پر یہ احساس ہوا تھا کہ شوکت عزیز ان
کی جگہ وزیر اعظم بن جائیں گے۔ وہ بولے کہ انہیں شوکت عزیز کے وزیر اعظم بننے کا علم نہیں تھا لیکن
اس فیصلے سے انہیں خوشی ضرور ہوئی تھی۔

جمالی صاحب بولتے رہے کہ ان کی پارٹی ان کی کارکردگی سے خوش نہیں تھی۔ چوہدری شجاعت
نے انہیں یہ بات بتائی کہ چونکہ پارٹی ان سے خوش نہیں تھی لہٰذا انہیں اب وزیر اعظم ہاؤس سے جانا
چاہیے۔ جب ایک دفعہ پارٹی نے فیصلہ کر لیا تھا تو پھر جمالی صاحب کے پاس وزیر اعظم ہاؤس میں رہنے
کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔ تاہم انہیں اس بات کا احساس ضرور تھا کہ اگر اس مشکل وقت میں چوہدری

www.freepdfpost.blogspot.com

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels.blogspot.com!!

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

میں نے بات بدلی اور جمالی صاحب سے پوچھا کہ ان کے بارے میں یہ باتیں ہو رہی ہیں کہ
اپنے آخری دنوں میں انہوں نے ایوان صدر کے خلاف کچھ لوگوں کو خوش کرنے کے لیے اپنا ایک
بیان دیا۔ جمالی صاحب نے جو جواب دیا وہ بڑا دلچسپ تھا۔ انہیں کی
چاہیے تھے کہ ان پر آسانی سے وار کیا جا سکے اور وہ اپنے دوستوں کو اس سے آپ سے
دور کر رہے تھے۔ مستقبل میں انہیں ہٹانے کے بعد کوئی مسئلہ پیدا نہ ہو اور ان کے
مطمئن رہیں۔

میں نے بڑی عجیب سی بات محسوس کی کہ اتنی ساری بے عزتی، بے آبروئی اور بے توقیری کے باوجود بھی جمالی صاحب اس بات پر بڑا فخر محسوس کر رہے تھے کہ ان کے استعفیٰ دینے کے بعد صدر مشرف نے انہیں جمالی کے ساتھ ایوان صدر میں کھانا دیا تھا۔ جمالی صاحب نے اپنی آواز میں کچھ فخریہ جذبہ پیش کی کہ وہ پاکستانی تاریخ کے شاید پہلے وزیراعظم تھے جنہیں بڑی عزت و تکریم سے وزیراعظم ہاؤس سے رخصت کیا گیا تھا ورنہ ماضی میں تو بھٹو سے لے کر جونیجو، بینظیر بھٹو اور نواز شریف کو انتہائی ذلیل کر کے یہاں سے رخصت کیا گیا اور جیلوں میں ڈالا گیا۔

ایوان صدر میں بھی کھانے کی بڑی میز پر بیٹھے ہوئے جمالی نے جنرل مشرف کو بتایا کہ وہ جنرل ایوب اور ضیاء کے ادوار میں جیلوں میں بھی رہے تھے۔

جنرل مشرف کو حیران دیکھ کر جمالی نے انہیں اپنی زندگی میں حاصل کیے گئے چند تجربوں کی کہانی سنانا شروع کی۔ شاید وہ انہیں ابھی بھی جبکہ وہ وزیراعظم ہاؤس سے نکالے جا چکے تھے، متاثر کرنے کے چکر میں تھے۔

جمالی نے مشرف کو بتایا کہ ایک سیاستدان کی زندگی میں تین قسم کے دوست ہوتے ہیں۔ کالج/ یونیورسٹی، جیل اور سیاست کے دنوں کے دوست۔

جمالی کے بقول کہ ایک سیاستدان اپنی سیاسی زندگی میں بنائے گئے دوستوں پر کبھی بھی اعتماد نہیں کر سکتا۔ آپ جیل اور کالج لائف کے دوستوں پر اب بھی بھروسہ کر سکتے ہیں۔

جنرل مشرف چپ چاپ اپنے ہی ہاتھوں سے رخصت کرائے گئے ایک ایسے وزیراعظم کی باتیں سن رہے تھے جو شاید انہیں یہ پیغام دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ جنرل صاحب! اگر آج میرے سیاسی

دوستوں نے مجھے یہ مشورہ دیا ہے جس کی وجہ سے مجھے استعفیٰ دینا پڑا ہے تو اب جمہوری ادوار میں ہوں، کسی دن آپ کے کسی سیاسی دوست نے آپ کو بھی ایسا ہی کہا ہو گا۔

جمالی کی یہ بات چار سال بعد اس وقت سچ ثابت ہوئی جب چوہدری شجاعت نے الٹی طرف سے کھیلتے ہوئے پاکستان مسلم لیگ کی قیادت واپس لے کر ایک نیا اتحاد بنانے کا اعلان کر دیا۔ یکایک چوہدری شجاعت کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اب جنرل مشرف کو ان کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ جنرل مشرف کی اب مجھے یہ پتہ نہیں ہے کہ اب 2007ء کے آخری دنوں میں چوہدری شجاعت نے جنرل مشرف کے منہ پر پارٹی کی قیادت چھوڑنے سے انکار کیا تھا یا جنرل مشرف کو جمالی کی چار سال پہلے والی یہ بات یاد آ گئی تھی یا نہیں کہ سیاست میں بنائے گئے دوست کبھی بھی قابل اعتماد نہیں ہوتے۔

باتوں باتوں میں جمالی صاحب نے مجھے یہ بھی بتایا کہ جب وہ پہلی دفعہ امریکہ جانے لگے اور انہوں نے جن صحافیوں کی لسٹ تیار کی ان میں سے چار صحافیوں کے نام ایوان صدر نے کاٹ دیے۔ ان چار صحافیوں کے نام کاٹنے کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ وہ جنرل مشرف کے خلاف لکھ رہے تھے۔

جب میں یہ انٹرویو جمالی صاحب سے بلوچستان ہاؤس میں کر رہا تھا اس سے کچھ روز پہلے ہی شوکت عزیز پر اٹک میں خودکش حملہ ہوا تھا جب وہ ایم این اے کا الیکشن لڑنے کے لیے ایک انتخابی جلسے سے خطاب کرنے جا رہے تھے۔ انہیں ایم این اے اس لیے بنایا جا رہا تھا تاکہ وہ جمالی کی جگہ اس ملک کے وزیراعظم بن سکیں اور اس دوران چالیس دنوں کے لیے چوہدری شجاعت حسین کو وزیراعظم بنایا گیا تھا جن کے بارے میں اسلام آباد میں یہ مذاق مشہور تھا کہ وہ پاکستان کے پہلے وزیراعظم ہیں جو اپنی مقررہ مدت چالیس دن پوری کر کے باعزت طریقے سے گھر چلے جائیں گے۔

میں نے کہا کہ جمالی صاحب! مجھے یہ بات سمجھ نہیں آ رہی کہ شوکت عزیز پر ہی کیوں قاتلانہ حملہ کیا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی جا رہی ہے کہ وہ جنرل مشرف کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے اس لیے ان پر خودکش حملہ کیا گیا۔ میں نے کہا اگر یہی معیار ہے تو شوکت عزیز پر حملے کا پتہ چلا جمالی صاحب آپ پر اور شجاعت حسین پر بھی اسی طرح کا حملہ ہونا چاہیے تھا۔

میرا ذرا عجیب سا سوال سن کر جمالی صاحب چپ ہو گئے اور انہوں نے اس کے جواب میں مجھے شوکت عزیز پر حملے کی چند وجوہات بتائیں۔

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

پہلی بات تو یہ تھی کہ شوکت عزیز کا اپنے آپ کو اٹک سے ایم این اے منتخب کرا کر وزیر اعظم بننے کا فیصلہ غلط تھا۔ اگر شوکت عزیز کو سیٹ ہی چاہیے تھی تو جمالی صاحب کے بقول وہ اپنی سیٹ ان کے لیے خالی کر دیتے۔

دوسری وجہ انہوں نے یہ بتائی کہ میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ شوکت عزیز پر قاتلانہ حملے کا سیاسی فائدہ کس کو ہوا تھا۔ ان کے بقول یہ بہت اہم سوال تھا جس پر غور کرنے کی ضرورت تھی۔

تیسرے انہوں نے کہا کہ بالعموم یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ شوکت عزیز عالمی اداروں اور چند طاقتور ملکوں کا نمائندہ ہے لہٰذا اس لیے بھی اس پر حملہ کیا گیا۔

چوتھی وجہ یہ تھی کہ شوکت عزیز جس کا اپنا کوئی سیاسی بیک گراؤنڈ نہیں تھا، وہ ان تمام برسوں میں جنرل مشرف کے بہت قریب رہا تھا۔

پانچویں وجہ یہ تھی کہ بہت سارے پارٹی کے ایم این ایز شوکت عزیز کے وزیر اعظم بننے پر خوش نہیں تھے۔ اگرچہ وہ اس فیصلے پر خاموش رہے لیکن انہیں یہ فیصلہ پسند نہیں تھا۔

آخری بات یہ تھی کہ شوکت عزیز کو وزیر اعظم نامزد کر کے انہیں پھر الیکشن لڑانا ایک بہت بڑا خطرہ تھا کیونکہ ان کو اچانک بہت سارے خطرات کے سامنے لا کھڑا کیا گیا اور ان پر قاتلانہ حملہ اس خطرے کی ایک کڑی تھی۔ ان کے بقول جب پارٹی کسی کو پرائم منسٹر کے عہدے کے لیے نامزد کرتی ہے تو اس وقت سیاسی فضا بالکل مختلف ہوتی ہے اور پوری کی پوری پارٹی اس وزیر اعظم کے پیچھے پوری قوت سے کھڑی ہو جاتی ہے۔ شوکت عزیز کو پارٹی نے وزیر اعظم نامزد نہیں کیا تھا لہٰذا ان کے پاس پارٹی کی کوئی حمایت نہیں تھی۔

آخر میں جمالی صاحب نے کہا کہ محض چند نوجوان ایم این ایز کے علاوہ پاکستان مسلم لیگ کی ٹاپ لیڈرشپ اس وقت ان کے ساتھ نہیں تھی۔ انتخابی ریلیوں میں انہوں نے پارٹی کے کسی اہم رہنما کو وہاں نہیں دیکھا۔ جمالی کے بقول یہ بھی ممکن تھا کہ چند طاقتور قوتیں جو موجودہ جمہوری نظام کے خلاف تھیں لہٰذا انہوں نے شوکت عزیز پر حملہ کرا کر جنرل مشرف کو پیغام پہنچانے کی کوشش کی ہو۔

میں نے ایک بات نوٹ کی کہ جمالی صاحب چوہدری شجاعت پر تو بہت ناراض تھے لیکن وہ شوکت عزیز کی تعریف نہیں کرتے اور لگتا ہے پہلے جیسے مخلص نہیں رہے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ شوکت عزیز

بہت قابل آدمی ہیں اور آنے والے دنوں میں اس ملک کو بڑے اچھے طریقے سے چلائیں گے۔ تاہم انہوں نے یہ بات ضرور کہی کہ شوکت عزیز کو سیاسی طور پر بہت جلد چیلنج کا سامنا کرنا ہوگا کیونکہ وہ ان قوتوں سے بچ نہیں سکیں گے جنہوں نے ان کے خلاف سازشیں کر کے انہیں وزارت عظمیٰ کے عہدے سے ہٹایا تھا۔ جمالی صاحب کے بقول شوکت عزیز باقی تمام محاذوں پر کامیاب رہیں گے لیکن سیاسی محاذ انہیں شدید مشکلات کا شکار کر سکتا تھا۔

جمالی صاحب نے نام تو نہیں لیا لیکن ان کا واضح اشارہ چوہدری شجاعت حسین، چوہدری پرویز الٰہی اور ہمایوں اختر کی طرف تھا جنہوں نے جمالی کو سیاسی طور پر اتنا تنہا اور کمزور کر دیا تھا کہ جب ان پر وار کیا گیا تو جمالی صاحب گھنٹوں میں مستعفی ہو کر گھر چلے گئے۔

تاہم بعد کے واقعات نے یہ ثابت کیا کہ شوکت عزیز جنہیں سیاست کا کوئی تجربہ نہیں تھا، جمالی صاحب جیسے پچاس برس سے زیادہ سیاست کرنے کے باوجود پاکستان مسلم لیگ سے بہتر سیاستدان ثابت ہوئے اور انہوں نے 15 نومبر 2007 تک جب انہوں نے وزارت عظمیٰ چھوڑی تو چوہدری شجاعت، ہمایوں اختر، پرویز الٰہی اور دیگر کو اپنے خلاف ایک بھی سازش نہیں کرنے دی اور بڑے مزے سے اپنا وقت پورا کیا۔ شوکت عزیز نے یہ ثابت کیا کہ وہ جمالی صاحب سے بڑا کھلاڑی سیاستدان تھے اور انہیں پتہ تھا کہ پنجاب کے ان تین لیڈروں شجاعت، پرویز الٰہی اور ہمایوں اختر سے کیسے نمٹنا تھا۔

ان دنوں جمالی صاحب کے بیٹے فرید جمالی کے خلاف کرپشن کی بہت کہانیاں چھپ رہی تھیں۔ جب میں نے یہ بات پوچھی تو انہوں نے بڑے افسوس کا اظہار کیا کہ لوگ کتنے ظالم ہیں کہ انہوں نے ان کے اس بیمار بیٹے کو بھی نہیں بخشا جو کئی سالوں سے ایک جسمانی بیماری میں مبتلا ہے۔

جمالی صاحب کو پتہ نہیں کیا یاد آیا کہ وہ جنرل ضیاء الحق اور پی پی کے وزیروں کے ساتھ بھٹو کی پھانسی پر بات چیت کرتے تھے۔ ایک دفعہ 1988ء کی ایک کابینہ میٹنگ کے دوران انہوں نے جنرل ضیاء سے بھٹو کی پھانسی کا معاملہ ڈسکس کرنا شروع کیا۔ جمالی نے جنرل ضیاء سے یہ پوچھا وہ بتائیں کہ انہوں نے وہ رات کیسے گزاری تھی جس رات ان کے حکم پر بھٹو کو صبح کے وقت پھانسی دی جانی تھی۔

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

...جتوئی صاحب کو پتہ نہیں کیا خیال آیا اور وہ مجھے بتانے لگے کہ ایک لحاظ سے وہ بھی آ گیا تھا کہ
جنرل ضیاء نے انہیں وزیراعظم بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور ان کے ساتھ وعدہ بھی کر لیا تھا۔ تاہم بعد
میں جنرل ضیاء کا اس بارے میں ذہن تبدیل ہو گیا اور انہیں اس بات کا علم نہیں تھا کہ جنرل ضیاء نے
اپنا فیصلہ کس کے کہنے پر تبدیل کیا تھا۔ اپنا فیصلہ تبدیل کرنے کے بعد جنرل ضیاء، جتوئی صاحب سے
ملے اور انہیں بتایا کہ اگرچہ انہوں نے انہیں وزیراعظم بنانے کا فیصلہ کیا تھا تاہم اب وہ محمد خان جونیجو
کو وزیراعظم بنا رہے ہیں۔

نواز شریف

میں دسمبر 2004ء میں آٹھ پاکستانی صحافی دوستوں کے ساتھ بھارتی حکومت کی دعوت پر بھارت
کے بڑے شہروں میں گھوم پھر کر ابھی آیا ہی تھا کہ [illegible]

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

سال حج بھی کرا دیا تھا۔

میں بڑا حیران ہوا کہ ان بڑے خدا کے گھر سے مجھ جیسے گنہگار کے لیے ایک بلاوا آ گیا تھا۔ جہاں خدا کے گھر حاضری دینے کی خوشی تھی وہاں میرے ذہن میں یہ بات بھی بیٹھی تھی کہ میاں نواز شریف سے ملاقات کا موقع ملا تو اپنے اخبار کے لیے ان کا انٹرویو ضرور کروں گا۔ میں نے مسلم لیگ نواز کے لیڈر خواجہ محمد آصف سے درخواست کی کہ وہ میاں نواز شریف صاحب کو فون کر دیں کہ اس طرح ان سے ملنے اور بات کرنے میں آسانی رہے گی۔ خواجہ آصف نے شہباز شریف کو میرے بارے میں بتایا تو انہوں نے کہا کہ رؤف جب جدہ آئے تو ان سے رابطہ کرے۔

میں اور ایکسپریس کے چیف رپورٹر محسن گورایہ اسلام آباد ایئرپورٹ سے جدہ کے لیے روانہ ہوئے۔ مجھے اس بات کا اعتراف کرنے دیں کہ اگر محسن گورایہ میرے ساتھ نہ ہوتے تو شاید میں اچھے طریقے سے حج اور اس کے فرائض ادا نہ کر سکتا۔ محسن گورایہ نے مجھ سے زیادہ حج کی تیاری کی ہوئی تھی اور ان کی تیاری میرے بڑے کام آئی۔ اگر میرا حج خدا کے حضور قبول ہوا تھا تو اس میں بلاشبہ محسن گورایہ کا بڑا ہاتھ تھا۔ محسن گورایہ اور میں نے اپنے ہوٹل کے قریب واقع خوبصورت ساحل پر شام کو دو دو گھنٹوں تک جو واک کی تھی وہ شاید برسوں تک ذہن سے نہ اترے۔

میں نے ایک دن جدہ میں سرور پیلس فون کیا۔ آپریٹر کو بتایا کہ میں نے شہباز شریف سے بات کرنی ہے۔ اس نے مجھ سے میرا نمبر لیا اور بتایا کہ وہ بعد میں مجھ سے بات کریں گے۔ اگلے دن میں نے فون کیا تو پھر شہباز شریف سے بات ہو گئی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ خواجہ آصف نے انہیں پہلے ہی میرے بارے میں فون کر دیا تھا۔ وہ کہنے لگے کہ آپ کل شام کو سرور پیلس آ جائیں وہیں گپ شپ ہو جائے گی۔ اگلے دن شہباز شریف نے شام کے وقت گاڑی بھیج دی۔ جب میں وہاں پہنچا تو ایک عجیب جذباتی سا ماحول بنا ہوا تھا۔ پتہ چلا کہ شہباز شریف کو سعودی عرب سے امریکہ جانے کی اجازت مل گئی ہے جہاں انہوں نے اپنا میڈیکل چیک اپ کرانا ہے۔ یہ میرے لیے ایک بہت بڑی خبر تھی۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں یہ خبر اپنے اخبار کو کس وقت اور کیسے بھیجوں۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ ان ہی دنوں چوہدری نثار علی خان بھی اپنی فیملی کے ساتھ وہاں حج کرنے کے لیے آئے ہوئے تھے اور وہ روزانہ میاں صاحب سے ملنے سرور پیلس جاتے۔ انہوں نے مجھے وہاں

دیکھا تو بڑے خوش ہوئے۔ میاں صاحب سے میرا دوبارہ تعارف کروایا۔ چوہدری صاحب کی بڑی مہربانی کہ انہوں نے میرے بارے میں اتنے اچھے الفاظ استعمال کیے کہ میں آج جب پانچ سال بعد چاہوں بھی تو وہ سب کچھ میرے ذہن میں ہے۔ میاں صاحب ایک بہت بڑے ہال میں بیٹھے ہوئے تھے اور مسلسل قرآن پاک کی تلاوت ہو رہی تھی۔ ان کے ارد گرد بہت سارے لوگ جمع تھے جن میں پاکستان سے آنے والے بھی شامل تھے۔ ایک صاحب کے ذمے یہ تھا کہ پاکستانی اخبارات میں چھپنے والے کالم اور خبریں اونچی آواز میں وہاں موجود سب لوگوں بشمول میاں صاحب کو سنائیں۔ جب وہ خبر یا کالم سنا چکا ہوتا تو اس پر بحث و مباحثہ شروع ہوتا۔ میاں صاحب سنجیدگی سے سنتے اور پھر کوئی چٹکلہ یا جملہ کہتے۔ اتنی دیر میں نماز کا وقت ہوا۔ سب لوگ نماز کے لیے کھڑے ہوئے۔ چوہدری نثار علی خان کی کمر میں تکلیف تھی وہ جھک نہیں سکتے تھے لہٰذا ان کے لیے کرسی لائی گئی۔ میاں نواز شریف صاحب اگلی صف میں کھڑے تھے اور میں ان کے پیچھے والی صف میں کھڑا تھا۔ ان کے ساتھ والی جگہ پر ور بھی کھڑا تھا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ کسی نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اگلی صف میں کھینچ لیا۔ یہ میاں نواز شریف صاحب تھے جنہوں نے مجھے اپنے دائیں طرف کھڑا کر دیا۔ نماز کے بعد گفتگو جاری رہی۔ اتنی دیر میں شہباز شریف کے جانے کا وقت آ گیا تھا۔ وہ ایک ایک سے گلے مل رہے تھے۔ جب شہباز شریف اپنے بڑے بھائی نواز شریف سے ملے تو ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ یہ منظر ایک صحافی کے لیے بھی ایک بڑا تکلیف دہ منظر تھا۔ شہباز شریف میرے قریب آئے اور کہنے لگے چلیں آپ بھی ایئرپورٹ تک میرے ساتھ چلیں گپ شپ کرتے۔

[illegible]

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

اتنی دیر میں میز پر کھانا لگ چکا تھا۔ میاں صاحب کی یہ کوشش تھی کہ ہر مہمان کی پلیٹ میں پہلے کھانا ڈال دیا جائے۔ اتنی دیر میں کسی نے آ کر میاں صاحب کو بتایا کہ امریکہ سے ڈاکٹر شاہد مسعود ان سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔ میاں صاحب نے کھانے کی ٹیبل پر ان سے بات کی اور بار بار وہ میری طرف دیکھا۔ میں بڑا حیران ہوا کہ وہ مجھے ایسی نظروں سے کیوں دیکھ رہے تھے۔

ڈاکٹر شاہد مسعود ان سے شہباز شریف کی امریکہ روانگی کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ یہ پاکستان میں بہت بڑی خبر تھی کہ شہباز شریف کو سعودی عرب چھوڑ کر امریکہ جانے کی اجازت مل گئی تھی۔ میاں صاحب اور وہاں موجود لوگوں کی یہ کوشش تھی کہ یہ خبر اس وقت تک آؤٹ نہ ہو جب تک شہباز شریف کا جہاز جدہ ایئرپورٹ سے اڑ نہ جائے کہ کہیں آخری مرحلے پر ہی جنرل مشرف کی حکومت کوئی مسئلہ نہ پیدا کر دے۔

میاں صاحب نے ڈاکٹر شاہد مسعود کا فون بند کرتے ہی مجھ سے پوچھا کہ رؤف صاحب! آپ نے ہی یہاں سے بیٹھے ہوئے یہ خبر ڈاکٹر شاہد مسعود کو لیک کی تھی۔

ایک لمحے کے لیے میں لرز کر رہ گیا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھے بھرے چوک میں ننگا کر دیا ہو۔ میری تو اس وقت ڈاکٹر شاہد مسعود سے جان پہچان ہی نہ تھی۔ سب سے بڑھ کر میں اس خبر کو اپنی Exclusive سمجھ رہا تھا اور میں نے سوچا ہوا تھا کہ کھانے کے بعد میاں صاحب سے اجازت لے کر یہ خبر اپنے اخبار دی نیوز کے لیے فائل کروں گا۔ بھلا میں کیونکر اتنی بڑی خبر ڈاکٹر شاہد مسعود کو دوں گا۔

میں نے اپنے آپ کو بڑی مشکل سے سنبھالا اور میاں صاحب کو بتایا کہ میں تو ڈاکٹر صاحب کو ذاتی طور پر جانتا بھی نہیں ہوں اور دوسرے ایک صحافی کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اتنی بڑی خبر اپنے نام سے سامنے لائے نہ کہ کسی اور صحافی کو کہے کہ وہ اس کو رپورٹ کرے۔

میاں صاحب نے چپ کر کے میری بات تو سن لی لیکن مجھے اندازہ ہوا کہ انہیں ابھی بھی شک تھا کہ یہ بڑی "ہوشیاری" ان کے گھر میں بیٹھ کر کسی اور نے انہیں ہی سے کی تھی۔

کھانے کے بعد میں چوہدری نثار کے پاس گیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ میاں صاحب سے میرا ایک انٹرویو کرا دیں۔ نثار نے کہا کہ وہ میاں صاحب سے بات کریں گے۔

اس سے پہلے میں میاں صاحب سے دو تین دفعہ باتوں باتوں میں یہ درخواست کر چکا تھا لیکن انہوں نے مجھے ایک بار بھی اس کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ مسلسل قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف رہتے تھے۔ ان کے چہرے پر ہر وقت سنجیدگی طاری رہتی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ جب لندن میں دو برس بعد ان سے ملاقات ہوئی تو اتنے ہشاش بشاش اور گپ شپ کرنے والے نکلے کہ میں حیران رہ گیا کہ واقعی دو سال پہلے میں انہی سے جدہ میں ملا تھا جو ہر وقت قرآن پاک ہاتھ میں لے کر چہرے پر سنجیدگی طاری کیے ہوئے ملتے تھے۔

میاں نواز شریف صاحب میرے انٹرویو کی درخواست کو ٹال گئے۔ آخر طے ہوا کہ جب میں حج کر کے جدہ واپس آؤں گا تو اس وقت اس پر دوبارہ بات کریں گے۔

اگلے ہفتے میں حج کر کے واپس آیا تو میں نے چوہدری نثار علی خان سے دوبارہ رابطہ کیا۔ انہوں نے مجھے پھر وہیں سرور پیلس بلا لیا۔ میاں صاحب کسی طرح سے بھی انٹرویو پر راضی نہیں ہو رہے تھے۔ چوہدری نثار انہیں راضی کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چوہدری نثار دراصل مجھے ممنون کر چکے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ میاں صاحب چوہدری نثار کے کہے بغیر شاید اس انٹرویو کے لیے کبھی تیار نہ ہوتے۔

بعد میں مجھے پتہ چلا کہ دراصل سعودی حکومت اور جنرل مشرف کے درمیان ہونے والی ڈیل میں یہ بات بھی طے ہوئی تھی کہ نواز شریف کسی پاکستانی اخبار کو انٹرویو نہیں دیں گے اور نہ ہی سیاست پر گفتگو کریں گے۔ میاں صاحب کا خیال تھا کہ اس کا ایک راستہ یہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ مجھے ساری باتیں بتا دیں گے جو میں ان سے پوچھوں گا لیکن میں انہیں اپنی سٹوری میں ان کا نام دیے بغیر اپنی طرف سے لکھوں گا۔ میں اس بات پر بھی تیار ہو گیا۔ تاہم ابھی بھی میاں صاحب کے ذہن میں کوئی بات کھٹک رہی تھی۔ وہ کوئی بھی رسک لینے کو تیار نہیں تھے۔ آخر بحث و مباحثے کے بعد یہ بات طے ہوئی کہ میں پاکستان واپس جا کر ان کا سارا انٹرویو لکھوں گا اور لکھ کر چوہدری نثار علی خان کو دکھاؤں گا۔ پھر چوہدری نثار میاں کی مرضی ہوگی کہ وہ اس انٹرویو میں کیا کانٹ چھانٹ کرتے ہیں اور میں اس پر کوئی اعتراض نہیں کروں گا۔

میں اس بات پر تیار ہو گیا کیونکہ میرے خیال میں نواز شریف سے ان کی کوئی خلاف اس بات

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

میں نے جنگ گروپ سے منسلک اخبار دی نیوز کے لیے ان سے انٹرویو کیا اور [illegible] کیا جو چھپ گیا تھا۔ [illegible] انہیں اس بات کا کوئی اندازہ نہیں تھا کہ [illegible] کی طرف سے کوئی جواب [illegible] نہیں ہے [illegible] ایک طرح کی وہاں لکھتے ہوئے [illegible] [illegible] [illegible] تک [illegible] پہلا [illegible] کو دیا تھا [illegible] نے بھی دیکھا [illegible] میرے پاس اس طرح کا ایک خصوصی انٹرویو ہے۔ میں صاحب نے اپنی [illegible] کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ انہوں نے مجھے کہا کہ آپ مجھے نواز شریف کا انٹرویو بھی دیں۔ میں اسے انگریزی اخبار میں چھاپوں گا اور اس کی ایک کاپی اردو [illegible] اخبار میں بھی چھاپوں گا۔ یہ وہ [illegible] تھے جنہیں اپنے دور اقتدار میں نواز شریف نے رات کو لاہور میں واقع ان کے گھر سے [illegible] کے لوگ [illegible] اٹھا لیا تھا۔ ان کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے بھارت میں ایک لیکچر دیتے ہوئے یہ کہا تھا کہ پاکستان بڑی تیزی سے ایک ناکام ریاست کا نقشہ پیش کر رہا ہے۔ یہ عجیب کہانی ہے کہ کئی برسوں بعد نواز شریف صاحب بھی یہ بات خود بڑی روانی سے اپنی تقریروں میں کرتے تھے کہ پاکستان کو ناکام ریاست بنانے میں فوجیوں اور فوجی حکومتوں کا کتنا بڑا رول ہے۔ اگرچہ میاں نواز شریف کا وہ انٹرویو فرائیڈے ٹائمز میں چھپا لیکن جگہ کی کمی کی وجہ سے اسے اچھا خاصا Edit کیا گیا تھا تاہم انگلش زبان کے خوبصورت [illegible] نے اسے اس طرح Edit کیا کہ اس میں میاں صاحب کی کئی اہم [illegible] چھپ گئیں۔

○○○

نواز شریف مجھے اور چوہدری نثار علی خان کو لے کر سرور پیلس میں واقع اپنے ایک کمرے میں چلے گئے۔ [illegible] کہ چوہدری نثار علی خان اس انٹرویو کے دوران ان کے ساتھ [illegible] نواز شریف صاحب [illegible] [illegible] چوہدری نثار علی خان کے [illegible] [illegible]

میں نے ایک بات محسوس کی کہ نواز شریف [illegible] [illegible] [illegible] ان کے [illegible] میاں صاحب [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] یہ واقعہ اتنا

سے زیادہ اہم تھا کہ جو اسودہ چھپنے سے پہلے چوہدری نثار علی خان Edit کریں گے۔ [illegible] کیونکہ میں ایک انٹرویو کر رہا تھا جو انٹرویو دینے والے شخص کو اس کے انٹرویو کا مسودہ [illegible] نہیں تھا کہ وہ اپنی کوئی بات سے مکر نہ جائے اور سارا انٹرویو ہی کالعدم کر جائے۔

میں پاکستان واپس آیا اور بڑی محنت سے بیٹھ کر میں نے 4200 الفاظ پر مشتمل میاں نواز شریف کا ایک مختلف انداز میں پروفائل لکھا۔ میری واپسی پر اسلام آباد میں فہد حسین دی نیوز کے ایڈیٹر بن چکے تھے۔ میرے اب تک اس طرح کے بیس کے قریب سیاسی پروفائل چھپ چکے تھے جنہیں بہت مقبولیت ملی تھی۔

ان پروفائلز کو چھاپنے کا سارا کریڈٹ دی نیوز کے ایڈیٹر سلیم بخاری اور جنگ گروپ کے مالک میر شکیل الرحمان کو جاتا تھا جنہوں نے جنرل مشرف کے مخالفین چوہدری نثار علی خان، اسحاق ڈار، خواجہ آصف اور سب سے بڑھ کر جنرل علی قلی خان کے وہ انٹرویو چھاپے تھے جس میں انہوں نے جنرل مشرف کو بڑے سخت الفاظ میں تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ ان دنوں جنرل مشرف ایک طاقتور آرمی ڈکٹیٹر بن چکے تھے اور اپنے آپ کو باوردی صدر بھی منتخب کرا چکے تھے۔ مجھے پتہ تھا کہ جنگ گروپ پر بہت شدید دباؤ تھا کہ جنرل مشرف کے مخالفین کے یہ انٹرویو نہ چھاپے جائیں تاہم سلیم بخاری اور میر شکیل الرحمان تمام تر دباؤ کے باوجود انہیں چھاپ رہے تھے۔

مجھے اس وقت بڑا شدید دھچکا لگا جب میر شکیل الرحمان نے نواز شریف کا پروفائل [illegible] انٹرویو چھاپنے سے انکار کر دیا۔ اس وقت تک سلیم بخاری صاحب جا چکے تھے اور مجھے یقین ہے کہ اگر وہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] پروفائل بھی چھاپنے پر رضامند کر لیتے۔ [illegible] [illegible]

میں نے وہ حتمی [illegible] [illegible] کہ میاں صاحب کا یہ انٹرویو چھپ جائے۔ ایک دن مجھے [illegible] گروپ کے ایک [illegible] نے بتایا کہ آپ ایک ایسے شخص کا انٹرویو چھاپنا [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

یہ تقاب [illegible] چھپ ہوگیا [illegible] [illegible]

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels.blogspot.com!!

کہ آج وہ جنرل مشرف سے انہوں نے اپنے دشمنوں سے اس ملک کو آزادی [illegible] سے چلا رہا تھا۔ وہ اکثر عزیز جوانوں اس وقت کو یاد کرتے تھے جب وہ وزیر اعظم تھے زندگی کی سب سے بڑی غلطی [illegible] کے کسی انتخابی عہدے پر [illegible] پاکستان کو [illegible] آج وہ اس ملک کے وزیر اعظم تھے۔

نواز شریف کی باتوں سے لگتا تھا کہ انہوں نے اپنے موجودہ حالات اور قسمت سے سمجھوتہ کر لیا تھا وہ اب صبر سے اس دن کا انتظار کر رہے تھے جس دن وہ دوبارہ پاکستان واپس جا سکیں گے۔ مجھے یوں لگا کہ اس عرصے میں نواز شریف نے خاصا وزن بڑھا لیا تھا لیکن سر کے بال اگوانے کے بعد وہ جوان سے نظر آ رہے تھے۔

میرے لیے حیرانی کی بات یہ تھی کہ نواز شریف میں اب یہ خوبی پیدا ہو چکی تھی کہ وہ میرے ہر سوال کا جواب براہ راست دینے کے بجائے اسے فلسفیانہ انداز میں دے رہے تھے۔ انہیں آخر اپنے ذاتی اور سیاسی انٹرویوز کو ایک فلسفیانہ رنگ دینا آ ہی گیا تھا۔ میں نے ایک اور بات بھی محسوس کی کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے اندر پختگی آتی جا رہی تھی اور ان چار سالوں میں انہوں نے بہت سے مشکل سبق سیکھے تھے۔ اب تو وہ اپنی ان تمام غلطیوں کا اعتراف بھی کرنے پر تیار تھے جن کی وجہ سے وہ آج اس حالت میں پہنچے تھے۔ نواز شریف کو بھی پتہ تھا کہ سیکھنے کا عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے اور وہ اپنی ان غلطیوں سے سیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

میں نے باتوں باتوں میں محسوس کیا کہ اگر یہ لوگ ان سے اس وقت بھی ملنے آتے تھے جب وہ وزیر اعظم تھے آج جب وہ جدہ میں اپنی جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے تو بھی لوگ ان سے ملنے پاکستان سے آ رہے تھے۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ ماضی کے بہت سے دوست اب جنرل مشرف کے خوف سے ان سے ملنے نہیں آتے تھے۔ تاہم انہوں نے اپنی اس نئی زندگی اور لوگوں کے بدلے رویوں سے سمجھوتہ کر لیا تھا کہ یہاں جدہ کے سرور پیلس میں رہ کر وہ اور کر بھی کیا سکتے تھے۔

نواز نے مجھے فلسفیانہ انداز میں [illegible] بتایا کہ ایک دن سب کو اقتدار سے رخصت ہونا ہے [illegible] بارہ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو وہ رخصت ہوئے۔ اس سے پہلے بے نظیر بھٹو، جنرل ضیاء اور [illegible] خان [illegible] سب سے پہلے [illegible] ایک ایک کر کے اقتدار سے رخصت ہوئے۔ جنرل پرویز مشرف بھی [illegible]

[illegible] میں [illegible] جنرل مشرف کو [illegible] لیڈر [illegible] کے حوالے سے [illegible] کی جا رہی ہے۔

بے نظیر بھٹو [illegible] شیخ [illegible] نواز شریف [illegible] کے ساتھ [illegible] کی [illegible]

نواز شریف کا یہ اشارہ [illegible] بے نظیر بھٹو اور جنرل مشرف کے درمیان ہونے والی [illegible] کی طرف تھا جب انہوں نے جنرل مشرف کو [illegible] کرنے کے لیے [illegible] بیٹھی ہیں تھے۔

جنرل مشرف کی یہ بات [illegible] پر کر نواز شریف نے [illegible] بے نظیر بھٹو [illegible] بات کی۔ اس سے پہلے جب آصف علی زرداری جیل سے رہا ہوئے تھے تو بھی انہوں نے [illegible] کے بیان کی تردید کر دی تھی۔

نواز شریف کو یہ بات سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ بے نظیر بھٹو جیسی ایک جمہوری لیڈر اس وقت جنرل مشرف کو بچانے کی کوشش کرے گی جب ان پر چاروں اطراف سے پریشر بڑھ رہا تھا۔ اب جبکہ نواز شریف اور بے نظیر بھٹو نے ان پانچ سالوں میں اتنی ساری مشکلوں کا سامنا کر لیا تھا اب بھلا جنرل مشرف کے ساتھ ڈیل کرنے کا کیا فائدہ تھا۔ نواز شریف نے کہا کہ ان پر [illegible] بے نظیر بھٹو [illegible] پارٹی اور پاکستان مسلم لیگ نواز دونوں جنرل مشرف کے ہاتھوں ابتلا [illegible] کا سامنا کر رہی تھیں اور اب یہ موقع نہیں تھا کہ وہ جنرل مشرف سے کوئی ڈیل کریں کیونکہ اب حالات و واقعات ان کی [illegible] تبدیل ہو رہے تھے کہ جنرل مشرف [illegible] سارے مسائل میں پھنسنے والے تھے۔

نواز شریف نے [illegible] سے پوچھا کہ ہم کیوں اس وقت جنرل مشرف اور ان کے ساتھیوں سے کوئی ڈیل کریں۔

نواز شریف کی اس وقت حیرانی کی حد نہ رہی جب بے نظیر بھٹو نے بھی ٹیلی فون پر ان کی اس بات سے اتفاق کیا کہ وہ ان دونوں جلاوطن لیڈروں کو جنرل مشرف سے ڈیل نہیں کرنی چاہیے۔ نواز شریف اور بے نظیر بھٹو کی اپنی گفتگو میں ایک [illegible] جنرل مشرف سے [illegible] دونوں نے اس بات سے بھی اتفاق کیا کہ [illegible] جنرل [illegible]

www.freepdfpost.blogspot.com

allurdupdfnovels.blogspot.com

اب نواز شریف کا یہ خیال تھا کہ بےنظیر بھٹو جنرل مشرف سے ڈیل نہیں کریں گی [illegible]
جب تک بےنظیر بھٹو انہیں اپنے منہ سے یہ بات نہیں کہیں گی کہ انہوں نے جنرل مشرف سے [illegible]
ڈیل ہے، وہ کسی دوسرے پر یقین نہیں کریں گے۔

نواز شریف کا یہ کہنا تھا کہ بےنظیر بھٹو انہوں نے جو [illegible] دیکھی تھیں وہ [illegible]
[illegible] کی تکلیف کے بعد حالات بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے۔ اب جو بھی لیڈر جنرل مشرف [illegible]
[illegible] کرنے کی کوشش کرے گا وہ اپنے لیے خود مصیبت کھڑی کرے گا۔

جب سے نواز شریف پاکستان سے آئے تھے کیا جنرل مشرف نے ان سے ایک بھی ڈیل کرنے
کے لیے رابطہ کیا تھا۔

اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے نواز شریف نے مجھے بتایا کہ لاہور کے ایک بڑے
اخباری گروپ کے مالک (ان کا اشارہ نوائے وقت کے مجید نظامی صاحب کی طرف تھا) جنرل مشرف
کی ایک آفر لے کر ان کے پاس آئے تھے۔ جنرل مشرف یہ چاہتے تھے کہ شہباز شریف 2002 کے
الیکشن کے بعد پاکستان آ جائیں اور پاکستان مسلم لیگ کی قیادت کریں۔ تاہم نواز شریف نے جنرل
مشرف کے ساتھ کسی بھی قسم کی ڈیل کرنے سے انکار کر دیا۔ بقول نواز شریف کے اگر وہ چاہتے تو وہ
[illegible] پاکستان آ سکتے تھے۔ اس کے لیے انہیں محض اتنا کرنا تھا کہ وہ جنرل مشرف کو [illegible]
[illegible] پاکستان کا صدر [illegible] لیکن نواز شریف پاکستانی عوام اور [illegible]
[illegible]

نواز کا خیال تھا کہ اب [illegible]
[illegible] کے دنوں سے [illegible] نواز شریف کے پاس [illegible]
[illegible]
[illegible] نہیں کرتا۔ اب میری [illegible] سیاسی [illegible]
[illegible] کرنے کی کوئی [illegible]

نواز شریف اب سب کی بات سننے کے لیے تیار تھے لیکن ان کی بات [illegible]
اپنی کھوئی ہوئی [illegible] حاصل کرنے کے لیے کسی [illegible] جنرل سے ڈیل نہیں کریں گے۔ اب ان کے لیے
ان کے سیاسی اصول اہمیت اختیار کر گئے تھے۔ اب [illegible] ہو گیا تھا۔

نواز یہ مانتے ہیں کہ وہ کوئی فرشتہ نہیں تھے۔ انہوں نے بھی ماضی میں غلطیاں کی تھیں لیکن
انہوں نے اپنی حکومت [illegible] کرنے کے بعد سب سے بڑا سبق یہ سیکھا تھا کہ پاکستان پر حکومت کرنا
اس وقت تک ممکن نہیں ہو گا جب تک جمہوریت، رول آف لاء اور آئین کا راستہ اختیار نہیں کیا جائے گا۔

نواز شریف صاحب کے منہ سے رول آف لاء کی بات سن کر مجھے [illegible]
نے اپنے آپ کو سنبھالا اور توجہ سے ان کی بات سننے لگا۔

وہ مجھے بتا رہے تھے کہ انہوں نے [illegible] سبق [illegible] میں سیکھا تھا [illegible] کہ کسی ایک
شخص کو اداروں سے [illegible] کر کے اہمیت نہیں دینی چاہیے کیونکہ صرف ادارے ہی ملک کو مضبوط کر سکتے ہیں
[illegible] لوگ۔

اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے نواز شریف نے مجھے ایک واقعہ سنایا [illegible]
[illegible]

www.freepdfpost.blogspot.com

allurdupdfnovels.blogspot.com

لیڈروں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے جب ان سب نے ایک زبان میں یہ کہا کہ 1947ء سے لے کر اب تک بھارت کی سب سے بڑی کامیابی جمہوریت تھی۔

کسی ایک بھی بھارتی وزیر اعظم نے یہ نہیں کہا کہ بھارتی اکانومی یا اس کی فوجی طاقت پچاس برسوں میں ان کی سب سے بڑی کامیابی تھی۔

نواز نے کہا کہ لانڈھی جیل کی اس کال کوٹھری میں بیٹھ کر انہوں نے اس گفتگو سے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا کہ قوموں کی تحریک میں جمہوریت سب سے اہم چیز ہوتی ہے۔ جمہوریت کے بعد ہی کسی ملک اور قوم کو دیگر کامیابیاں ملتی ہیں۔ نواز شریف نے کہا کہ جب انہوں نے سابق بھارتی وزراء اعظم کو کہتے سنا کہ ان پچاس برسوں میں جمہوریت ان کی سب سے بڑی کامیابی تھی۔ انہوں نے اچانک اپنے آپ کو شدید شرمندہ محسوس کیا کہ ہم بھارتیوں کی طرح بی بی سی پر بیٹھ کر پوری دنیا کے سامنے یہ دعویٰ نہیں کر سکتے تھے جو ان چھ سابق بھارتی وزراء اعظم نے کیا تھا۔

میں اب بات کو اصل موضوع کی طرف لانا چاہ رہا تھا۔ یہ ادھر ادھر کی باتیں صرف اس لیے کی تھیں کہ نواز شریف میرے ساتھ اپنے آپ کو پرسکون محسوس کریں اور مجھ سے کھل کر بات کریں۔

مجھے پتہ تھا کہ نواز شریف دو دفعہ وزیر اعظم ہونے کی حیثیت سے بہت سارے اہم فیصلے کرتے آئے تھے۔ ان کی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ وہ تھا جو 1993ء میں سپریم کورٹ سے اپنی حکومت بحال ہونے کے باوجود بھی انہوں نے استعفیٰ دے دیا تھا یا ان سے لے لیا گیا تھا۔ اب تک ہمیں یہ بتایا گیا تھا کہ اس وقت کے آرمی چیف جنرل وحید کاکڑ نے انہیں دھمکیاں دے کر ان سے استعفیٰ لیا تھا۔

جب میں نے نواز شریف سے یہ سوال پوچھا تو انہوں نے مجھے ایک اور کہانی سنائی۔ جب نواز شریف اور غلام اسحاق خان کے درمیان حکومت بحال ہونے کے بعد بھی اختلافات کم ہونے کے بجائے بڑھتے گئے تو انہوں نے جنرل کاکڑ کو فون کیا کہ وہ استعفیٰ دینا چاہ رہے ہیں کیونکہ ان کے لیے غلام اسحاق خان جیسے صدر کے ساتھ مل کر حکومت چلانا مشکل ہو گیا ہے۔ جب جنرل کاکڑ نے نواز شریف کے منہ سے یہ بات سنی تو ایک لمحے کے لیے وہ ششدر رہ گئے اور بڑی حیرانی سے نواز شریف سے پوچھا کہ سر! آپ کیوں استعفیٰ دیں گے۔ تاہم جب جنرل کاکڑ نے نواز شریف کو اپنی بات پر اڑے ہوئے پایا تو وہ بولے۔ او کے سر! آپ پھر اس ملک کے نگران وزیر اعظم بن کر استعفیٰ کا اعلان کر دیں۔

لیکن نواز شریف نے یہ آفر قبول نہیں کی۔ اس کے بجائے انہوں نے جنرل کاکڑ کے سامنے ایک اور شرط رکھی اور وہ یہ تھی کہ جنرل صاحب! میں استعفیٰ دے کر گھر جا رہا ہوں لیکن وہ شخص جس کی وجہ سے آج یہ سیاسی بحران پیدا ہوا تھا اسے بھی میرے ساتھ ہی گھر جانا چاہیے۔

جنرل کاکڑ نے غلام اسحاق خان کے بارے میں سخت زبان استعمال کی اور نواز کو یقین دلایا کہ آپ تسلی رکھیں کہ غلام اسحاق خان کو بھی گھر جانا ہوگا اور اگر انہوں نے مزاحمت کی تو میں انہیں زبردستی گھر لے جاؤں گا۔

نواز شریف کو یہ بات پسند نہیں آئی کہ ایک فوجی جرنیل ایک سویلین صدر غلام اسحاق خان کے بارے میں اس طرح کی سخت گفتگو کرے چاہے وہ اس وقت ان کا سب سے بڑا سیاسی دشمن ہی کیوں نہیں تھا۔ نواز کے خیال میں کسی کو بھی لوگوں کے ووٹوں سے منتخب کیے گئے صدر کی بے عزتی کرنے کا اختیار نہیں تھا۔ نواز کے خیال میں یہ فوجی لوگ دراصل سویلین لیڈروں سے نفرت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی بڑی عزت کرتے ہیں چاہے وہ ریٹائرڈ ہی کیوں نہ ہو جائیں۔

دوسری دفعہ وزیر اعظم بننے کے بعد نواز شریف نے ایک بڑا فیصلہ کیا جو جنرل جہانگیر کرامت سے استعفیٰ لینے کا تھا۔

میرے اصرار پر نواز شریف نے ایک اور کہانی سنائی۔

اب نواز شریف کو یہ پتہ چلا کہ آرمی چیف نے کھلے عام نیشنل سیکورٹی کونسل بنانے کا آئیڈیا ان کی حکومت کو دیا تھا تو انہیں شدید غصہ آیا۔ ان کے خیال میں جنرل جہانگیر کرامت نے ایک آرمی چیف ہونے کے ناطے سے اپنی حدود اور اختیارات سے تجاوز کیا تھا اور اب وہ اس قابل نہیں تھے کہ سیاسی حکومت ان پر بھروسہ کر سکتی۔ یہ جنرل جہانگیر کرامت کا اختیار نہیں تھا کہ وہ اس طرح کی بات کرتے۔ نواز شریف کو محسوس ہوا کہ جہانگیر کرامت نے ایک بیان دے کر ان کی وزیر اعظم کی حیثیت سے ساری اتھارٹی ایک لمحے میں ختم کر دی تھی۔ اب نواز شریف کے لیے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ ایک سیاسی حکومت کے چیف ایگزیکٹو ہونے کے ناطے اپنی اتھارٹی کو منوائیں اور اس ایک بیان سے جو اختیارات کے توازن میں گڑبڑ ہوئی تھی اسے درست کریں۔ نواز شریف نے یہ سوچا کہ وہ جنرل جہانگیر کرامت کو بلا کر انہیں بتائیں گے کہ انہوں نے ایک غلط حرکت کی تھی اور اب اس کی انہیں قیمت چکانا ہوگی۔

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

پڑے گی۔

جنرل جہانگیر کرامت کو پرائم منسٹر ہاؤس بلایا گیا اور نواز شریف نے انہیں بڑے واضح لفظوں میں بتایا کہ پاکستان کے وزیر اعظم ہونے کے ناطے ان کے لیے یہ بات قابل قبول نہیں تھی کہ ان کا آرمی چیف اس طرح کے سیاسی بیانات داغے۔

جب جنرل جہانگیر کرامت نے نواز شریف کو اس موڈ میں دیکھا تو اچانک انہیں احساس ہوا کہ واقعی انہوں نے ایک سیاسی بیان دے کر ایک شدید غلطی کی تھی۔ چنانچہ نواز شریف نے بغیر وقت ضائع کیے جنرل صاحب سے کہا کہ بہتر ہو گا کہ آپ شام تک اپنا استعفیٰ بھیج دیں۔

نواز شریف اس وقت حیران رہ گئے جب آگے سے جنرل جہانگیر کرامت نے بغیر بحث مباحثے کے یہ کہا کہ وہ شام تک اپنا استعفیٰ ان کے حوالے کر دیں گے۔

جہانگیر کرامت اپنی بات کے پکے نکلے اور شام کو ڈی جی آئی ایس آئی رانا نسیم ان کا استعفیٰ لے کر نواز شریف کو دے آئے۔

یہ ساری کہانی سنتے ہوئے میں نے نواز شریف سے کہا کہ پھر آپ نے یہ طریقہ جنرل مشرف کے ساتھ کیوں نہیں اختیار کیا۔ جہانگیر کرامت کی طرح آپ انہیں بھی اپنے دفتر بلاتے اور انہیں کارگل کے مسئلے پر جواب طلب کر کے ان سے استعفیٰ طلب کرتے۔ انہیں ڈس مس کرنے کے لیے اتنا لمبا چکر چلانے کی کیا ضرورت تھی۔

نواز شریف نے میری طرف غور سے دیکھا۔ وہ تھوڑی دیر چپ رہے۔ وہ شاید مجھ سے اس سوال کی توقع نہیں کر رہے تھے کہ میں شاید جنرل جہانگیر کرامت اور جنرل مشرف کی صورت حال کا ایک دوسرے سے موازنہ کر کے ان سے یہ سوال پوچھ لوں گا۔

نواز شریف بولے کہ ۱۹۹۸ اور ۱۹۹۹ کے حالات میں بہت فرق تھا۔ دونوں آرمی چیفس کے ساتھ ان کے تعلقات مختلف رہے تھے اور دونوں کے لیے الگ حکمت عملی کی ضرورت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے دونوں کو الگ انداز میں ڈیل کرنے کی کوشش کی۔

تاہم مجھے نواز شریف کے اس غیر مطمئن جواب سے پتا چل گیا کہ انہوں نے جنرل مشرف کو ڈس مس کرنے کا فیصلہ انتہائی جلدی میں کیا تھا جس کی ان کے پاس اب کوئی توجیہ نہیں تھی۔ یہی وجہ

تھی کہ جنرل مشرف کے کیس میں وہ نتیجہ حاصل نہیں کر سکے جو انہوں نے جنرل جہانگیر کرامت کے معاملے میں حاصل کیا تھا۔

میرے ذہن میں اچانک جنرل علی قلی خان سے لیے گئے انٹرویو میں پوچھی گئی ایک بات یاد آ گئی جس کے جواب میں علی قلی نے اس بات کا انکشاف کیا تھا کہ جنرل مشرف جہانگیر کرامت کی جگہ آرمی چیف بننے کے لیے نواز شریف سے خفیہ ملاقاتیں کرتے رہے تھے۔ علی قلی خان نے یہ بھی بتایا تھا کہ نواز شریف کے پرنسپل سیکرٹری نے انہیں یہ کہا تھا کہ اگر وہ آرمی چیف بننا چاہتے تھے تو پھر سادہ گاڑی میں سادہ کپڑے پہن کر وزیر اعظم سے خفیہ ملاقات کریں۔ تاہم جنرل علی قلی خان نے ان شرائط پر نواز شریف سے ملنے سے انکار کر دیا تھا اور یوں وہ آرمی چیف نہیں بنائے گئے۔

نواز شریف نے ان تمام باتوں سے انکار کیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ کبھی جنرل مشرف سے خفیہ نہیں ملے تھے۔ تاہم انہوں نے کہا کہ جنرل مشرف کو آرمی چیف بنانے کے پیچھے اور بہت ساری وجوہات تھیں۔ جنرل علی قلی خان کو اس لیے آرمی چیف نہیں بنایا تھا کہ ان کے بارے میں کچھ خبریں ملی تھیں کہ جب ان تک جنرل جہانگیر کرامت کے استعفیٰ کی بات پہنچی تو انہوں نے اس پر بڑا شدید ردعمل ظاہر کیا تھا۔ اس میں بھی جنرل قلی کے خلاف کچھ اس طرح کی رپورٹیں ان کے پاس آئی تھیں۔ اصل میں گوہر ایوب خان اور سیف اللہ خٹک کا رشتہ دار ہونا بھی جنرل علی قلی کے خلاف گیا تھا۔ اس وقت نواز شریف کو کسی نے یہ مشورہ دیا تھا کہ علی قلی خان کو آرمی چیف بنانے کے بعد گوہر ایوب کی سیاسی سرگرمیوں کو تقویت مل جائے گی۔

نواز شریف نے اس بات کا بھی انکشاف کیا کہ گوہر ایوب خان جو اس وقت ان کے وزیر خارجہ تھے اور علی قلی خان کے بہنوئی بھی تھے، انہوں نے کبھی انہیں آرمی چیف بنانے کے لیے کوئی درخواست نہیں کی تھی۔

جب نواز شریف کے ذہن میں یہ بات صاف ہو گئی کہ جنرل علی قلی خان کو آرمی چیف بنانے سے ان کی حکومت سیاسی خطرات میں گھری رہے گی تو پھر ان کے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ وہ جنرل مشرف کو آرمی چیف بنا دیتے۔

میں نے میاں صاحب سے پوچھا کہ جنرل پرویز مشرف کو آرمی چیف بنانے کی سفارش انہیں

www.freepdfpost.blogspot.com

allurdupdfnovels.blogspot.com

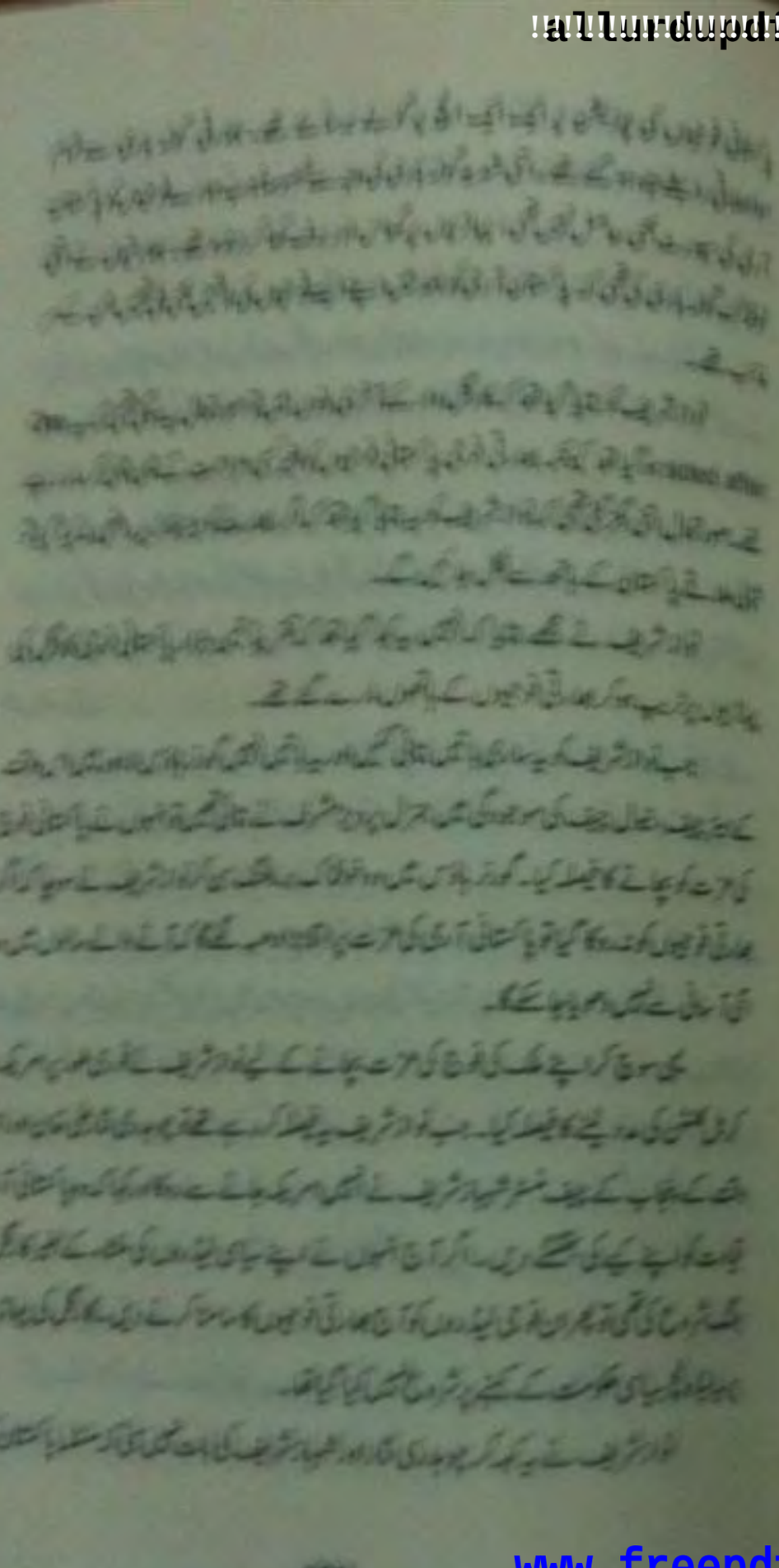

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

کے ان جرنیلوں کا نہیں تھا جنہوں نے کارگل کی پہاڑیوں پر یہ سارا کھیل کھیلا تھا جس میں اب تک تین ہزار پاکستانی فوجی بے گور و کفن مارے گئے تھے۔ یہ دراصل اس ملک کی فوج کی عزت اور انا کا مسئلہ تھا جسے اس وقت بچانا ضروری تھا۔

یوں اپنی فوج کی عزت بچانے کے نام پر نواز شریف نے فوری طور پر 4 جولائی 1999ء کو امریکہ جانے کا فیصلہ کیا۔ جنرل مشرف انہیں اسلام آباد ایئرپورٹ پر خدا حافظ کہنے کے لیے آئے۔ اس کے بعد جو کچھ 4 جولائی کو امریکہ میں ہوا وہ سب کے سامنے تھا۔ واجپائی کو بڑی مشکل سے بل کلنٹن نے سیز فائر پر راضی کیا۔

اب اس بیک گراؤنڈ میں جب نواز شریف کو یہ اطلاعات ملنا شروع ہوئیں کہ جنرل مشرف اور ان کے جرنیل اپنی سرکاری اور نجی محفلوں میں کارگل جنگ کا ذمہ دار انہیں ٹھہرا رہے تھے اور یہ دعوے کیے جا رہے تھے کہ وہ اگر امریکہ جا کر سیز فائر نہ کراتے تو شاید ہماری فوجیں بھارتی کشمیر پر قبضہ کر لیتیں تو انہیں شدید غصہ آیا۔

نواز شریف اب مزید ان وردی والوں کی دھوکہ بازی اور چالوں کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے بغیر نتائج کی پرواہ کیے جنرل مشرف کو ڈس مس کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ جنرل مشرف نے انہیں دھوکہ دیا تھا۔

میں نے نواز شریف صاحب سے پوچھا کہ پھر بھی انہوں نے جنرل مشرف کو ڈس مس کرنے سے پہلے اس وقت وزیراعظم ہاؤس میں موجود اپنے بھائی شہباز شریف اور چوہدری نثار علی خان سے مشورہ کیوں نہیں کیا تھا تو نواز شریف نے میری طرف دیکھ کر بڑے پختہ لہجے میں کہا کہ جناب اس وقت شہباز یا نثار سے مشورہ کرنے کا وقت گزر گیا تھا۔ اب کچھ کر گزرنے کا وقت آ گیا تھا اور انہوں نے وہ کچھ کیا جو ان کے خیال میں اس وقت کرنا چاہیے تھا۔ ان کے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ اگر انہوں نے شہباز اور نثار سے بات کی تو شاید وہ انہیں روکنے کی کوشش کریں اور اس دفعہ انہوں نے رکنا نہیں تھا کیونکہ وہ فیصلہ کر چکے تھے۔

میں نے نواز شریف سے کہا کہ آپ پر یہ الزام لگتا ہے کہ آپ کسی کے ساتھ نہیں چل سکتے۔ جو بھی صدر آئے یا آرمی چیف، آپ کی اس سے ضرور لڑائی ہوتی ہے۔

میری بات سن کر وہ بولے کہ آپ بالکل درست بات کہہ رہے ہیں۔ وہ پاکستان کے واحد لیڈر ہیں جنہوں نے ہمیشہ ان آرمی چیفس کے ساتھ ٹکر لی جو اپنے قانونی اور آئینی دائرے میں رہنے کے بجائے اس ملک کے حکمران بننے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کا مقصد آرمی چیفس کو سویلین حکومت کی رٹ میں لانا تھا۔ آرمی کا کام سرحدوں کی حفاظت کرنا تھا نہ کہ ملک پر حکمرانی کرنا۔

نواز شریف کے منہ سے فوجی جرنیلوں اور آرمی چیفس کے خلاف سخت گفتگو سن کر میں نے کہا کہ سر! آپ تو خود بھی ایک آرمی ڈکٹیٹر جنرل ضیاء کی پیداوار تھے۔ میری بات کا برا منائے بغیر نواز شریف نے کہا کہ آپ کی بات درست ہے، لیکن اس کے پیچھے دو وجوہات ہیں۔

میں نے محسوس کیا کہ نواز شریف اس بات پر معذرت خواہ نہیں تھے کہ آج اب وہ جمہوریت کے چیمپئن بنے ہوئے تھے اور پاکستان کے آرمی جرنیلوں کے سیاسی کردار کو شدید تنقید کا نشانہ بنا رہے تھے تو ماضی میں وہ خود بھی جنرل ضیاء کی وجہ سے سیاست میں آئے اور وہیں سے ان کا عروج شروع ہوا۔

تاہم، نواز شریف نے مجھے اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کے لیے دو وجوہات بتائیں۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ پاکستان پر زیادہ عرصہ فوجی جرنیلوں نے حکومت کی تھی۔ جتنے بھی لوگ سیاست میں آئے اس وقت ملک پر مارشل لا تھا۔ وہ کوئی اکیلے لیڈر نہیں تھے جو مارشل لا دور میں سیاست میں آئے۔ اگر ملک پر فوجی حکومت نہ ہوتی تو یقیناً سیاستدان بغیر فوجی حکمرانوں کی مدد کے سیاست میں آتے۔

نواز شریف نے کہا کہ آپ کم از کم مجھے اس بات کا کریڈٹ تو دیں کہ انہوں نے طاقتور اسٹیبلشمنٹ پر یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ وزیراعظم ہونے کی حیثیت سے ان کی کسی بھی غیر قانونی حرکت کو برداشت نہیں کریں گے۔ وہ واحد وزیراعظم تھے جنہوں نے سویلین حکومت کی رٹ قائم کرنے کے لیے ان سے جو کچھ ہو سکا انہوں نے کیا۔

نواز شریف کا خیال تھا کہ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ انہیں اس بات میں کامیابی ہوئی یا نہیں لیکن کم از کم انہوں نے یہ بات تو ثابت کی کہ وہ کسی آرمی جنرل کی سیاسی معاملات میں مداخلت برداشت نہیں کریں گے کیونکہ یہ قانون اور آئین کی خلاف ورزی تھی۔

میں نے نواز شریف صاحب سے پوچھا کہ جنرل مشرف اکثر یہ کہتے تھے کہ اگر نواز شریف

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

انہیں اس کی ضرورت [illegible] شاید [illegible] وزیراعظم ہوتے [illegible]
کیونکہ انہیں اس بات [illegible] جنرل مشرف کو واپس کیوں [illegible]
[illegible] تھی۔

ایک فیصلے کی انہیں [illegible]

نواز شریف نے مجھے یہ بتا کر بھی جواب دیا کہ انہیں اس بات پر ہرگز کوئی پچھتاوا نہیں ہے کہ انہوں نے جنرل مشرف کو واپس کیوں کیا تھا جس کی وجہ سے انہیں پرائم منسٹر ہاؤس سے ہتھکڑیاں لگا کر لانڈھی جیل لے جایا گیا تھا۔ وہ جنرل مشرف کی اس بات پر ہنسے اور بولے کہ ہر انسان کی اپنی تقدیر ہوتی ہے جس سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ کیونکہ جو ان کے ساتھ ہر حالت میں ہو کر رہتا ہے اور وہ ہوتی ہیں اور ہو کر ہی رہتا ہے۔

نواز شریف کے منہ سے یہ بات سن کر مجھے یوں لگا کہ شاید میں کسی ایک پولیٹیکل فلاسفر یا [illegible] کے [illegible] کے مرکزی کردار سے گفتگو کر رہا تھا۔

نواز شریف نے اپنی بات جاری رکھی اور بولے کہ میں نے جو کچھ کیا وہ بہت سوچ سمجھ کر کیا اور جب کچھ ملک کے بہتر مفاد میں تھا۔ ان کے پاس ایک ایسے آرمی چیف کو واپس کرنے کا جواز موجود تھا جو اپنے ہی وزیراعظم کے خلاف فوج میں پروپیگنڈہ کر رہا تھا۔

نواز شریف کے لیے اہم بات یہ تھی کہ انہوں نے جو کچھ مشرف کے ساتھ کیا اس کی انہیں قانون اور آئین کے تحت اجازت تھی۔ اگر وہ ایک آرمی چیف جنرل جہانگیر کرامت کو فارغ کر سکتے تھے تو وہ دوسروں کو بھی کر سکتے تھے اگر ان کے پاس اس کے لیے مناسب وجوہات تھیں۔

نواز شریف نے الٹا مجھ سے پوچھا کہ میں اپنے اس فیصلے پر کیوں پچھتاؤں جو ہر حوالے سے قانونی اور آئینی تھا۔

میں نے نواز شریف سے پوچھا کہ مجھے پتا نہیں کہ آپ کو جنرل مشرف کی جیل سے رہائی کیسے ملی اور وہ یہاں جدہ تک کیسے پہنچے۔

نواز شریف نے مجھے ایک کہانی سنائی۔

جب انہیں وزیراعظم ہاؤس سے ہتھکڑیاں لگا کر لانڈھی جیل کراچی لے جایا گیا تو وہاں کال کوٹھڑی میں بیٹھے انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ کتنے طاقتور لوگ ان کی زندگی بچانے کے لیے کوششیں کر

رہے تھے۔ [illegible] پاکستان آرمی ایک [illegible] سعودی [illegible]
[illegible] سعودی عرب کے [illegible] شاہ عبداللہ نے نواز شریف کی [illegible] کے خلاف
[illegible] کیا کیونکہ وہ نواز شریف کو [illegible] سمجھتے ہیں۔ [illegible]
انہیں رہا کروانے کے لیے اپنی کوششیں شروع کر دیں۔

نواز شریف اس بات پر مطمئن تھے کہ ان کی رہائی دراصل جنرل مشرف اور ان کے درمیان طے پانے والی مفاہمت کا حصہ تھا۔ اس کا ان دونوں کی ڈیل سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

میں نے کہا کہ میاں صاحب! آپ یہ نہیں سمجھتے کہ اگر آپ 10 دسمبر 2000 کو جدہ جانے کے بجائے آزادی کی اڈیالہ جیل میں بیٹھے رہتے تو سیاسی الائنس کے بعد پاکستان میں جیل میں ہی رہتے تو شاید جنرل مشرف کے لیے چھ ماہ سے زیادہ اقتدار میں رہنا ممکن نہ رہتا۔

نواز شریف صاحب نے کہا، ہاں ممکن تھا۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ ان کے جیل میں بیٹھے رہنے سے محترمہ صاحبہ پیپلز پارٹی اور پی ایم ایل نواز میں الائنس ہو چکا تھا، جنرل مشرف کو اقتدار چھوڑنے پر مجبور کیا جا سکتا تھا۔ تاہم دوسری طرف یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ سیاسی قوتیں اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود بھی جنرل مشرف کو اقتدار سے باہر نہ نکال پاتیں۔

میں نے یہ محسوس کیا کہ نواز شریف کو اس بات کا ہرگز پچھتاوا نہیں تھا کہ انہیں اس وقت پاکستان سے باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا اب سیاسی قوتوں کو ان کی وہاں بڑی اشد ضرورت تھی۔

نواز شریف صاحب نے خود ہی بات کا رخ بدلا اور مجھے بتانے لگے کہ جس طرح سے پاکستان کی فوجی حکومت نے ان کے والد صاحب کی وفات کے بعد ان کے خاندان کے احساسات سے کھیلنے کی کوشش کی تھی اس سے انہیں خاص تکلیف ہوئی تھی۔ وہ شہباز اور خاندان کے دوسرے لوگوں کے ساتھ اپنے باپ کی میت کے ساتھ پاکستان جانا چاہ رہے تھے۔ اس وقت سعودی عرب میں پاکستان کے [illegible] کے سابق چیف عبدالعزیز مرزا تھے جنہیں نواز شریف نے اپنے دنوں میں اس عہدے پر تعینات کیا تھا۔ مرزا صاحب ان سے ملنے کے لیے وہاں آئے اور انہوں نے نواز شریف کے سامنے چند شرائط رکھیں جن میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ نواز شریف، شہباز شریف اور کلثوم نواز اپنے والد کی میت کے ساتھ پاکستان نہیں جائیں گے۔

www.freepdfpost.blogspot.com

allurdupdfnovels.blogspot.com

نواز شریف نے پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ [illegible]۔

چند دنوں بعد جنرل مشرف نے نواز شریف کو پیغام بھجوایا اور اس بات پر حیرانی کا اظہار کیا کہ وہ اپنے والد صاحب کی میت کے ساتھ پاکستان کیوں نہیں آئے تھے۔

مشرف کے منہ سے یہ بات سن کر نواز شریف بہت پریشان ہوئے اور انہیں بتایا کہ جب آپ کا اپنا بھیجا ہوا سفیر ہی انہیں منع کر کے گیا تھا کہ وہ پاکستان نہیں جا سکتے اور اب آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ میں پاکستان کیوں نہیں آیا۔

جنرل مشرف نے نواز کی یہ بات سن کر اس طرح تاثر دینے کی کوشش کی جیسے پاکستانی سفیر نے انہیں غلط پیغام دیا تھا اور وہ ان کے خلاف شدید ایکشن لیں گے کہ اس نے کیوں غلط پیغام ان تک پہنچایا تھا۔ جنرل مشرف کے بقول وہ دونوں بھائیوں کو پاکستان آنے کی اجازت دینے پر رضامند تھے۔

نواز شریف نے الٹا مجھ سے پوچھا کہ آپ ہی مجھے بتائیں کہ آخر ایک سفیر کیونکر ملک کے صدر اور آرمی چیف کا غلط پیغام ان تک پہنچائے گا اور سب سے بڑھ کر جنرل مشرف کے اس فون کے بعد بھی اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔

میں نے نواز شریف صاحب سے پوچھا کہ ان کی کب تک پاکستان واپسی ممکن ہو سکے گی۔

انہوں نے پھر مجھے ایک سیاسی کھلاڑی کے سے انداز میں جواب دیا کہ رؤف صاحب ہو سکتا ہے میں کل ہی واپس چلا جاؤں اور مجھے وہاں دیکھ کر ہر کوئی حیران رہ جائے۔

اپنی اس بات کی وضاحت کرنے کے لیے انہوں نے مجھے بتایا کہ دراصل جب [illegible] کی عدالت نے 2000ء میں انہیں [illegible] تو کس نے سوچا ہو گا کہ وہ چند دنوں بعد [illegible] چلے جائیں گے۔ اس لیے اب وہ صرف اپنی اچھی قسمت کا انتظار کر رہے ہیں جو انہیں اسی طرح [illegible]۔

میں نے ان سے ان کے پرانے سیاسی دوستوں کے بارے میں [illegible] جنرل مشرف کے ساتھ اقتدار میں [illegible]

اب انہیں [illegible] ہیں لیکن [illegible]۔ انہیں اس بات کی بڑی خوشی ہے کہ پاکستان میں ان کی پارٹی کا ووٹ بینک ابھی تک برقرار ہے اور لوگ انہیں چاہتے ہیں۔ اب انہیں صرف اس وقت کا انتظار ہے جب وہ پاکستان واپس جائیں گے اور وہاں اپنی پارٹی کی قیادت کریں گے۔ ان کے خیال میں فوج کا براہ راست حکمرانی کرنے کا انہیں یہ فائدہ ہوا ہے کہ وہ اپنی پارٹی سے گند کو صاف کرنے میں کامیاب رہے ہیں کیونکہ اب کمزور سیاستدان جنرل مشرف کے ساتھ کھڑے ہیں جبکہ کردار کے مالک لیڈر ان کی پارٹی میں ہیں۔ نواز کا خیال تھا کہ وہ ابھی بھی ان سیاستدانوں کو اپنی پارٹی میں واپس لینے کے لیے تیار ہیں جو ہو سکتا ہے جنرل مشرف کے دور میں ان کے ساتھ نہیں رہے لیکن انہوں نے کھل کر ان کے خلاف کوئی بیان بازی نہیں کی۔ تاہم نواز شریف نے انتہائی سخت لہجے میں مجھے بتایا کہ ان سیاستدانوں کے لیے ان کی پارٹی میں کوئی جگہ نہیں ہے جنہوں نے ان کی حکومت میں بھی مزے اڑائے اور جنرل مشرف کے اقتدار میں آتے ہی موقع ملتے پر پہلی فرصت میں ان کی پیٹھ میں چھرا گھونپا۔ ایسے موقع پرست سیاسی لیڈروں کے لیے ان کی پارٹی میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ انہیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ جنرل مشرف ان کے چھوٹے بھائی شہباز شریف کو بہکانے کے لیے مختلف ہتھکنڈے استعمال کرتے رہے تھے لیکن انہیں اس بات کا یقین ہے کہ شہباز شریف کبھی بھی اس طرح کی سازشوں کا حصہ نہیں بنیں گے۔

رات خاصی ہو چکی تھی۔ انٹرویو تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ جدہ کا سرور پیلس چھوڑنے سے پہلے نواز شریف نے مجھے آخری بات کہی کہ مجھ سے یہ بات یاد رکھنا کہ میں کسی وقت بھی پاکستان واپس لوٹ سکتا ہوں۔

○○○

نواز شریف سے یہ انٹرویو [illegible] 2006ء میں لیا گیا تھا [illegible]

نواز شریف سے [illegible]

www.freepdfpost.blogspot.com

allurdupdfnovels.blogspot.com

www.freepdfpost.blogspot.com

!!alllurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

میاں صاحب کے ہاں جدہ میں بڑا مشہور شربت اور کھانے پینے کا دور ہوتا تھا۔ میاں صاحب کے شیدائی دور دراز کے علاقوں سے ہر قسم کی خوراک لے کر آتے۔ صحافیوں سے لے کر سیاستدانوں اور عام لوگوں تک سب پیٹ بھر کر کھاتے۔ میاں صاحب اکثر ہمارے جیسے مہمانوں کی پلیٹوں میں تکے بوٹیاں بار بار ڈالتے دیکھے جاتے۔

بینظیر اور جنرل مشرف کے درمیان ہونے والی ڈیل کی باتوں نے اگرچہ نواز شریف کیمپ کو خاصا پریشان کیا ہوا تھا، تاہم سیانے سیاستدانوں کی طرح وہ بھی یہ بات سمجھتے تھے کہ بینظیر بھٹو کا ڈیل کر کے پاکستان چلے جانا ہی ان کے سیاسی فائدے میں تھا۔ اگر کل کلاں بینظیر بھٹو اقتدار میں آ گئیں تو یقیناً وہ طالبان کے بجائے نواز شریف کو اپنا اپوزیشن لیڈر دیکھنا زیادہ پسند کریں گی۔ نواز شریف کیمپ کو یہ بھی لگتا تھا کہ پی پی پی کی جنرل مشرف کے ساتھ ہونے والی ڈیل کا زیادہ فائدہ انہیں ہوگا۔ بدنامی بینظیر بھٹو کے حصے میں آئے گی جبکہ وہ بڑے مزے سے لوگوں کو بتائیں گے کہ انہوں نے ڈکٹیٹر سے ڈیل نہیں کی تھی۔ حالانکہ یہ بات بڑے سامنے کی تھی کہ جنرل مشرف اور نواز شریف میں ڈیل ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ دونوں نے 12 اکتوبر کو ایک دوسرے کو ڈس کیا تھا۔ اب نواز شریف اور جنرل مشرف کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ایک ساتھ مل بیٹھتے۔ بینظیر بھٹو اور جنرل مشرف میں بہت ساری چیزیں کامن تھیں۔ سب سے بڑھ کر ان دونوں کے درمیان 12 اکتوبر کی طرح کے ماضی کی کوئی زنجیر ان کی راہ میں رکاوٹ نہیں تھی۔

نواز شریف کیمپ کو اس بات کا یقین تھا کہ ایک دفعہ بینظیر بھٹو پاکستان چلی گئیں تو پھر انہیں روکنا آسان نہیں ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بینظیر سے اپنے سیاسی تعلقات چارٹر آف ڈیموکریسی کی خلاف ورزی کرنے کے باوجود ختم کرنے کو تیار نہیں تھے۔ بینظیر بھٹو کی ڈیل میں ہی انہیں اپنی سیاسی زندگی نظر آتی تھی۔

نواز شریف اس دن بڑے خوش تھے جب 7 جولائی 2007ء کو لندن میں آل پارٹیز کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ وہ شخص جو جدہ میں مجھ سے براہ راست جنرل مشرف کے بارے میں بات کرتے ہوئے ڈرتا تھا آج پاکستان سے آئے ہوئے امین فہیم، مولانا فضل الرحمٰن، عمران خان، محمود خان اچکزئی اور دیگر بڑے بڑے لیڈروں کے سامنے جس طرح جنرل مشرف کو للکار رہا تھا، یہ دیکھ کر مجھے شدید حیرانی ہو رہی تھی۔ جس انداز میں نواز شریف تقریر کر رہے تھے اس سے میرا خیال ہے سب کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ ان گزرے برسوں میں ان میں اور کوئی تبدیلی آئی ہو یا نہیں، تاہم وہ ایک اچھے مقرر ضرور بن گئے تھے۔

اس بات پر لندن میں شرطیں لگی ہوئی تھیں کہ بینظیر بھٹو اے پی سی میں شریک ہوں گی یا نہیں۔ سننے میں آ رہا تھا کہ جنرل مشرف نے بینظیر بھٹو سے مذاکرات کامیاب کرنے کے لیے یہ شرط رکھی تھی کہ وہ نواز شریف کے اس سیاسی شو میں نہیں جائیں گی۔ دوسری طرف نواز شریف کیمپ کا یہ خیال تھا کہ وہ ضرور آئیں گی تاکہ جنرل مشرف پر دباؤ ڈال کر ان سے بہتر ڈیل کی جا سکے۔

نواز شریف اور بینظیر بھٹو دونوں ایک دوسرے کو جنرل مشرف کے مارشل لاء کے بعد استعمال کرتے آئے تھے۔ 10 دسمبر 2000ء کو نواز شریف نے بینظیر کا سیاسی پریشر استعمال کر کے جنرل مشرف سے ڈیل کر لی تھی۔ جدہ روانگی سے آٹھ دن پہلے ہی نواز شریف نے بینظیر بھٹو کی پارٹی کے ساتھ اے آر ڈی بنائی تھی۔ بینظیر بھٹو اب وہی کچھ کرنے جا رہی تھیں۔ وہ نواز شریف کے ساتھ اپنے سیاسی اتحاد کا پریشر جنرل مشرف پر ڈال کر ان سے بہتر شرائط پر پاکستان واپس جا رہی تھیں۔ نواز شریف بھی شاید اس بات پر چپ تھے کہ چلیں اس بہانے دونوں کا سکور برابر ہو رہا تھا۔ اگر کبھی انہوں نے جنرل مشرف کی قید سے رہائی پانے کے لیے بینظیر بھٹو کے سیاسی پریشر کو استعمال کیا تھا تو آج بینظیر بھٹو بھی ان کا سیاسی دباؤ استعمال کر کے پاکستان واپس جا رہی تھیں۔ یوں دونوں سیاستدانوں کو ایک دوسرے سے کوئی گلہ نہیں تھا۔

اے پی سی کی کامیابی سے نواز شریف میں ایک نیا اعتماد آ گیا۔ ان کے ارد گرد بیٹھے دوستوں نے انہیں یہ یقین دلانا شروع کر دیا کہ اب جنرل مشرف کے لیے انہیں پاکستان آنے سے روکنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ اسی اثناء میں یہ باتیں پھیلنا شروع ہو گئیں کہ بینظیر بھٹو بہت جلد الیکشن سے پہلے پاکستان واپس چلی جائیں گی۔ اس سے نواز شریف کیمپ پر اور پریشر بڑھا اور انہیں یہ محسوس ہوا کہ اگر ان کے ہاتھ سے یہ موقع نکل گیا تو پھر کیا پتہ بینظیر بھٹو جنرل مشرف کے ساتھ مل کر نواز شریف کا راستہ ہموار کرنے کی بجائے ان کا راستہ روکنے پر تیار ہو جائیں اور الیکشن جیتنے کے بعد ہی نواز شریف کو واپس آنے دیا جائے۔ اس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہوگی۔ نواز شریف کو یہ یقین دلایا جانے لگا کہ پاکستان

www.freepdfpost.blogspot.com

alllurdupdfnovels.blogspot.com

اب انقلاب کے لیے تیار ہے۔ وہ آیت اللہ خمینی کی طرح اسلام آباد کے ایئرپورٹ پر اتر کر چند گھنٹوں میں جنرل مشرف کا تختہ الٹ دیں گے۔ لندن میں پی ایم ایل نواز کے جس لیڈر سے بھی بات ہوتی، وہ نواز شریف کے پاکستان واپس آنے کو آیت اللہ خمینی کے فرانس سے تہران واپسی کے ساتھ موازنہ کرتا۔

20 جولائی 2007ء کے سپریم کورٹ کے فیصلے نے نواز شریف کو مزید پختہ کیا کہ وہ واپس جائیں۔ اب جنرل مشرف دھیرے دھیرے ختم ہو رہے تھے۔ سپریم کورٹ نے چیف جسٹس افتخار چوہدری کو بحال کر دیا تھا۔ پاکستان بدل گیا تھا۔ اب سب سے اچھا موقع تھا کہ اس وقت پاکستان جایا جائے جب چیف جسٹس بحال ہو چکے تھے اور فیصلہ بھی دے چکے تھے کہ نواز شریف اور شہباز شریف کو پاکستان کا شہری ہونے کے ناطے وطن واپسی کا پورا حق تھا۔ یوں سپریم کورٹ نے وہ ڈیل سکریپ کر دی تھی جو بقول نواز شریف کے جنرل مشرف اور سعودی بادشاہ کے درمیان ہوئی تھی۔

ایک دن مجھے لندن میں نواز شریف کے ترجمان نادر چوہدری کا فون آیا کہ میاں صاحب اپنی پارٹی کے لیڈروں کے ساتھ میٹنگ کے بعد ڈورچیسٹر ہوٹل میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کریں گے۔ توقع یہی کی جا رہی تھی کہ وہ اپنی پاکستان روانگی کے پروگرام کا اعلان کریں گے۔

آخر وہ وقت آن پہنچا تھا کہ نواز شریف اپنی جلاوطنی ختم کرنے کے بعد اپنے ان نامزد کردہ آرمی چیف سے ٹکر لینے کو تیار ہو جائیں۔

ڈورچیسٹر ہوٹل میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ پاکستان سے متعدد صحافی وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ عالمی میڈیا بھی اس میں پوری دلچسپی لے رہا تھا۔ مجھے اس ہال میں کہیں بیٹھنے کی جگہ نہیں مل رہی تھی۔ مشہور کالم نگار عرفان صدیقی صاحب ایک کونے میں کھڑے تھے۔ انہوں نے کمال شفقت سے مجھے اپنی طرف بلا لیا اور وہیں کھڑے ہوئے کو تھوڑی سی جگہ دی۔ تمام کیمرے اور نگاہیں نواز شریف پر مرکوز تھیں کہ وہ کب پاکستان واپسی کی تاریخ کا اعلان کریں گے۔ پہلے انہوں نے ایک بیان انگریزی میں پڑھا اور پھر انہوں نے اردو میں گفتگو شروع کی۔ نواز شریف نے بتایا کہ وہ دو ہفتے بعد 10 ستمبر کو اسلام آباد کے ایئرپورٹ پر اتریں گے۔ اپنی جلاوطنی ختم کرنے کے لیے نواز شریف نے جو تقریر کی وہ کافی متاثر کن تھی۔ میں نے اپنے قریب کھڑے عرفان صدیقی صاحب سے کہا کہ سر اگر آپ اجازت

دیں تو ایک بات کہوں۔ ہمیشہ بڑی محبت اور پیار سے گفتگو کرنے والے عرفان صدیقی صاحب نے فرمایا کہ بالکل ضرور!

میں نے کہا کہ صدیقی صاحب! میں اس بات پر شرط لگانے کو تیار ہوں کہ میاں صاحب جو تقریر اس وقت اردو میں کر رہے ہیں وہ آپ نے لکھی ہے۔ آپ سے بہتر اتنی اچھی اردو اور سیاسی تقریر شاید یہاں پر موجود اور کسی سیاستدان، صحافی یا کالم نگار کے بس کی بات نہیں ہے۔ عرفان صدیقی مسکرائے اور بولے کہ اگر آپ نے پہچان ہی لیا ہے تو میں مان لیتا ہوں کہ یہ تقریر میں نے لکھی ہے۔

میاں نواز شریف کے 10 ستمبر کی تاریخ دینے کے ساتھ ہی لندن اور اسلام آباد میں ایک بھونچال سا آ گیا تھا۔ اسلام آباد کے حکمرانوں نے فوراً اس پر ردعمل کا اظہار کیا کہ نواز شریف کو کسی صورت پاکستان واپس نہیں آنے دیا جائے گا۔ وہ باقاعدہ ایک ڈیل کے ذریعے دس سال کے لیے پاکستان سے باہر گئے تھے اور مقررہ مدت سے پہلے انہیں واپس نہیں آنے دیا جائے گا۔ لندن کے مضافات میں جنرل مشرف کے قریبی ساتھی بریگیڈیئر نیاز اور شہباز شریف کے درمیان ملاقاتوں کی خبریں آنے لگیں۔ سعودی اور لبنانی پیغام رساں نواز شریف سے ملنے لگے لیکن لگتا تھا جس طرح نواز شریف نے واپس جانے کا فیصلہ کیا تھا اس پر انہیں سعودی حکومت کی حمایت حاصل تھی۔ نواز شریف نے بھی ایک دن یہی بات ہم صحافیوں کو بتائی کہ ان پر سعودی حکومت کا کوئی دباؤ نہیں ہے کیونکہ انہوں نے جنرل مشرف سے براہ راست کوئی ڈیل نہیں کی تھی۔

لندن آئے ہوئے تمام سیاسی لیڈروں کو واپس پاکستان بھیج دیا گیا کہ وہ جائیں اور نواز شریف کے استقبال کی تیاریاں کریں۔ صحافیوں کی فہرستیں بننا شروع ہو گئیں کہ پاکستان سے کون اور کہاں سے آئے گا۔ لندن سے میاں صاحب کے ساتھ کون کون سے صحافی جائیں گے۔ اپنے پروگرام کو خفیہ رکھنے کے لیے تین مختلف ایئرلائنز پر سیٹوں کی بکنگ کرا دی گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نواز شریف کے دو لوگ محمد عمران اور محمد افضال اس کام میں زبردست تھے۔ انہوں نے آخری لمحے تک اس بات کی بھنک کو نہیں لگنے دی کہ انہوں نے کونسی ایئرلائن پر کس کس کو بک کیا ہوا تھا۔ ان کے صحافیوں سے بڑے اچھے تعلقات تھے لیکن عمران اور افضال نے نواز شریف کے مفادات میں اس راز کو آخری لمحے تک راز رکھا کہ میاں صاحب پی آئی اے، ایئر بلیو یا گلف ایئرلائن سے جائیں گے۔

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

[illegible]

سعودی پرنس کی اسلام آباد آمد نے نواز شریف کیمپ میں ایک عجیب ہلچل پیدا کر دی۔ ایک بڑے شارٹ نوٹس پر ہم صحافیوں کو ایک [illegible] پر بلایا گیا۔ نواز شریف اور شہباز شریف کے چہروں پر پریشانی عیاں تھی۔ لگتا تھا کہیں نہ کہیں کوئی شدید گڑبڑ ہو چکی تھی۔ میں نے وہاں موجود جس کسی لیڈر سے بات کرنے کی کوشش کی ان سب کو سنجیدہ پایا اور وہ اور اپنے دوست پرویز رشید بھی زیادہ بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ نواز شریف بڑی دیر تک ایک کمرے میں بند ہو کر شہباز شریف، پرویز رشید اور پارٹی کے دیگر دو تین لوگوں کے ساتھ بڑی دیر تک مشورہ کرنے میں مصروف رہے اور ہم صحافی باہر ان کے دفتر میں چائے بسکٹ اور ویفرز کھاتے رہے۔ خاصی دیر بعد نواز شریف کمرے سے باہر نکلے۔ ان کا چہرہ ایک دفعہ پھر سنجیدگی میں ڈوبا ہوا تھا جس سے لگتا تھا کہ وہ کوئی ایسا اہم فیصلہ کر کے نکلے تھے جس پر انہیں ابھی بھی کچھ شکوک تھے۔

اس دفتر میں پھیلی خوفناک سنجیدگی نے ہم صحافیوں کو بھی مسکرانا بھلا دیا تھا۔ ہمیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کل 10 ستمبر کو میاں صاحب نے پاکستان روانہ ہونا تھا اور آج 9 ستمبر کو وہ ایمرجنسی میں پریس کانفرنس بلا کر بات چیت کرنا چاہ رہے تھے۔

کیا نواز شریف سعودی شہزادے کے پاکستان آنے کے بعد اپنا پروگرام تبدیل کرنے والے تھے۔

یہ سوال ہم سب صحافیوں کے ذہنوں میں موجود تھا۔ اکثریت کا خیال یہی تھا کہ نواز شریف اب پاکستان واپس نہیں جائیں گے۔ شہباز شریف بھی ان کے ساتھ پاکستان واپس جا رہے تھے۔ کیا دونوں بھائی یہ افورڈ کر سکتے تھے کہ وہ ایک دفعہ پھر گرفتار کر کے جدہ لے جائے جائیں جہاں سے بڑی مشکل

[illegible] چوہدری شجاعت کی پارٹی میں شامل ہو جائیں گے۔

یوں ہم سب کا خیال تھا کہ نواز شریف ایک بہت بڑا سیاسی جوا کھیلنے جا رہے تھے۔ نواز شریف، شہباز شریف Do or die کی سیاست کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ اب ان کا پاکستان سے دور رہنا انہیں اپنی سیاسی خودکشی نظر آ رہی تھی۔

لیکن سوال یہ تھا کہ اگر ان دونوں کو انہی پر گرفتار کر کے جدہ بھیج دیا گیا تو کیا ہوگا۔

میں نواز شریف کے دفتر کے ایک کونے میں بیٹھا یہ ساری باتیں سوچ رہا تھا کہ اتنی دیر میں پریس کانفرنس شروع ہو گئی۔ اسلام آباد سے آنے والے دباؤ نے نواز شریف کو ایک ایسی حرکت کرنے پر مجبور کر دیا تھا جس کا احساس انہیں 10 ستمبر کو اسلام آباد کے ایئرپورٹ پر اترنے سے پہلے ہی ہو گیا تھا۔

جب نواز شریف نے گفتگو شروع کی تو لگ رہا تھا کہ وہ مزاحمت کے موڈ میں تھے۔ وہ اب پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھے۔ وہ سعودی حکمرانوں کو بھی ناراض کرنے پر تل گئے تھے۔ اب ان کا راستہ نہیں روکا جا سکتا تھا۔ یہاں تک تو بات ٹھیک تھی لیکن جب میاں صاحب نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ایک کاغذ سے یہ پڑھنا شروع کیا کہ ان کا جنرل مشرف کے ساتھ باہر رہنے کا معاہدہ پانچ سال کا تھا نہ کہ دس سال کا تو ہم سب چونک پڑے۔ ہمارے خیال میں میاں صاحب ایک ایسی بات کر گئے تھے جس کا نقصان انہیں سیاسی طور پر بھگتنا ہوگا کیونکہ اب تک ان پچھلے آٹھ سالوں میں وہ مکہ اور مدینہ میں بیٹھ کر یہ قسمیں کھاتے رہے تھے کہ انہوں نے جنرل پرویز مشرف سے کوئی ڈیل نہیں کی تھی اور آج وہ سب کو بتا رہے تھے کہ ان کی ڈیل پانچ سال کے لیے تھی۔

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

پاکستان میں تمام ٹی وی چینل اس وقت موبائل ٹیلی فون کے ذریعے نواز شریف کی پریس کانفرنس نشر کر رہے تھے۔

میں نے میاں صاحب سے پوچھا کہ کیا وہ یہ نہیں سمجھتے کہ سعودی شہزادے کا اسلام آباد میں آکر انہیں واپس لے جانے کا اعلان کرنا پاکستان کی خود مختاری پر ایک ضرب نہیں ہے۔

میاں نواز شریف نے میری طرف دیکھا اور انہوں نے اس سوال کا جواب نہیں دیا۔ شاید وہ دینا بھی چاہتے تو نہ دے پاتے۔

نواز شریف صاحب اور ان کے حامیوں کا خیال تھا کہ پانچ سال کی ڈیل کی بات کر کے وہ اپنی واپسی کا جواز حاصل کر لیں گے۔ وہ یہ بات بھول گئے تھے کہ سپریم کورٹ آف پاکستان کو بھی ان دونوں بھائیوں نے یہ لکھ کر دیا تھا کہ انہوں نے جنرل مشرف کے ساتھ کوئی ڈیل نہیں کی تھی اور آج اسی سپریم کورٹ اور پاکستان کے عوام کو یہ بتایا جا رہا تھا کہ ڈیل تو ہوئی تھی لیکن دس سال کے لیے نہیں بلکہ پانچ سال کے لیے تھی۔

وہی ہوا جس کی توقع تھی۔ جنرل مشرف اور ان کی کابینہ کے وزیروں نے اسلام آباد میں آسمان سر پر اٹھا لیا۔ وفاقی وزیر شیخ رشید سب سے آگے تھے۔ باقی وزیروں نے بھی میاں صاحب پر طعن کرنی شروع کی کہ دیکھیں آٹھ سال تک وہ جھوٹ بولتے رہے کہ انہوں نے ڈیل نہیں کی تھی اور آج واپسی سے ایک دن پہلے انہوں نے خود اپنی زبان سے یہ اعتراف کر لیا تھا۔

یوں پاکستان میں بارہ گھنٹے کے اندر اندر نواز شریف کے اس اعتراف کو اس طریقے سے جنرل مشرف کے وزیروں نے استعمال کیا کہ پی ایم ایل کے لیڈروں اور ورکروں کا سارا جوش بڑی حد تک ٹھنڈا ہو گیا اور رائے عامہ بڑی حد تک جنرل مشرف کے حق میں ہموار ہو گئی۔

میں نے پریس کانفرنس سے نکلنے کے بعد نواز شریف کے قریبی لیڈر سے پوچھا کہ حضور! یہ بکواس مشورہ میاں صاحب کو کس نے دیا تھا تو انہوں نے نہایت سیاسی جواب دیا۔ بولے کہ یہ سب کا مشترکہ فیصلہ تھا اگرچہ وہ ایک دو لوگ اس کے خلاف تھے لیکن میاں صاحب کا خیال تھا کہ وہ کوئی جھوٹ نہیں بول رہے تھے۔ وہ کہنا یہ چاہ رہے تھے کہ یہ ڈیل جنرل مشرف اور سعودی حکمرانوں کے درمیان ہوئی تھی جو کہ پانچ سال کے لیے تھی۔ یہ ڈیل نواز شریف اور جنرل مشرف کے درمیان نہیں تھی۔

میں نے ان سے بڑے ادب سے کہا کہ حضور اب آپ یہ بات پاکستان میں کس کس کو کیسے اور کن لفظوں میں سمجھاتے رہیں گے کہ یہ ڈیل جنرل مشرف اور سعودیوں کے درمیان تھی اور نواز شریف کو اس کی خبر آج آٹھ سال بعد لندن میں بیٹھ کر پہلی دفعہ ہوئی تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ سرائیکی کے خوبصورت شاعر ظفر اقبال کا شعر شاید اسی موقع کے لیے کہا گیا تھا کہ

جھوٹ بولا ہے تو قائم بھی اس پہ رہو ظفر
آدمی کو صاحب کردار ہونا چاہیے۔

میں نے کہا کہ صاحب! اگر آٹھ سال تک یہ جھوٹ بولا تھا تو کم از کم آٹھ گھنٹے بھی اس جھوٹ پر قائم رہتے۔ کیا ضرورت آن پڑی تھی کہ آپ خود بیٹھ کر اس کا اعتراف کریں کہ ڈیل پانچ سال کے لیے تھی۔

مجھے کہاں سے اصل پتہ تھا۔ نواز شریف کے حامیوں کا ابھی بھی خیال تھا کہ اسلام آباد ائیرپورٹ پر پاکستان نواز شریف کا استقبال کرنے کے لیے امڈ آئے گا۔ [illegible] ہونے والا تھا۔

نواز شریف نے خود بیٹھ کر ان صحافیوں کی فہرست بنائی تھی جنہوں نے ان کے ساتھ اس جہاز میں سفر کرنا تھا جس میں وہ اسلام آباد واپس آنے والے تھے۔ کسی صحافی کو کوئی پتہ نہیں تھا کہ کس جہاز سے میاں صاحب سفر کریں گے۔ ہم صحافیوں کو کہا گیا کہ ہم ہیتھرو ائیرپورٹ پہنچ جائیں۔ میں اور اے آر وائی چینل کے ارشد شریف اکٹھے ائیرپورٹ پہنچے۔ ہم دونوں نے اسی جہاز میں سفر کرنا تھا جس میں دونوں میاں برادران نے جانا تھا۔ ہوائی اڈے پر بڑا جوش و خروش تھا۔

غلام مصطفیٰ کھر بھی پاکستان سے خصوصی طور پر لندن پہنچے ہوئے تھے۔ ان کا وہاں آنے کا ایک ہی مقصد تھا کہ دنیا بھر کے کیمرے وہاں اکٹھے ہوں گے اور ٹی وی سکرین کے کسی کونے کھدرے میں میاں صاحب کے پیچھے ان کی شکل بھی نظر آ جائے گی۔ مجھے بڑی حیرانی ہو رہی تھی کہ یہ وہی غلام مصطفیٰ کھر کی بیوی تہمینہ درانی سے شہباز شریف نے شادی کی تھی اور آج کھر صاحب اپنی سابقہ بیوی کے نئے شوہر کو لندن سے اسلام آباد لانے کے لیے پہنچے ہوئے تھے۔ جس غیرت اور عزت کا مظاہرہ کھر

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

صاحب [illegible] سے ہم [illegible] ہوں کے ہر گزرتے لمحے [illegible] گئے تھے۔ [illegible]
[illegible] [illegible] کے لیے [illegible] جانے [illegible]
شہباز شریف کے لیے [illegible] گاڑی میں اگلی سیٹ پر ایک گاڑی ان کے ساتھ کر دی۔

مصطفیٰ کھر وہاں ایک بھنگڑا کر رہے تھے جیسے وہ ذوالفقار علی بھٹو لندن آ گئے ہوں جا سکتے تھے جیسے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے وہ نواز شریف کو ضرور لندن سے پاکستان لے جائیں گے۔ وہ ذوالفقار علی بھٹو کو جنرل ضیاء جیسے ڈکٹیٹر کے ہاتھوں پھانسی لگنے سے اس لیے نہیں بچا سکے تھے کہ انہیں اپنی جان عزیز تھی۔ لیکن لگتا تھا کہ اب کی دفعہ وہ ضرور نواز شریف کو جنرل مشرف کے ہاتھوں بچا کر ضرور پاکستان لے جائیں گے۔

مجھے مصطفیٰ کھر کی ہیتھرو ایئرپورٹ پر حرکتیں دیکھ کر بڑی ہنسی آ رہی تھی کہ ستر سال کی عمر میں بھی موصوف ایک بوڑھی نائیکہ کی طرح اپنے جوان عاشقوں سے تھوڑی سی توجہ لینے میں مصروف تھے۔ مصطفیٰ کھر سے زیادہ مجھے نواز شریف اور شہباز شریف کی عقل پر ہنسی آ رہی تھی جنہوں نے بغیر سوچے اور دم کے اس کاغذی شیر کو اپنے ساتھ جہاز میں لے جانے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔

وقت کیسے بدلتا ہے۔ مجھے یاد آیا کہ ایسے ہی جب اپریل 2004ء میں آصف زرداری دبئی سے لاہور کے ایئرپورٹ پر صحافیوں کے جھرمٹ میں اترے تھے تو جو شخص سب سے پہلے زرداری صاحب کے لاہور میں واقع گھر پر ان کی پریس کانفرنس میں پیچھے کھڑے ہونے کے لیے پہنچا تھا وہ اور کوئی نہیں مصطفیٰ کھر ہی تھے۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر کھر صاحب کو جلاوطنی سے واپس آنے والے ہر لیڈر سے کیوں محبت ہو جاتی ہے کہ وہ بھاگ کر ان کی پریس کانفرنس کے پیچھے کھڑے ہو جاتے یا پھر کیمروں کے آگے آنے کا ایک نیا سیاسی ڈرامہ تھا جو ستر سال کی عمر میں کوٹ ادو کی دھرتی کا یہ سپوت ہی کر سکتا تھا۔

میں شہباز شریف اور مصطفیٰ کھر کو ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ہیتھرو ایئرپورٹ پر پہنچے دیکھ کر یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ تہمینہ درانی نے مصطفیٰ کھر کو چھوڑ کر شہباز شریف سے کیوں شادی کر لی تھی یا پھر شاید لگتا تھا کہ تہمینہ درانی بھی سیاستدانوں کے ساتھ رہتے ہوئے یہ سیکھ گئی تھی کہ ہر گھڑی اور شخص کو چڑھتے سورج کو سلام کرنا چاہیے۔ مصطفیٰ کھر کا سیاسی سورج کب کا ختم ہو چکا تھا اور شہباز شریف کا ابھی باقی تھا۔

یہ [illegible] کا فیصلہ [illegible] صاحب شہباز شریف اور مصطفیٰ کھر [illegible]
[illegible] سے پہلے [illegible] کر رہے تھے۔
لندن ایئرپورٹ پر ہمیں ابھی تک نہیں بتایا گیا تھا کہ ہم سے [illegible]
گیا تھا۔

کہانی میں [illegible] ابھی تک موجود تھا۔

ہمیں پتہ نہیں تھا کہ اب اصل سرپرائز شروع ہونے والے ہیں۔ کہانی میں پہلا موڑ اس وقت آیا جب ہمیں کہا گیا کہ آپ لوگ پی آئی اے کے کاؤنٹر پر جا کر اپنے بورڈنگ کارڈ لیں۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ نواز شریف پی آئی اے کی فلائٹ سے اسلام آباد کا سفر کریں گے۔ سب کو اس بات کا خوف تھا کہ ممکن ہے کہ نواز شریف کا طیارہ اسلام آباد نہ اترنے دیا جائے اور اس کا رخ پشاور یا کسی اور موڑ دیا جائے اور وہاں سے انہیں سعودی عرب بھیج دیا جائے۔

ہم صحافیوں کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر اس فیصلے کے پیچھے کیا وجہ تھی کہ نواز شریف اتنا بڑا رسک لے رہے تھے۔ میں نے ارشد شریف سے کہا کہ میرے ذہن میں نواز شریف کے فیصلے کی ایک ہی وجہ آتی ہے کہ وہ جنرل مشرف پر ایک نفسیاتی وار کر رہے ہیں۔ نواز شریف کو پتہ تھا کہ جنرل مشرف ان کے طیارے کا رخ کسی اور سمت میں نہیں موڑیں گے۔ جنرل مشرف نے پاکستان میں مارشل لاء اس طیارے پر لگایا تھا کہ سری لنکا سے کراچی آنے والی پی آئی اے کی فلائٹ کو نواز شریف نے نہیں اترنے دیا تھا۔ اگر پٹرول اور گزرتے تو شاید وہ طیارہ کریش کر جاتا۔ آج اگر نواز شریف کا طیارہ موڑا گیا تو جنرل مشرف پر وہی الزام لگ سکتا ہے جو نواز شریف پر لگا کر انہیں ملک بدر کیا گیا تھا۔ یوں جنرل مشرف بھی یہ رسک نہیں لیں گے کہ پی آئی اے کی پرواز کا رخ کسی اور شہر موڑ دیا جائے اور جس طیارے پر انہوں نے یہ مارشل لاء لگایا تھا اسی کا جواز ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔

جب ہم اسلام آباد ایئرپورٹ پر اترے تو میں ارشد شریف کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور کہا کہ نواز شریف نے جنرل مشرف کا ذہن ٹھیک پڑھا تھا کہ طیارے کو کم از کم اسلام آباد تو ضرور اترنے دیا جائے گا اس کے بعد جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

اسلام آباد روانگی سے قبل لندن ایئرپورٹ پر جب میں اور ارشد شریف پی آئی اے کا بورڈنگ

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels.blogspot.com!!

چھوڑ کے کر جہاز کی طرف جا رہے تھے تو میں نے اپنے آگے کچھ فاصلے پر ایک بھیڑ دیکھی۔ میں آگے گیا تو شہباز شریف کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اسحاق ڈار ان کے ساتھ کھڑے تھے۔ میں [illegible] حیران ہوئے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ نواز شریف شہباز شریف کو وہیں چھوڑ کر جہاز کی طرف چلے گئے تھے۔

کہانی میں ایک اور موڑ آ چکا تھا۔ ایک اور سرپرائز ہمارا انتظار کر رہا تھا۔

میں ابھی پوری بات سمجھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ شہباز شریف نے مجھے کہا کہ کلاسرا صاحب آپ بھی بھائی صاحب کو کہہ دیں کہ وہ میری مدد کریں اور مجھے ساتھ لے کر جائیں۔

میں نے پوچھا ہوا کیا ہے؟

شہباز شریف صاحب بولے کہ میاں صاحب نے مجھے اپنے ساتھ پاکستان لے کر جانے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ اکیلے جائیں گے۔ انہوں نے یہ حکم دیا ہے کہ میں یہیں سے واپس لوٹ جاؤں۔

مجھے ایک لمحے میں پوری کہانی سمجھ آ گئی۔ یہ ایک اور سیاسی حکمت عملی کا نتیجہ تھا اور میرا خیال ہے یہاں کا درست فیصلہ تھا کہ دونوں کو اکٹھے پاکستان واپس نہیں جانا چاہیے۔ اگر دونوں بھائیوں کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا جاتا تو بھی پارٹی کو بڑا نقصان ہوتا اور اگر وہاں سے انہیں جدہ بھیجا جاتا تو بھی ان کی پارٹی ایسے اہم سیاسی موقع پر اپنے لیڈروں سے محروم ہو جاتی۔ اس لیے یہ سوچا گیا تھا کہ صرف نواز شریف پاکستان جائیں گے تاکہ اگر وہ جیل جاتے ہیں یا پھر جدہ تو کم از کم شہباز شریف لندن سے اپنی پارٹی کو چلا سکتے ہیں۔

اس پر مجھے کوئی شک نہیں تھا کہ ان دونوں بھائیوں نے یہ فیصلہ ایک دو دن پہلے ہی کر لیا تھا لیکن ایئرپورٹ پر جہاز کی روانگی سے کچھ دیر پہلے شہباز شریف کو روک کر منع کر دینا اسی ڈرامے کے ایک ایسے پلاٹ کا حصہ لگ رہا تھا جس میں ہر ایک کی توقع کے برخلاف کہانی میں ایک ایسا موڑ آ گیا تھا جسے ہضم کرنا مشکل لگ رہا تھا۔ میڈیا اور پارٹی کے لیڈروں کو یہ تاثر دیا گیا کہ نواز شریف نے آخری لمحے میں شہباز شریف کو اپنے ساتھ پاکستان جانے سے روک دیا تھا جبکہ ایک اندھے کو بھی نظر آ رہا تھا کہ یہ محض ایک ڈرامے کا سکرپٹ تھا جس پر دونوں بھائی ہالی ووڈ کے آسکر ایوارڈ یافتہ اداکاروں کی طرح پوری

ایمانداری سے عمل کر رہے تھے۔

میرے بس میں ہوتا تو میں اس موقع پر شہباز شریف کو [illegible]

پہلی وقت سے ہم لوگوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہے تھے کہ میاں صاحب نے انہیں آخری لمحے منع کر کے ان کے ساتھ زیادتی کی ہے۔

جب ہم جہاز کے اندر پہنچے تو وہاں ایک اور سرپرائز ہمارا انتظار کر رہا تھا۔

جہاز کے چلنے میں خاصی تاخیر ہو چکی تھی۔ اچانک پتہ چلا کہ کسی مسافر کو دل کا دورہ پڑا ہے۔

میں اور ارشد شریف جہاز کی پچھلی سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ میں نے ارشد سے کہا کہ [illegible] ختم ہوں گے۔ ارشد بڑا حیران ہوا اور بولا کہ اس میں ڈرامے کی کیا بات ہے ایک شخص کو دل کا دورہ پڑا ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ یہ ڈرامہ ہے۔

میں نے کہا بھائی جان! آپ ایک بات پر غور نہیں کر رہے کہ جہاز کی روانگی میں جان بوجھ کر تاخیر کی جا رہی ہے۔ اگر یہ جہاز اپنے مقررہ وقت پر یہاں سے روانہ ہوتا تو صبح آٹھ بجے سے پہلے اسلام آباد ایئرپورٹ پر اتر جائے گا۔ اب آپ مجھے بتائیں کہ صبح آٹھ بجے نواز شریف کو لینے کے لیے ایئرپورٹ پر کتنے لوگ موجود ہوں گے۔ لہذا اب یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ جہاز یہاں سے کم از کم ایک دو گھنٹے لیٹ روانہ ہو تاکہ اسلام آباد ایئرپورٹ پر اترنے تک [illegible] نواز شریف کے لیڈر اور پارٹی ورکرز ایئرپورٹ پہنچ سکیں۔ اگر نواز شریف کو [illegible] جانے کی کوشش کی جائے تو اس کے لیڈر اور ورکرز اسلام آباد ایئرپورٹ میں داخل ہو کر یہ کوشش ناکام بنا دیں۔

ناشتے کی خبر کے بعد جہاز وہاں سے روانہ ہوا۔ [illegible] جہاز کے پچھلے حصے میں آ گئے۔ وہ خاصے پرجوش اور خوش تھے۔ وہ پاکستان [illegible] میاں صاحب کے ساتھ واپس جا رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ [illegible] کے بعد وہ [illegible] کے علاوہ اسلام آباد بیٹھے ہوئے حکمرانوں کو بھی پریشان کر رہا ہے۔ میں نے کہا کہ [illegible] اس شخص کو جس نے بیٹھ کر یہ پورا سکرپٹ لکھا تھا اور جو شروع سے اب تک کے حالات کے مطابق ان کی حکمت عملی بہت اچھی جا رہی ہے۔

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

جہاز میں پوری رات کوئی نہیں سویا سوائے میاں نواز شریف صاحب کے جس پر حیران ہوا جا سکتا ہے کہ آخر ایک شخص کیسے اتنے آرام سے جہاز میں سو سکتا ہے خصوصاً جب یہ پتہ نہ ہو کہ اس کی اگلی منزل اسلام آباد ہے، اٹک کا قلعہ یا پھر جدہ کا سرور پیلس۔ میرا خیال تھا کہ کوئی شخص نیند کی وادی میں تبھی کھو سکتا تھا اگر اس کے ذہن پر غیر یقینی صورتحال چھائی ہوئی ہو۔ نواز شریف نے ہم سب کو غلط ثابت کر دیا تھا۔ وہ مزے سے بزنس کلاس میں اپنی نیند پوری کر رہے تھے۔

○○○

سات گھنٹے کی طویل مسافت کے بعد اندیشوں اور انجانے خوف میں گھرے اس طیارے کے مسافر اب اسلام آباد کی فضاؤں میں صبح سویرے پہنچ گئے تھے۔ خبر آئی کہ نواز شریف صاحب جاگ گئے ہیں۔ منہ ہاتھ دھو کر وہ تھوڑی دیر میں جہاز کی پچھلی سائیڈ میں آنے والے ہیں۔ جہاز میں ایک عجیب سی بے چینی اور خوف کا عنصر نمایاں تھا۔ کسی کو کوئی اندازہ نہیں تھا کہ اسلام آباد ایئرپورٹ پر نواز شریف کا کس طرح کا استقبال ہونے والا تھا۔ نواز شریف اور ان کے ساتھیوں کے علاوہ صحافی بھی اچھے خاصے نروس اور کسی حد تک خوفزدہ تھے۔ ہمارے ذہنوں میں لاہور ایئرپورٹ پر پرویز الٰہی کی پولیس کے ہاتھوں شہباز شریف اور آصف علی زرداری کے ساتھ آنے والے صحافیوں کی درگت کے مناظر ابھی تازہ تھے۔ میرا خیال تھا کہ جنرل مشرف بھی ان صحافیوں کو یقیناً سزا دینے میں دلچسپی رکھتے ہوں گے جو نواز شریف کے ساتھ لندن سے آ رہے تھے۔ تاہم نواز شریف نے بھی بڑی عقلمندی کی تھی کہ وہ غیر ملکی میڈیا کے لوگوں کو اپنے ساتھ لائے تھے تاکہ ان کی نظروں کے سامنے ہی سب کچھ ہو۔

جب جہاز اسلام آباد کی فضاؤں میں داخل ہوا تو نواز شریف آ کر جہاز کی درمیانی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ ان کے اردگرد ان کی پارٹی کے لیڈر اور صحافی کھڑے ہو گئے۔ شدید نعرے بازی شروع ہو گئی۔ اتنی دیر میں نواز شریف نے کسی سے موبائل فون لیا اور مختلف نمبر گھمانے لگے۔ کسی نے ان کے کان میں سرگوشی کی کہ وہ اسلام آباد کی طرف آنے والے اپنے لیڈروں کے نمبر ملا رہے ہیں تاکہ ان سے پوچھا جائے کہ پیچھے کتنا ہجوم ان کا استقبال کرنے کے لیے جمع ہو چکا ہے۔ ہر کال ملانے کے بعد میاں صاحب کے چہرے کا رنگ فق ہو جاتا جب اس لیڈر کا موبائل نمبر انہیں بند ملتا۔ آخر دس نمبر ملا کر

کرنے کے بعد میاں صاحب نے اپنا موبائل فون اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔

نواز شریف کی کہانی اسلام آباد کی فضاؤں میں ہی ختم ہو چکی تھی۔ انہیں پتہ چل گیا تھا کہ جو لوگ نکلے تھے انہیں ایئرپورٹ پر ریسیو کرنے کے لیے اب تک کوئی نہیں پہنچا تھا۔

جب جہاز اسلام آباد کے رن وے پر اترا تو ہمیں دور سے ہی نظر آ گیا تھا کہ اسلام آباد اور پنجاب پولیس کے کمانڈوز کے نرغے میں تھا جہاں کسی چڑیا کو بھی پر مارنے کی اجازت نہیں تھی۔ میں اور رؤف کلاسرا اندازے لگانے لگے کہ وہ دور کھڑے کون سے جہاز میں سعودی شہزادہ اس جہاز سے نواز شریف کے اترنے کا انتظار کر رہا تھا۔ جب پی آئی اے کا جہاز اپنی مقررہ جگہ پر جا کر رکا تو ہمیں چاروں طرف کالی وردیوں میں ملبوس پنجاب پولیس کے کمانڈوز ہی کمانڈوز نظر آئے۔

میں نے ایک بڑی عجیب بات نوٹ کی کہ اس وقت صحافیوں کی اکثریت جذباتی طور پر نواز شریف صاحب کے ساتھ مل چکی تھی۔ ایک ٹیلی ویژن چینل کا مشہور اینکر تو اس وقت باقاعدہ میاں صاحب کا باڈی گارڈ بن گیا تھا۔ یہی صاحب شوکت عزیز کے بھی سب سے قریبی دوست تھے۔ وہ اس وقت میاں صاحب اور ان کی پارٹی کے لیڈروں کو ہدایات دینے میں مصروف تھے کہ اگر پولیس کے کمانڈوز جہاز میں زبردستی داخل ہوتے ہیں تو انہوں نے کیسے میاں صاحب کی حفاظت کرنی ہے۔ کس نے کہاں پوزیشن لینی ہے۔ اس وقت وہ ایک اینکر پرسن سے زیادہ ایک تربیت یافتہ کمانڈو یا آفیسر لگ رہے تھے جو ہر قیمت پر میاں صاحب کو پولیس کے نرغے سے نکال کر ایئرپورٹ سے باہر لے جانے پر تلے ہوئے تھے۔

جہاز کے دوسرے عام مسافروں کو جانے کی اجازت دے دی گئی تھی اور جہاز میں صرف وہی لوگ تھے جو نواز شریف صاحب کے ساتھ لندن سے آئے تھے اور ان میں اکثریت صحافیوں کی تھی۔ ہم صحافیوں کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ جنرل مشرف نے نواز شریف سے کیا سلوک کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جہاز کے اندر نواز شریف کے ساتھی بھی سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ جنرل مشرف جو جواب دے چکے تھے کہ نواز شریف کو وہ ملک میں رہنے نہیں دیں گے، اب وہ کیا کرتے ہیں۔ نواز شریف کو دھکے دے کر واپس بھیجا جائے گا یا ان سب کو اڈیالہ جیل میں بند کیا جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ میاں صاحب کو گرفتار کر کے نیب کے مختلف مقدمات میں اٹک جیل بھجوایا جائے گا۔ نواز شریف جیل جانے کے لیے تیار تھے کیونکہ اس میں انہیں اپنی سیاسی بقا نظر آتی تھی اور وہ سب

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

جو کہ وہ اس وقت سے چاہتے تھے جہاں کی پارٹی کے لیڈروں اور کارکنوں کے ایئرپورٹ پہنچنے [illegible] وجہ سے اس کا انکار کر دی تھی۔

آدھے گھنٹے سے زیادہ گزر گیا تھا۔ جہاز کے دروازے ابھی تک بند تھے۔ ہم صحافی جہاز کی چھوٹی کھڑکیوں سے باہر دیکھنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے تاکہ اندازہ کیا جا سکے کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ اچانک ارشد تنویر جو نواز شریف کے ساتھ لندن سے آ رہے تھے۔ انہوں نے جیسے جہاز کا کنٹرول اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ وہ اس وقت ایک ایسی ولن کے روپ میں لگ رہے تھے جو طیارے کے استقبال کے لیے آئے ہوئے ایئرپورٹ والوں کے ساتھ [illegible] اور کھانے پینے کے معاملات پر مذاکرات میں مصروف ہو۔ وہ کبھی جہاز کے دروازے پر جاتے وہاں کھڑے دو تین پولیس آفیسروں سے باتیں کرتے اور پھر دوڑ کر آ کر میاں صاحب کے کان میں گھس جاتے اور پھر الٹے قدموں جا کر پولیس والوں سے مذاکرات کرتے۔ یوں وہ [illegible] کے پائلٹ اور ایئرپورٹ والوں کے درمیان خاصی دیر مذاکرات چلتے رہے۔

ارشد تنویر ایک عجیب و غریب خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ مصنوعی [illegible] کی طرح وہ بھی اس کوشش میں تھے کہ کوئی ٹی وی کیمرہ ان کی طرف زیادہ سے زیادہ ہو اور وہ نواز شریف کے ساتھ [illegible] میں رہے تھے۔ انہیں اس چیز پر بھی پورا اعتماد تھا کہ وہ میاں صاحب کے پاس اتنی اہمیت رکھتے تھے۔ کسی میں اتنی مجال کہ پاکستان میں ان کی بات نہ سنے۔ اس وقت انہیں جنرل مشرف ایک [illegible] لگ رہے تھے۔ وہ پچھلے آٹھ سالوں میں جنرل صاحب کے ساتھ ہونے والی اپنی کئی ملاقاتوں کو بھول گئے تھے۔ نواز شریف بھی ارشد تنویر اور جنرل مشرف کے درمیان ہونے والی ملاقاتوں کو یاد نہیں کرنا چاہتے تھے کیونکہ اس وقت انہیں بھی ایک ایسے ہی کردار کی ضرورت تھی۔

آخر کار [illegible] بعد جب ساری [illegible] کے بعد جہاز کا دروازہ کھول دیا گیا۔ اسلام آباد ایئرپورٹ کے سیکیورٹی کے انچارج [illegible] اپنے ایک دو سینئر افسران کے ساتھ جہاز میں آئے۔ ایک ایس پی نے میاں صاحب کو مخاطب کیا جس سے ماحول میں [illegible] تک کم ہوا۔ اس ایک جملے سے سب کو یہ پیغام مل گیا کہ باہر کھڑی ہوئی پولیس کم از کم ان میں سے کسی پر تشدد کرنے کے موڈ میں نہیں ہے۔ پولیس والے چاہتے تھے کہ میاں صاحب اکیلے ان کے ساتھ آ

ان کے بڑے بھائی اور دیگر قریبی [illegible] افراد جہاز سے اترتے چلے گئے۔ میاں صاحب سے بھی کئی [illegible] انہیں پتہ تھا کہ صحافیوں کی موجودگی میں پولیس کوئی بھی ایکشن لینے سے گریز کرے گی۔ میاں نے اپنی سیٹ سے اٹھنے سے انکار کر دیا [illegible] کہ آپ کو واپس کر دیں گے۔ میاں صاحب نے [illegible] بات کی۔ جہاز کے باہر ایک دفعہ پھر [illegible] ہو رہا تھا۔ لگ رہا تھا کہ پولیس افسران بھی ایک حد تک تحمل سے بات کرنے کے لیے تیار تھے۔

میں نے ارشد شریف سے ایک دفعہ پھر کہا کہ میاں صاحب کو جہاز سے نکلنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ وہ اصل ابھی بھی اس کوشش میں ہیں کہ [illegible] اپنے ساتھ [illegible] ایئرپورٹ پہنچ جاتے۔

جہاز کو وہاں رکے ایک گھنٹے سے زیادہ ہو چکا تھا۔ مذاکرات ابھی بھی چل رہے تھے۔ آخر یہ ہوا کہ میاں صاحب صحافیوں کے ساتھ بس میں بیٹھ کر وی آئی پی لاؤنج میں پہنچیں گے۔

میں اور ارشد شریف جہاز کی سیڑھیوں سے نیچے اتر آئے۔ اسلام آباد ایئرپورٹ پر [illegible] ایک عجیب سا [illegible] ہم پولیس کے نرغے میں ہیں۔ [illegible] بھی آ سکتا ہے۔

میں اور ارشد [illegible] سیڑھیوں میں [illegible] شریف کے ساتھ ہی میاں اترنے کے بعد [illegible] ہے۔

جب نواز شریف جہاز کی سیڑھیوں پر [illegible] نواز شریف کی اسلام آباد ایئرپورٹ پر [illegible] ٹی وی کیمرے بار بار [illegible] نواز شریف کو وہ تمام [illegible]

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

تھا ان جاتی دلیل کا اعتراف کر کے جاتے ہیں وہ اس سے مقاصد حاصل ہو جائے گا۔

ارشد شریف نے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر بولا کہ رؤف! تم صحافت چھوڑ کر سیاست جوائن کر لو۔ میرا خیال ہے اب تک پی ایم ایل نواز کے کسی بھی لیڈر کو نہیں آیا ہوگا جو تم نے نواز شریف کو یہ مشورہ دیا ہے۔

میں نے ارشد سے کہا کہ تم دیکھ لینا نواز شریف شکرانے کا یہ سجدہ نہیں کریں گے کیونکہ دوسرے میں نواز شریف کے اس شکرانے کے سجدے کو ایک سیاستدان کی آنکھ سے نہیں ایک صحافی کی آنکھ سے دیکھ رہا ہوں کہ اس کا عوام پر کیا اثر پڑے گا۔

ارشد شریف نے مجھے کہا کہ تم جا کر یہ بات نواز شریف کو کیوں نہیں کہتے۔

میں نے کہا میرے پیارے! میں تمہیں پہلے کہہ چکا ہوں میں صحافی ہوں کوئی سیاسی ورکر نہیں کہ لیڈروں کو جا کر مشورے دیتا پھروں۔ میاں صاحب میں اتنی سمجھ بوجھ خود ہونی چاہیے کہ جب وہ آٹھ سال بعد وطن واپس لوٹ رہے ہیں تو انہیں جہاز کی سیڑھیوں سے اترتے ہی پہلا کام کیا کرنا چاہیے۔

میں اور ارشد شریف نواز شریف کا ایک ایک قدم گن رہے تھے۔ اب ہم دونوں کی دلچسپی اس بات میں زیادہ ہو چکی تھی کہ نواز شریف نیچے اترتے ہی سجدہ کریں گے یا نہیں کہ ہم ایک لمحے کے لیے اپنے اردگرد کا سارا ماحول بھول گئے تھے۔

آخر نواز شریف آخری سیڑھی سے نیچے اترے۔ ان کے اردگرد ان کی پارٹی کے جیالے انہیں کسی متوقع کمانڈو ایکشن سے بچانے کے لیے تیار تھے۔

نواز شریف نے وہ موقع گنوا دیا۔ میرا خیال تھا کہ انہیں خدا کے آگے جھک کر اس مٹی کو چومنا چاہیے تھا۔ اس کا انہیں بے پناہ سیاسی فائدہ ہوتا لیکن شاید جس نے ان کی لندن سے اسلام آباد واپسی کا سکرپٹ لکھا تھا اس میں وہ یہ سین ڈالنا بھول گیا تھا یا یہ اس کی ترجیح میں نہیں تھا۔ نواز شریف نے اپنی دھرتی ماں کو گلے نہیں لگایا اور دھرتی ماں بھی شاید اس سے روٹھ چکی تھی کہ ڈیڑھ گھنٹے بعد نواز شریف کو پنجاب پولیس کے کمانڈوز تقریباً گھسیٹتے ہوئے وی آئی پی لاؤنج سے ایک پرانی بس میں بٹھا کر شہزادے مقرن کے جہاز میں بٹھا چکے تھے۔

جہاز سے اترنے کے بعد ایک شخص آیا جس نے بتایا کہ نواز شریف ائیر پورٹ لاؤنج میں جائیں گے جس میں سارے صحافی جا سکتے تھے۔ وی آئی پی لاؤنج کے کمرے میں بیٹھیں گے جو ان کے لیے الاٹ کی گئی تھی۔ نواز شریف اور ان کے ساتھیوں کو یہ خطرہ نظر آ رہا تھا کہ اگر وہ اس چھوٹے کمرے میں بیٹھ گئے تو یہ ممکن تھا کہ انہیں ایک ایک کر کے ائیر پورٹ کے کسی کمرے میں لے جا کر ایک ایک کر کے جہاز میں بٹھا کر جدہ لے جائیں گے۔ تھوڑے سے بحث مباحثے کے بعد نواز شریف صحافیوں والی بس میں آ کر بیٹھ گئے۔

اب تک کی کارروائی سے یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ نواز شریف اپنی بازی ہار چکے تھے۔ انہیں لندن میں جس انقلاب کی کہانیاں سنائی گئی تھیں وہ اسلام آباد ایئر پورٹ پر اترنے سے پہلے ہی ختم ہو چکی تھیں۔ اسلام آباد ایئر پورٹ پر انہیں لینے کے لیے پارٹی کا ایک لیڈر یا ورکر تک موجود نہیں تھا۔ پارٹی کے تمام لیڈران اور ورکرز ایک رات پہلے ہی پولیس کو بلا کر گرفتاریاں دے چکے تھے۔ وہ نواز شریف کے لیے ڈنڈے کھا کر ایئر پورٹ جانے کے لیے تیار نہیں تھے۔

اب نواز شریف کا زیادہ تر انحصار اس پاکستانی اور غیر ملکی میڈیا پر تھا جسے وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ بازی پلٹتے دیکھ کر ان کے اپنے قریبی ساتھیوں کے چہروں پر بھی خوف و ہراس کی نشانیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ اگر کسی شخص کا حوصلہ بلند تھا تو وہ نواز شریف کے ساتھ آئے ہوئے لندن کے بیرسٹر امجد ملک تھے۔ نواز شریف کے لندن کے آفس کے ساتھی محمد افضال بھی نواز شریف کی حفاظت کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر لیے ہوئے تھے۔ بیرسٹر امجد ملک جن کا تعلق فیصل آباد سے ہے وہ جہاز کے اندر بھی خاصی دیر تک امیگریشن افسران سے قانونی معاملات پر جھگڑتے رہے تھے۔ امجد ملک کا اصل امتحان اب شروع ہونے والا تھا جب وی آئی پی لاؤنج میں نواز شریف اور جنرل مشرف کے بھیجے ہوئے ایجنٹس کے درمیان آخری لڑائی شروع ہونے والی تھی۔

وی آئی پی لاؤنج میں پہنچتے ہی ہمیں یکدم محسوس ہوا کہ شاید کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ ہم لندن سے ایک عام مسافر فلائیٹ میں ابھی ابھی پہنچے ہیں۔ ہم کوئی بڑے وی آئی پی لوگ ہیں جن کے لیے جوس اور چائے پانی لایا جا رہا ہے۔ وہاں کچھ اس طرح کا ماحول بنا دیا گیا تھا کہ یکدم سب لوگ ریلیکس ہو گئے۔ کئی گھنٹوں پر محیط اندیشے اور خوف اچانک ختم ہو گئے تھے۔ صحافی بڑے ریلیکس ہو کر صوفوں پر بیٹھ

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

مجھے یہی نے ... [illegible] ... اپ تھا۔

نواز شریف بھی احمد ملک اور دو ... [illegible] ... کے ساتھ ایک صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔ ... [illegible] ... پیش کیا گیا جس سے ماحول میں چھائی ہوئی کشیدگی بڑی حد تک دور ہو گئی تھی۔

مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا تھا۔ یہ حکومت کی کیا نئی حکمت عملی تھی۔ کیا نواز شریف کو ایئرپورٹ سے نکلنے کی اجازت دے دی جائے گی یا پھر کسی مناسب وقت کا انتظار کیا جا رہا تھا کہ نواز شریف پر کمانڈو ایکشن کر کے انہیں ایئرپورٹ پر پکڑ کے ایک اور جہاز سے جدہ روانہ کر دیا جائے۔ وہاں کا ماحول اب انتہائی پرسکون ہو چکا تھا کہ وہاں تمام ٹی وی کیمرے بند تھے اور صحافی تقریباً فارغ ہو کر ... [illegible] ... ہو گئے تھے۔

میں نے ارشد شریف سے کہا کہ یار یہ معاملہ جتنا پرسکون لگ رہا ہے یہ اتنا ہے نہیں۔ یہ ساری خاموشی اور سکون کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہے۔

ارشد شریف نے میری طرف دیکھا اور روایتی انداز میں مسکرایا۔ یہ ایک ایسی مسکراہٹ تھی جسے ہم دوست کوئی بھی معنی اپنے مطلب کے جب چاہیں پہنا سکتے تھے۔

آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ ہم سب کے ذہن میں تھا۔ نواز شریف سے ایک دفعہ پھر امیگریشن سٹاف نے تکرار شروع کر دی کہ وہ پاسپورٹ ان کے حوالے کریں تاکہ ان کی امیگریشن کرائی جا سکے۔ اب کی دفعہ نواز شریف امیگریشن کرانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ کسی نے ان کے کان میں یہ بات ڈال دی تھی کہ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ انہیں ایئرپورٹ سے باہر جانے دیا جائے۔ اگر وہ ایئرپورٹ سے نکلنے میں کامیاب بھی ہو گئے تو باہر سڑک پر ایک ساتھی بھی نہیں تھا جو ان کا استقبال کرتا۔ حکومت امیگریشن کرا کر دراصل ان کا پاسپورٹ قبضے میں لینا چاہ رہی تھی تاکہ اس پاسپورٹ کو سپریم کورٹ کے سامنے ثبوت کے طور پر پیش کیا جائے کہ نواز شریف پاکستان میں داخل ہوئے تھے اور پھر اپنی مرضی سے ہی وہ جدہ چلے گئے تھے لہٰذا ان پر کسی طرح کا توہین عدالت کا کیس نہیں چل سکتا تھا۔

نواز شریف اور ان کے ساتھیوں کو یہ کہانی سمجھ آ رہی تھی لہٰذا ان کے لیے سب سے اہم بات یہ بن گئی تھی کہ کسی طرح نواز شریف کا پاسپورٹ امیگریشن والوں کے ہاتھ نہ لگے۔

اتنی دیر میں امیگریشن والوں نے صحافیوں سے کہنا شروع کیا کہ ... [illegible] ... امیگریشن ... [illegible] ... نواز شریف کی ... [illegible] ... بہر حال چند لوگ پھر بھی امیگریشن کرانے ... شروع ہو گئے۔ صحافیوں سے کہا گیا کہ ... [illegible] ... جائیں لیکن ... اپنے پاسپورٹ پر امیگریشن کی مہر لگوا لیں۔

فضا میں ایک دفعہ پھر تناؤ کی کیفیت طاری تھی۔ اس دفعہ میجر ریٹائرڈ احمد ملک امیگریشن اور دوسرے حکومتی عہدیداروں سے الجھ رہے تھے۔ اتنی دیر میں نیب کے ایک دو افسران وہاں نمودار ہوئے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ نواز شریف کو چند مقدمات میں گرفتار کرنا چاہ رہے ہیں۔ احمد ملک نے ان سے وارنٹ مانگے تو انہوں نے فوراً عدالت کے وارنٹ دکھا دیے۔ اس سے لگتا تھا کہ حکومت نے پوری تیاری کی ہوئی تھی کہ کسی نہ کسی طرح نواز شریف کو اکیلا کر کے صحافیوں اور اپنے ساتھیوں سے جدا کیا جائے تاکہ انہیں جدہ بھیجنے میں آسانی ہو۔

نیب افسران کے وارنٹ دکھانے پر وہاں ایک دفعہ پھر ایک سکون کی سی کیفیت چھا گئی۔ سب نے ایک گہرا سانس لیا کہ چلیں اب نواز شریف کو گرفتار کر کے اٹک قلعے لے جایا جائے گا۔ اس بات کے لیے نواز شریف سمیت ان کی پارٹی کے سارے لیڈر تیار تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اٹک قلعے سے چند دنوں بعد وہ سپریم کورٹ سے نواز شریف کی ضمانت کرا لیں گے۔

ارشد شریف نے اپنے ایک جاننے والے آفیسر سے پوچھا کہ اب آپ لوگوں کا کیا پلان ہے۔ اب آپ لوگ مزید کتنی دیر اس صورتحال کو اس طرح برقرار رکھیں گے۔

وہ آفیسر مسکرایا اور بولا آپ لوگوں کے جانے کا انتظار کیا جا رہا ہے تاکہ کمانڈو ایکشن کر کے نواز شریف کو جہاز پر سوار کرا دیا جائے۔

اس معنی خیز مسکراہٹ نے سب کچھ واضح کر دیا تھا۔ ہم سب لوگوں کے اندازے غلط ثابت ہو رہے تھے۔ ہم صحافیوں کا خیال تھا کہ شاید نواز شریف کو اب کی دفعہ جدہ نہیں بھیجا جائے گا۔ ہمارے اس یقین کے پیچھے تین وجوہات تھیں۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ اگر سعودی عرب نواز شریف کے پاکستان آنے پر راضی نہیں تھا تو وہ لندن میں ہی نواز شریف کو روک سکتے تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ سپریم کورٹ آف پاکستان نے حکومت کو یہ ہدایت دے رکھی تھی کہ وہ اپنے شہریوں کو واپس آنے سے نہیں روک سکتے

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels.blogspot.com!!

تھے۔ تیسری وجہ نواز شریف کا اپنا اعتماد تھا جس کی وجہ سے ہم سب دھوکہ کھا گئے تھے کیونکہ اس سے ہم نے یہ سمجھا کہ شاید اس دفعہ نواز شریف باقاعدہ پلاننگ اور گفت و شنید کے بعد پاکستان جا رہے ہیں۔ وہ شہباز شریف کی طرح کوئی ایڈونچر کرنے نہیں جا رہے تھے لہٰذا بغیر معاملہ طے کیے پاکستان واپس نہیں آ رہے تھے۔ آخر کہیں نہ کہیں سے تو انہیں یہ یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ وہ پاکستان واپس جانے کی تیاری کریں تو ان کے راستے میں رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی۔

نواز شریف لندن میں بار بار یہ بات کہتے تھے کہ انہیں کسی بھی سعودی عہدیدار یا بادشاہ سلامت نے فون کر کے پاکستان جانے سے نہیں روکا ہے۔ ان کے خیال میں یہ پاکستان کا اندرونی معاملہ ہے جس میں سعودی عرب مداخلت کرنے کو تیار نہیں! ایک دو دفعہ تو نواز شریف اس بات پر چڑ سے گئے جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا سعودی عرب نے انہیں پاکستان واپس جانے کی اجازت دے دی ہے۔ نواز شریف نے بڑی برہمی سے سوال کرنے والے اس صحافی کو یہ یاد کرانے کی کوشش کی تھی کہ پاکستان ایک خودمختار ملک ہے اور ہم کیوں بار بار سعودی عرب کو پاکستانی معاملات میں گھسیٹ رہے ہیں۔

جب نواز شریف سوال کرنے پر برہمی کا اظہار کر رہے تھے تو ہم سب چپ رہے ورنہ پوچھا جا سکتا تھا کہ میاں صاحب! سعودی عرب کو پاکستانی معاملات میں مداخلت کرنے کا اختیار تو اس وقت ملا تھا جب انہوں نے آپ کو جنرل مشرف کی جیل سے رہائی دلوائی تھی۔ اس وقت سعودی عرب کی مداخلت کا خیر مقدم کیا گیا تھا لیکن آج بدلتے حالات میں اسی ملک کی مداخلت کو پاکستان کی خودمختاری پر ایک ضرب قرار دیا جا رہا تھا۔

یہ وہ وجوہات تھیں جن کی بنیاد پر ہم میں سے اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ نواز شریف کو جدہ نہیں بھیجا جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ انہیں اٹک جیل لے جایا جائے گا۔

اتنی دیر میں ہم نے دیکھا کہ معاملہ اب امیگریشن اور پی آئی اے کے افسران کے ہاتھوں سے انٹیلی جنس ایجنسیوں کے چند لوگوں کے ہاتھوں میں چلا گیا تھا۔ اب یہ ایجنٹس بے چین نظر آ رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ اوپر سے کہیں یہ پیغام آ گیا تھا کہ اب مزید ڈرامہ کرنے کی ضرورت نہیں! جو کرنا ہے وہ کر گزریں۔

بات چیت اب آہستہ آہستہ تلخی میں بدلتی جا رہی تھی۔ صحافی بھی اپنی سیٹوں پر چوکنے ہو گئے تھے۔ سب کو پتہ چل گیا کہ آخر وہ مرحلہ آن پہنچا ہے جس کے لیے ان سب نے لندن سے اسلام آباد تک کا سفر کیا تھا۔ گفتگو میں تیزی آنے لگی۔ جذبات بھڑکنے لگے۔ اچانک نواز شریف کے گرد انٹیلی جنس افسران نے گھیرا ڈال لیا اور بڑی تیزی سے ان کی پارٹی کے لوگوں کو ان سے علیحدہ کیا۔ وہ تین نے میاں صاحب سے بدتمیزی کرنی شروع کی۔ ایک مرحلے پر وہ بدتمیزی اتنی بڑھ گئی کہ میاں صاحب کا چہرہ غصے سے سرخ ہوا اور انہوں نے تقریباً چلا کر کہا کہ وہ تمام افسر جو ان کے ساتھ یہ سلوک کر رہے ہیں انہیں ایک دن اپنے کیے کی سزا بھگتنا پڑے گی۔

اس دوران میاں صاحب کو دھکے پڑنے شروع ہو گئے تھے۔ ان کی پارٹی کے وہ تین لوگ ابھی بھی میاں صاحب کے قریب رہنے کی کوشش کر رہے تھے کہ انہیں دھکے نہ پڑیں۔ ان میں ان کے لندن کے دفتر کے محمد افضال پیش پیش تھے۔ ہم سب صحافی اکیلے ہو گئے تھے۔ ہمیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ کیا کرنے والے تھے۔ راول لاؤنج میں چیخ و پکار اور شور شرابہ بڑھ گیا تھا۔ انٹیلی جنس افسروں کے ساتھ اب پنجاب پولیس کے کمانڈوز بھی مل گئے تھے۔ محمد افضال کا حال اس وقت سب سے زیادہ برا تھا۔ وہ نواز شریف کے ساتھ ابھی تک چمٹے ہوئے تھے کہ کہیں ان کے ساتھ بدتمیزی نہ ہو۔ اسی دھکم پیل میں ہم نے اچانک ایک گونج دار آواز سنی۔ یہ محمد افضال کی آواز تھی جو زور سے انٹیلی جنس ایجنسیوں کے افسران کے رویے کو دیکھ کر چلاتے ہوئے کہا کہ شرم کرو یہ شخص بھی تمہارا دو دفعہ وزیراعظم رہا ہے۔ تم لوگوں کو اپنے وزیراعظم کے ساتھ یہ سلوک کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔

میں اور ارشد شریف ایک کونے میں کھڑے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ ہم دونوں پر اچانک ڈپریشن کا دورہ پڑا۔ ہم کس طرح کے ملک کے شہری تھے جہاں دو دفعہ وزیراعظم رہنے والے شخص کو انٹیلی جنس ایجنسیوں کے چند لوگ سرعام ذلیل کر رہے تھے۔ وہ شخص جو کبھی اس ملک کے اچھے برے کا مالک تھا آج چند ایجنٹوں کے ہاتھوں گھسیٹا جا رہا تھا اور اسے باتھ روم میں بند کرنے کی کوشش ہو رہی تھی۔ لندن میں بیٹھ کر ہمیں یوں لگتا تھا کہ شاید اب پاکستان بدل گیا ہے، لیکن ہماری آنکھوں کے سامنے جو کچھ ہو رہا تھا اس سے تو یہی محسوس ہو رہا تھا کہ اس ملک میں کچھ بھی نہیں بدلا ہے۔ جنرل مشرف اور نواز شریف کے درمیان 12 اکتوبر کو شروع ہونے والی ذاتی جنگ آٹھ سال بعد بھی اپنی تمام تر قوت

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

اور وحشت کے ساتھ جاری تھی۔ سیاستدان آج بھی اتنے ہی کمزور ہیں جتنے [illegible] تھے۔ ایک فوجی جرنیل کے دونوں سے [illegible] وزیر اعظم سے کہیں کم [illegible] تھا اور اس کی طاقت کا مظاہرہ ساری قوم کے سامنے ہو رہا تھا۔

شور شرابہ جاری [illegible] گیا تھا۔ ہجوم بے قابو ہو رہا تھا۔ میری نظر ایک [illegible] پر [illegible] نواز شریف کے ساتھ یہ سلوک ہوتا دیکھ رہے تھے مگر کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو [illegible] تھے۔ لاؤنج میں نواز شریف کے ترجمان اور چوہدری نے دور سے میاں صاحب کو خفیہ ایجنسی افسران اور کمانڈوز کے نرغے میں دیکھ کر زور سے کہا "میاں صاحب وی آئی پی [illegible]" نواز شریف نے [illegible] چوہدری کی سمت دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں [illegible] بے بسی تھی کہ اس ایک نگاہ سے ہی سمجھ آ جاتا تھا کہ وہ [illegible] چوہدری کو جواب میں کیا کہنا چاہ رہے تھے۔

میں نے وہاں جاری اس ہجوم میں غلام مصطفیٰ کھر کو ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ بھی نواز شریف کے کندھے سے کندھا ملا کر ان کمانڈوز اور خفیہ ایجنسی افسران سے لڑنے کی کوشش کریں گے۔ آخر وہ بھی پاکستان سے خصوصی سفر کر کے لندن اسی چکر میں گئے تھے کہ وہ بھی نواز شریف کے ساتھ آئیں گے۔ جب انہوں نے یہاں ساری کہانی الٹی ہوتے دیکھی تو وہ پیچھے کی طرف [illegible] اپنے پاسپورٹ پر مہر لگوا کر اپنے انتظار میں [illegible] ایک گاڑی میں بیٹھ کر تیزی سے اسلام آباد کی طرف نکل گئے۔

میاں صاحب کے ساتھیوں نے کچھ مزاحمت کرنے کی کوشش کی تو ان خفیہ ایجنسی افسران نے نواز شریف کو [illegible] کی طرف گھسیٹنا شروع کیا۔ ابھی یہ شور شرابہ جاری ہی تھا کہ ان کمانڈوز نے نواز شریف کو [illegible] کی طرف نکلنے والے [illegible] گیٹ کی طرف کیا اور انہیں گھیرا [illegible] سے باہر لے گئے۔ پنجاب پولیس کے کمانڈوز نے نواز شریف کو ایک پرانی [illegible] بس میں [illegible] کمانڈوز بس میں بیٹھ گئے۔ [illegible] نے بس کے پیچھے [illegible] شروع کیا۔ مجھے یوں لگا جیسے [illegible] کے پاس لے جا رہے ہوں جو وہاں سے کچھ دور فاصلے پر [illegible] اس [illegible] کا انتظار کر رہا تھا۔ بس ایک جہاز کے قریب جا کر رکی۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس جہاز میں سعودی پرنس وہاں پہلے سے موجود تھے۔ میاں صاحب کو وہاں بٹھایا گیا اور جہاز

ان کی آنکھوں کے سامنے وہ جہاز جدہ کے لیے اڑ گیا۔

○○○

یوں نواز شریف جنہوں نے پاکستان واپس آنے کا جو جوا کھیلا تھا وہ اپنی پارٹی کے لیڈروں اور کارکنوں کی بزدلی اور نااہلی کی وجہ سے اسلام آباد ائیرپورٹ پر اترتے ہی ہار گئے تھے۔ انہیں لندن میں جو [illegible] جیسے استقبال کی کہانیاں سنائی گئی تھیں وہ سب جھوٹی نکلی تھیں۔ ان کے ساتھ ائیرپورٹ پر جو سلوک کیا گیا تھا اس نے یقیناً انہیں ۱۲ اکتوبر کی یاد دلا دی ہوگی۔ نواز شریف [illegible] بھی ان پر یہ کہہ کر تنقید کر رہے تھے کہ ان کا پی آئی اے کی فلائٹ سے آنے کا فیصلہ [illegible] ایک غلط فیصلہ تھا۔ بہتر ہوتا وہ کسی اور فلائٹ سے دوپہر کے وقت پاکستان پہنچتے تو اس وقت تک لیڈر اور کارکن ائیرپورٹ پہنچ سکتے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ میاں صاحب کو اسلام آباد کے بجائے لاہور ائیرپورٹ اترنا چاہیے تھا جو پارٹی کا گڑھ [illegible] الغرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ سب ہی کی کامیابی کے [illegible] باپ ہوتے ہیں اور ناکامی کو ڈھونڈنے سے ایک بھی نہیں ملتا۔ اگر یہی نواز شریف کو پاکستان واپس [illegible] مل جاتا تو ابھی لیڈروں نے اس ناکام [illegible] وجوہات کو [illegible] پیش کرنا تھا۔

میں اور ارشد شریف ائیرپورٹ سے باہر نکلے تو چاروں طرف ایک ہو کا عالم تھا۔ جنرل مشرف حکومت کا شکریہ کہ انہوں نے صحافیوں کو اسلام آباد پہنچانے کے لیے ایک [illegible] بندوبست کیا ہوا تھا [illegible] ائیرپورٹ سے [illegible] پوائنٹ تک پولیس [illegible] بس تھی۔ [illegible] اسی وقت جاری [illegible] کے قریب سے غلام مصطفیٰ کھر صاحب جیسے [illegible] تیزی سے گزر گئے۔ ان کا کام پورا ہو گیا تھا۔ اب [illegible] میں [illegible] پاکستانی عوام کو نواز شریف کے اس سفر میں اپنی بہادری کی کہانیاں سنانے والے تھے۔ [illegible] ان کا پہلا [illegible] ٹی وی کے بڑے مشہور میزبان افتخار احمد کے پروگرام جواب دہ میں ہوا۔ میری حیرانی کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے اس پروگرام میں ایسے گفتگو کی جیسے نواز شریف ایک بچہ [illegible] تھے اور وہ ان کے گارڈ [illegible] تھے۔ انہوں نے ائیرپورٹ پر اپنی بہادری کی ایسی کہانیاں سنانا شروع کیں کہ میں دنگ رہ گیا۔ افتخار احمد کے اس پروگرام میں مصطفیٰ کھر کی یہ باتیں سن کر مجھے ان کی

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

کامیابی کا راز سمجھ میں آ رہا تھا۔ پاکستان میں مصطفیٰ کھر جیسے لیڈر بھی ناکام تھے۔ جو پہلی مرتبہ گئے تو مصطفیٰ کھر بھی بھاگ گئے تھے۔ اب نواز شریف جدہ پہنچ گئے تھے تو مصطفیٰ کھر صاحب پاکستان میں تھے۔

میں ایئرپورٹ سے سیدھا گھر آیا۔ ٹی وی پر خبریں ملنا شروع ہوگئیں۔ وہاں جنرل مشرف حکومت کے مخالف وزرا نواز شریف پر الزام لگا رہے تھے کہ کیسے انہوں نے ڈیل کی خلاف ورزی کی تھی اور انہیں جدہ بھیج دیا گیا تھا۔ ان وزرا میں ایک وزیر کا نام زاہد حامد بھی تھا۔ آج وہی زاہد حامد پاکستان مسلم لیگ نواز کے ٹکٹ پر سیالکوٹ سے الیکشن جیت کر ممبر قومی اسمبلی ہیں۔ وہی نواز شریف جو لندن میں قرآن کی قسمیں کھاتے تھے کہ وہ جنرل مشرف کے ساتھ ہاتھ ملانے والے کسی سیاستدان سے ہاتھ تک نہیں ملائیں گے وہی بعد میں زاہد حامد جیسے لوگوں کو اپنی پارٹی کا ٹکٹ دے کر قومی اسمبلی کا ممبر بنواتے دیکھے گئے۔

اس واقعے کے دو ماہ بعد نواز شریف پاکستان لوٹ آئے۔ اب کی دفعہ انہوں نے درست ایئر پورٹ کا انتخاب کیا۔ وہ اسلام آباد کے بجائے لاہور ایئر پورٹ پر اترے۔ اب انہیں ہمارے جیسے صحافیوں کو جدہ بلا کر اپنے ساتھ لاہور لانے کی ضرورت نہیں رہی تھی کیونکہ اس دفعہ سعودی عرب کے بادشاہ سلامت نے انہیں اپنے طیارے پر ایک بلٹ پروف مرسیڈیز گاڑی ساتھ دے کر پاکستان واپس بھیجا تھا۔ بھلا اب کی دفعہ جنرل مشرف کی کیا مجال کہ وہ بادشاہ کے بھیجے ہوئے ہمارے لیڈر کے ساتھ وہی سلوک کرتے جو ہماری آنکھوں کے سامنے اسلام آباد ایئر پورٹ پر کیا گیا تھا۔

سید یوسف رضا گیلانی

وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کو ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ قومی اسمبلی کے اجلاس میں فیصل صالح حیات ایک ایسی بات کہہ دیں گے جس کی وضاحت انہیں ٹی وی کیمروں کے سامنے خود کرنی پڑ جائے گی۔

دراصل وزیراعظم گیلانی، فیصل صالح حیات اور وفاقی وزیر برائے پانی و بجلی راجہ پرویز اشرف کے درمیان ایک سال سے جاری لڑائی میں کراس فائرنگ کا شکار ہوئے۔ جون 2010ء کے آخری ہفتے میں جب بجٹ پر بحث جاری تھی تو فیصل صالح حیات نے ایک دفعہ پھر راجہ پرویز اشرف پر رینٹل پاور پراجیکٹس میں کرپشن کرنے کے الزامات دہرائے۔ اس وقت وزیراعظم یوسف رضا گیلانی بھی ایوان میں موجود تھے۔ فیصل صالح حیات نے اس موقع کا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ کہا کہ راجہ پرویز اشرف کے خلاف سکینڈل اس رپورٹر (رؤف کلاسرا) نے کیا ہے جنہوں نے وزیراعظم گیلانی کی کتاب "چاہ یوسف سے صدا" لکھی ہے۔

یہ بات قومی اسمبلی میں بیٹھے تمام ارکان اور میڈیا کے لوگوں کے لیے ایک بم شیل کے طور پر سامنے آئی۔ کوئی بھی یہ توقع نہیں کر رہا تھا کہ وزیراعظم گیلانی کو اس طریقے سے سب کے سامنے یہ کہا جائے گا کہ ان کی آپ بیتی دراصل کسی صحافی نے انہیں لکھ کر دی تھی۔ انہوں نے محض اس پر اپنا

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

نام لکھ دیا تھا۔

جب فیصل صالح حیات نے یہ ساری بات ختم کی تو وزیراعظم گیلانی کھڑے ہو گئے اور انہوں نے اپنی وضاحت پیش کی۔ گیلانی صاحب نے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ رؤف کلاسرا میرے دوست ہیں۔ پھر انہیں کوئی بات یاد آئی اور بولے کہ نہیں، وہ میرے ذاتی دوست ہیں۔ جب میں اڈیالہ جیل میں تھا تو وہ مجھ سے ملنے آتے تھے۔ گیلانی صاحب نے ایک اور بات بھی کی کہ وہ بھی سرائیکی علاقے سے ہیں اور میں بھی سرائیکی علاقے سے آیا ہوں۔ تاہم یہ کتاب میں نے خود لکھی ہے رؤف کلاسرا نے نہیں لکھی۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے گیلانی صاحب نے یہ بھی کہا کہ وہ تو انگلش میں لکھتے ہیں، اردو میں نہیں۔ ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اگر رؤف نے لکھی ہوتی تو وہ کتاب انگلش میں ہوتی نہ کہ اردو میں۔

جب قومی اسمبلی میں یوسف رضا گیلانی اور فیصل صالح حیات میں اس بات پر بحث جاری تھی کہ یوسف رضا گیلانی کی کتاب کس نے لکھی تھی تو میں اس وقت بڑے مزے سے اپنے گھر پر سویا ہوا تھا۔ ایکسپریس چینل کے دوست احمد کا فون آیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ آپ کہاں ہیں؟ یہاں تو آپ کی وجہ سے خاصا رولا پڑا ہوا ہے۔ اب آپ ہی بتا دیں کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ فیصل صالح حیات کہتے ہیں کہ کتاب آپ نے لکھی ہے، گیلانی صاحب کہتے ہیں کہ نہیں یہ کتاب انہوں نے خود لکھی تھی۔ میں نے تقریباً سوتے سوتے احمد کو جواب دیا کہ یار یہ لمبی کہانی ہے۔ پھر کسی وقت اس پر بات کریں گے۔

احمد کا فون بند ہو گیا۔ میں نے دوبارہ سونے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی بستر پر لیٹے لیٹے دس سال پہلے کی ان یادوں میں کھو گیا جب میری پہلی دفعہ یوسف رضا گیلانی سے اڈیالہ جیل میں ملاقات ہوئی تھی۔

○○○

اگست 2001ء کی بات ہے۔ میں نے ان دنوں نیا نیا ڈان اخبار چھوڑ کر دی نیوز کو جوائن کیا تھا۔ جنرل مشرف نے انہی دنوں ایڈہاک پبلک اکاؤنٹس کمیٹی تشکیل دی تھی۔ ایک منجھے ہوئے ریٹائرڈ بیوروکریٹ ایچ۔ یو بیگ کو اس کا چیئرمین لگایا گیا تھا۔ اس کمیٹی کے باقی ممبران بھی ریٹائرڈ بیوروکریٹس

تھے لیکن ایمانداری کی بات یہ ہے کہ ان سب نے ان کے بعد آنے والے سیاسی ادوار میں بننے والی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے ممبران سے بہت اچھا کام کیا تھا۔

انہی دنوں اچھی بات یہ ہوئی کہ پہلی دفعہ اس کمیٹی کی میٹنگ میں میڈیا کے لوگوں کو شرکت کی اجازت دے دی گئی تھی۔ اب صحافی وہاں بیٹھ کر اس کی کارروائی کو رپورٹ کر سکتے تھے۔

ایک دن بڑی عجیب سی بات ہوئی۔ پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے سامنے قومی اسمبلی اور سینیٹ سیکرٹریٹ کی وہ مختلف آڈٹ رپورٹس پیش کی گئیں۔ ایک رپورٹ اس دور کی تھی جب وسیم سجاد چیئرمین سینیٹ تھے اور یوسف رضا گیلانی اسپیکر قومی اسمبلی تھے۔ ان آڈٹ رپورٹس میں دونوں پر کچھ اسی طرح کے الزامات لگائے گئے تھے جن میں لوگوں کو نوکریاں دینا، گاڑیوں اور ٹیلی فونز کا غیر ضروری استعمال اور اختیارات کا غلط استعمال وغیرہ شامل تھے۔ سیکرٹری سینیٹ شاہد اقبال کا خیال تھا کہ پبلک اکاؤنٹس کمیٹی سینیٹ کے معاملات کو چیک نہیں کر سکتی کیونکہ یہ ایک خودمختار ادارہ ہے جس کے تمام معاملات کی منظوری اس کی فنانس کمیٹی سے لی جاتی ہے۔ تاہم، کمیٹی نے یہ اعتراض ماننے سے انکار کرتے ہوئے آڈٹ رپورٹ کا جائزہ لینا شروع کیا۔ وسیم سجاد پر ٹیلی فون اور گاڑیوں کے غلط استعمال کے معاملے میں کمیٹی روم سے اٹھارہ لاکھ روپے ریکور کرنے کی ہدایت کر دی۔ بعد میں وسیم سجاد نے جنرل مشرف کے نام ایک خط لکھا۔ جنرل مشرف نے صدر پاکستان کی حیثیت سے انہیں اٹھارہ لاکھ معاف کر دیے اور کچھ دنوں بعد وسیم سجاد نے 2002ء کے الیکشن سے پہلے پاکستان مسلم لیگ قائداعظم جوائن کر لی۔ یوں یہ سارا سودا اٹھارہ لاکھ روپے میں طے ہو گیا۔

اگلے دن یوسف رضا گیلانی پر بننے والی آڈٹ رپورٹ کی باری تھی۔ ان پر بھی وہی الزامات تھے جو وسیم سجاد پر تھے۔ توقع کی جا رہی تھی کہ وہ ان پر بھی کوئی جرمانہ وغیرہ کر کے آڈٹ رپورٹ کو سیٹل کر دیا جائے گا۔ تاہم، جب رپورٹ سامنے لائی گئی تو کمیٹی کو بتایا گیا کہ نیب نے پہلے ہی اس رپورٹ کی بنیاد پر یوسف رضا گیلانی کو گرفتار کر رکھا ہے اور جب تک ان کیسز کا فیصلہ نہیں ہو جاتا کمیٹی یہ رپورٹ اپنی میٹنگ میں زیر بحث نہیں لا سکتی۔

یوں پبلک اکاؤنٹس کمیٹی نے بھی اپنے اختیارات نیب کے سامنے سرنڈر کر دیے۔ اگر وہ یوسف رضا گیلانی پر بننے والے ان آڈٹ پیروں کا فیصلہ کر دیتی جیسے وسیم سجاد کے سلسلے میں کیا گیا تھا تو شاید

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdf!!novels!!blogspot!!com!!

انہیں نیب کی عدالت سے سات سال قید اور دس کروڑ جرمانے کی سزا ہوئی اور بعد میں انہیں کچھ عرصہ جیل میں رہنا پڑا۔

جب میں نے پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کی میٹنگ میں یہ امتیازی سلوک دیکھا کہ کس طرح ایک جیسے کیس میں حکومت کے آدمی کو ریلیف دیا گیا تھا اور اپوزیشن کے آدمی کو سزا دی گئی تو میں نے اپنے دفتر آ کر ایک بڑی سی سٹوری بنائی جو دی نیوز کے فرنٹ پیج پر شائع ہوئی۔ اس میں میں نے یوسف رضا گیلانی اور وسیم سجاد پر لگنے والے الزامات آمنے سامنے چھاپ دیے تھے۔ اس خبر کا چھپنا تھا کہ ایک تہلکہ مچ گیا۔ ان دنوں جنرل مشرف اپنی پوری قوت کے ساتھ ملک پر حکومت کر رہے تھے۔ احتساب کا بھی بہت بڑا چرچا ہو رہا تھا۔ اس خبر سے ان کے جعلی احتساب کا بھانڈا بھی پھوٹا اور یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ یہ احتساب وغیرہ محض اپوزیشن سیاستدانوں کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے تھا۔ وسیم سجاد کی طرح جو سیاستدان اٹھارہ لاکھ روپے کا جرمانہ معاف کرا کر پاکستان مسلم لیگ ق میں شامل ہونے کے لیے تیار تھے انہیں معافی تھی اور جو یوسف رضا گیلانی کی طرح مزاحمت کر رہے تھے ان کے لیے آٹھ سال قید اور دس کروڑ روپے جرمانے کی سزا تھی۔

میری یوسف رضا گیلانی سے اس خبر سے پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے شاید میری یہ خبر اڈیالہ جیل میں پڑھی تھی۔ انہوں نے اپنے جاننے والوں سے پوچھا کہ یہ رپورٹر کون ہے کیونکہ وہ مجھے نہیں جانتے تھے۔ کسی دوست کے ذریعے مجھ تک ان کے شکریے کے الفاظ پہنچے۔ وہ جی ٹائن میں واقع ایک ہسپتال میں اپنے چیک اپ کے لیے آئے۔ مجھے پیغام ملا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہاں ان سے ایک کمرے میں پہلی دفعہ ملاقات ہوئی۔ ان کے خاندان نے ان کی گرفتاری کو ان کی والدہ سے چھپایا ہوا تھا۔ انہیں یہ تاثر دیا گیا تھا کہ وہ ہسپتال کے اس کمرے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ جب گیلانی صاحب کی والدہ وہاں آئیں تو انہوں نے ہسپتال کے اچھے صاف ستھرے کمرے کی تعریف کی اور کہا کہ اب وہ بھی یہیں رک جائیں گی۔ گیلانی صاحب کے لیے بڑا مسئلہ ہو گیا کہ وہ ماں کو کیسے سمجھائیں کہ وہ تھوڑی دیر بعد اس کمرے سے جیل چلے جائیں گے۔ آخر گیلانی صاحب نے اپنی والدہ کو بتایا کہ جنرل مشرف بھی چاہتے ہیں کہ وہ بھی نواز شریف اور شہباز شریف کی طرح پاکستان چھوڑ کر چلے جائیں۔ اب وہ یہ بتائیں کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔ اس پر ان کی والدہ نے کہا کہ بالکل نہیں ایسی بھی

کیا ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے چاہے تمہیں جیل میں ہی کیوں نہ رہنا پڑے۔ اس پر گیلانی صاحب نے کہا کہ پھر جنرل مشرف کی یہ شرط ہے کہ ہسپتال کے اس کمرے سے سیدھے جیل جائیں۔ اس پر ان کی ماں نے کہا کہ اگر یہ بات ہے پھر ٹھیک ہے۔ میں واپس ملتان چلی جاتی ہوں۔

کچھ عرصے بعد جب گیلانی صاحب کو نیب نے سزا سنائی تو ان کی والدہ سے یہ بات چھپائی گئی تھی لیکن ان کے کسی عزیز نے لاشعوری طور پر یہ بات ان کی ماں کو بتا دی اور صدمے سے ان کی وفات ہو گئی۔

ہسپتال کے اسی کمرے میں میری پہلی دفعہ یوسف رضا گیلانی سے ملاقات ہوئی۔ وہ بڑی عزت اور احترام سے ملے۔ اس بات کا بہت شکریہ ادا کیا کہ میں نے ان کے حق میں وہ سٹوری لکھی تھی باوجود اس بات کے کہ میں ان سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔

میں نے گیلانی صاحب سے کہا کہ بات دراصل یہ ہے کہ مجھ جیسے لوگ میڈیا میں بیٹھ کر ہر روز سرائیکی علاقوں کے فیوڈلز کو اس بات پر تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کہ وہ اپنے علاقے کے لوگوں کے لیے کچھ نہیں کرتے۔ وہ غریبوں کو نوکریاں نہیں دیتے۔ جب آپ نے نوکریاں دی تھیں تو جیل میں ڈال دیا گیا تھا لہذا اس معاملے پر قلم اٹھانا ان پر کوئی احسان نہیں تھا۔

خیر گیلانی صاحب سے ایک نئے تعلق کی بنیاد پڑی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ عام سیاستدانوں کے برعکس ملنے ملانے میں زیادہ بہتر انسان تھے۔ ان کا رویہ عام لوگوں سے بہت اچھا تھا۔ ہر ایک کے ساتھ عزت سے پیش آنا اور شفقت سے گفتگو کرنا ان کے مزاج کا حصہ تھا لہذا مجھے ملنے جلنے میں وہ دشواری محسوس نہیں ہو رہی تھی جو میں دیگر سیاستدانوں کے معاملے میں سمجھتا تھا۔

اس کے بعد میں ان سے ملنے کے لیے اڈیالہ جیل گیا۔ وہ بڑی عزت اور احترام سے پیش آئے۔ مجھے ایک نیا شوق ہونے لگا کہ کیوں نہ ان سے ان کی سیاسی زندگی کے بارے میں بات چیت شروع کی جائے تاکہ ماضی میں چھپے ہوئے رازوں پر سے پردہ اٹھایا جا سکے۔ یوں میرا اڈیالہ جیل آنا جانا زیادہ ہو گیا۔ ایک دن گیلانی صاحب نے بتایا کہ وہ اپنی آپ بیتی لکھ رہے ہیں۔ جیل میں فارغ ہونے کی وجہ سے وہ یا تو بھارتی اداکارہ ایشوریا رائے کی فلمیں دیکھتے رہتے یا پھر کاغذ قلم لے کر اپنے ماضی کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے۔

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

[illegible]

[illegible] گیلانی صاحب کے دو بیٹے ملنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ [illegible]

[illegible]

جیل حکام سے کہا کہ [illegible] اور اس کے دوست کو اندر بھیج دیں۔ جب میں اور ارشد اندر گئے تو ایک بڑی میز پر کھانا لگا ہوا تھا جو ان کے بچے ان کے لیے لائے تھے۔ میز کے ارد گرد گیلانی صاحب، ان کی بیوی فوزیہ گیلانی، بیٹی فضہ، بڑا بیٹا عبدالقادر اور تین چھوٹے بیٹے موسیٰ، حیدر اور قاسم بھی بیٹھے تھے۔ وہاں ایک چھوٹا سا بچہ بھی بیٹھا تھا۔ وہ پیارا سا بچہ مجھے اور ارشد کو دیکھ کر ڈر سا گیا۔ اس نے خوفزدہ آنکھوں سے یہ پوچھنا شروع کر دیا کہ ان میں سے جنرل مشرف کون ہے۔ ہم دونوں اس گول مٹول بچے کے منہ سے یہ سوال سن کر بڑے حیران ہوئے کہ یہ بھلا کیوں ہمیں جنرل مشرف سمجھ رہا ہے۔ پتہ چلا کہ وہ چھوٹا سا پیارا بچہ یوسف رضا گیلانی کی بیٹی فضہ کا اکلوتا بیٹا اسفندیار ہے۔ جب وہ گھر پر کوئی شرارت کرتا یا رات کو سونے سے انکار کرتا تو اس کی ماں اسے ڈرانے کے لیے کہتی کہ اگر تم نے شرارت کی یا نہ سوئے تو جنرل مشرف آ کر تمہیں اسی طرح جیل میں بند کر دیں گے جیسے انہوں نے تمہارے نانا ابو کو قید کیا ہوا ہے۔ اس ننھے سے بچے کے نزدیک دنیا میں صرف ایک ہی خوفناک چیز تھی جس کا نام جنرل مشرف تھا۔ جو اتنا طاقتور تھا کہ اس نے ان کے نانا ابو کو بھی قید میں رکھا ہوا تھا اور وہ سارے مل کر بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ وہ جب بھی جیل میں اپنی ماں کے ساتھ اپنے نانا ابو سے ملنے آتا تو وہ گیلانی صاحب سے

[illegible]

[illegible]

میں نے گیلانی صاحب کو وہ پیسے واپس کرتے ہوئے کہا کہ ہم اس کتاب کا ترجمہ کرنے کا کوئی پیسہ نہیں لیں گے۔ ہم اس کتاب پر اپنا نام استعمال کریں گے اور اس کی رائلٹی میں سے اپنا حصہ لیں گے۔

گیلانی صاحب کہنے لگے کہ یہ پیسے میں آپ کو نہیں دے رہا ہوں۔ یہ پیسے آپ کے دوست کے لیے ہیں تاکہ وہ یہ کام محنت سے کرے۔

میں نے وہ پیسے گیلانی صاحب کو لوٹا دیے کیونکہ مجھے علم تھا کہ اس وقت گیلانی صاحب کے گھریلو حالات اچھے نہیں تھے۔ نیب نے جب سے ان کے بینک اکاؤنٹس فریز کیے تھے اور ان کی جائیداد بیچنے پر پابندی لگی تھی ان کے پاس بچوں کے لیے بھی فیسوں کے پیسے نہیں تھے۔ انہوں نے اپنی ایک گاڑی اور قیمتی گھڑی بیچ کر اپنے مالی معاملات چلانے کی کوشش کی تھی۔ ان حالات میں جیل میں بیٹھے کسی بھی انسان سے پیسے لینا میرے اپنے ضمیر کے لیے ہرگز قابل قبول نہیں تھا چاہے وہ پیسے مجھے اس انگریزی کتاب کے ترجمے کے لیے ہی کیوں نہیں دیے جا رہے تھے۔

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdf!!novels!!blogspot!!com!!

آخر گیلانی صاحب نے میرے مسلسل انکار کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ ہم دونوں باہر بڑے کمرے کی طرف گئے جہاں ان کی بیوی بچے اور ارشد شریف بیٹھے تھے۔ گیلانی صاحب نے اپنی کتاب کا اردو مسودہ میرے حوالے کیا تاکہ میں ارشد شریف کے ساتھ مل کر اس کا ترجمہ کرنا شروع کروں۔

میں نے گیلانی صاحب سے مسودہ لیا اور ارشد شریف کے ساتھ جیل کی سلاخوں سے باہر آ گیا۔ میں نے ارشد شریف کو ساری بات بتائی کہ کیسے گیلانی صاحب ہمیں ہزار روپے ایڈوانس کے طور پر دے رہے تھے۔ ارشد شریف مسکرایا اور مذاقاً بولا پھر واپس کیوں کر دیے تھے؟ پیسوں کی بڑی ضرورت تھی۔

میرا اور ارشد کا خیال تھا کہ اس کتاب کو دو حصوں میں بانٹ کر اس کا ترجمہ کرنا شروع کرتے ہیں اور پھر اسے اکٹھے بیٹھ کر ایڈٹ کر لیں گے۔ ارشد شریف ان صحافیوں میں سے ہے جو ہر کام کو دل سے کرتے ہیں اور بہت اچھا کرتے ہیں۔ ارشد شریف کا موڈ اس وقت یہ مسودہ پڑھ کر خراب ہو گیا جب اس نے گیلانی صاحب کی اپنے خاندان کے بارے میں دی گئی چھوٹی چھوٹی معلومات کو پڑھا۔ میں نے ارشد کو بتایا کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم اس کتاب کا لفظ بہ لفظ ترجمہ کریں۔ ہمیں انگلش قاری کو ذہن میں رکھ کر اس کتاب کو لکھنا تھا لہٰذا گیلانی صاحب کے اس خاندان کے باب کو ہم اپنی مرضی سے ایڈٹ کر کے لکھ سکتے ہیں۔ میں نے گیلانی صاحب سے اگلی ملاقات پر یہ بات کی تو انہوں نے فوراً مجھے اس بات کی اجازت دی کہ ہم جیسے چاہیں اپنی سمجھ کے مطابق اس کتاب کو انگلش کا رنگ دیں۔

میں واپس آیا اور ارشد شریف سے بات کی لیکن میں نے محسوس کیا کہ ارشد شریف اب اس پراجیکٹ میں زیادہ دلچسپی کا اظہار نہیں کر رہے تھے۔ میں نے ارشد کو سمجھانے کی کوشش کی کہ صرف پاکستان میں ہی ہم صحافی اس طرح کے کام نہیں کرتے تھے۔ دنیا بھر کے صحافی تحقیقات کر کے شاندار کتابیں چھاپتے تھے۔ میں نے ارشد سے کہا کہ اگر آج ہم نے گیلانی صاحب کی یہ بائیوگرافی انگلش میں کر لی تو نہ صرف ہمارے اپنے صحافیانہ کیریئر کو پروفیشنل فائدہ ہو گا بلکہ ہم اور بھی بڑے سیاستدانوں کی آپ بیتیاں لکھنے کا ایک نیا سلسلہ شروع کر سکتے ہیں۔ میں نے ارشد سے مذاقاً بھی کہا کہ کون جانتا ہے کہ کل کو یہ جیل میں بیٹھا یوسف رضا گیلانی اس ملک کا وزیراعظم بن جائے اور پھر

اس کی سیاست اور ذات پر کبھی بھی کوئی گفتگو کرنے کے لیے ہم دونوں سے بہتر تبصرہ نگار اور کوئی نہیں ہو گا۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ گیلانی صاحب واقعی وزیراعظم بن گئے۔

میری یہ آخری کوشش بھی رائیگاں گئی کیونکہ اس کے بعد ارشد بالکل اس پراجیکٹ میں دلچسپی ختم کر گیا۔ اسی اثناء میں پتہ چلا کہ ارشد کو برطانیہ میں ماسٹرز کرنے کے لیے ایک اسکالرشپ مل گئی ہے اور وہ کچھ دنوں بعد پاکستان چھوڑ گیا۔ یوں گیلانی صاحب کی یہ کتاب کبھی بھی انگریزی میں نہیں چھپ سکی اور اس کے ذمہ دار اور کوئی نہیں، میں اور ارشد شریف ہیں۔ گیلانی صاحب کی آپ شرافت دیکھیں کہ اتنے برسوں میں انہوں نے مجھے کبھی یاد تک بھی نہیں دلایا کہ میں نے ان سے ان کی کتاب کا انگریزی ترجمہ کرنے کا وعدہ کیا تھا اور کوئی وجہ بتائے بغیر آج تک اس پر کام نہیں کیا۔

اسی اثناء میں میں ایک دن اس وقت کے وزیر داخلہ فیصل صالح حیات سے ملنے ان کے دفتر گیا۔ میں نے باتوں باتوں میں ان سے کہا کہ وہ بھی اپنی بائیوگرافی لکھیں کیونکہ ان کی زندگی اتنی دلچسپ گزری تھی کہ پڑھنے والوں کے لیے اس میں بہت کچھ موجود ہو گا۔ میں نے ان سے یہاں تک کہا کہ اگر وہ چاہتے ہیں تو میں ان سے ساری داستان سن کر وہ کتاب لکھوں گا۔ وہ راوی ہوں گے اور تحریر میں کروں گا۔ فیصل صالح حیات نے میری بات کو مذاق میں ٹال دیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ جب یوسف رضا گیلانی بھی جیل میں کتاب لکھ رہے تھے لہٰذا انہیں بھی کتاب لکھنی چاہیے۔ میرا خیال ہے اس وقت فیصل صالح حیات نے یہ سمجھا کہ شاید میں انہیں ان کی کتاب لکھنے کی آفر کر رہا تھا کیونکہ یوسف رضا گیلانی کی کتاب بھی لکھ رہا تھا۔ حالانکہ میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ انہیں بھی یوسف رضا گیلانی کی طرح اپنی آپ بیتی لکھنی چاہیے۔

شاید ان سات برسوں میں فیصل صالح حیات کے ذہن میں کہیں یہ بات رہ گئی کہ یوسف رضا گیلانی کی آپ بیتی میں نے لکھی تھی۔ فیصل نے اپنے تئیں [illegible] بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے یہ کہا تھا کہ ان کی کتاب بھی اسی صحافی نے لکھی تھی جس نے پرویز مشرف کے خلاف سکینڈل فائل کیا تھا۔ فیصل نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی کہ بھلا یہ صحافی جس سے وزیراعظم نے اپنی کتاب لکھوائی ہے وہ بھلا کیسے کھرا تبصرہ کر سکتا ہے۔

جب وزیراعظم گیلانی نے اس بات کی وضاحت کی کہ یہ کتاب انہوں نے خود لکھی ہے اور یہ کہ

www.freepdfpost.blogspot.com

!allurdupdfnovels!blogspot!com!

رؤف کلاسرا ان کے واقعی دوست ہیں، اس پر بھی شخص کو یوسف کرنے کا ایک اور موقع مل گیا۔ انہوں نے کہا کہ اس کا مطلب ہے کہ وزیراعظم اپنے دوست صحافی کے ذریعے ہی اپنے خلاف خبریں لگوا رہے ہیں۔ وزیراعظم گیلانی نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

اب مجھ تک یہ بات پہنچی تو میں نے شخص صاحب کو فون کیا اور ان سے کہا کہ وہ ذرا یوسف رضا گیلانی سے پوچھیں ہے۔ پھر اچانک ان سے پوچھا کہ جب شخص نے مجھے یاد دلایا کہ میں نے ان کے بارے میں چھاپا تھا کہ یوسف رضا گیلانی جیل میں آپ بیتی لکھ رہے ہیں۔ میں نے بتایا ہوا ہے انہیں کیا کہ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ وہ آپ بیتی میں لکھ رہا تھا اگر میں نے کبھی ان کی ہیں یا دو سطریں اس کتاب کے بارے میں لکھی تھیں اور سب سے بڑھ کر اس پوری کتاب کو بہت بہتر انداز میں صحافیانہ رنگ کے ساتھ شامل کرنا اس کتاب کی دلچسپی میں مزید اضافہ کرتا کیونکہ اس کتاب میں وہ سب کچھ ہے جو کبھی آپ بیتی یا کہانی میں ہو سکتا ہے۔

یہ گیلانی صاحب کی بڑی اعلیٰ ظرفی ہے کہ انہوں نے قومی اسمبلی میں کھڑے ہو کر یہ کہا کہ رؤف کلاسرا ان کا دوست ہے، ورنہ اتنے بڑے عہدے پر بیٹھے شخص کے بارے میں لوگ یہ دعوے کرتے رہتے ہیں کہ وہ ان کا دوست ہے چاہے اس نے کبھی انہیں مڑ کر بھی نہ دیکھا ہو۔ وزیراعظم گیلانی کا مجھے اپنا دوست سمجھنا اس وجہ سے بھی اہم ہے کہ میں نے ان کی حکومت اور ان کے خلاف بہت کچھ لکھا اور چھاپا ہے۔ ان کے قریبی لوگوں نے ان کے کان بھرنے کی کئی دفعہ کوشش کی۔ انہیں میرے خلاف بھڑکانے کے لیے کئی باتیں کی گئیں لیکن انہوں نے ہمیشہ یہ کہا کہ رؤف کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ صحافی ہونے کے ناطے جو لکھنا چاہے لکھے۔ وہ اس وقت میرے حق میں خبریں چھاپتا تھا جب جیل میں مجھ سے ملنے کوئی نہیں آتا تھا۔ آج وہ دراصل میرے خلاف نہیں بلکہ پاکستان کے وزیراعظم کے خلاف خبریں چھاپتا ہے۔

گیلانی صاحب ایک چیز پر بڑے واضح تھے کہ مجھ سے دوستی کے تمام تر دعووں کے باوجود انہوں نے یہ تہیہ کیا ہوا تھا کہ وہ سب صحافیوں کو بیرون ملک دوروں پر ساتھ لے کر جائیں گے لیکن مجھے نہیں۔ ان کا خیال تھا کہ شاید میں ان سے عام صحافیوں کی طرح یہ کہوں گا کہ میرا نام بھی دوروں میں ڈالا جائے۔ شاید وہ بھول گئے تھے کہ اگر ہم غیر ملکی دورے کرنے والے صحافی ہوتے تو کیا ہم جنرل مشرف

ہر طرف عزیز کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ یہ بھی کہا کہ ان پر کوئی صحافی سے مجھے ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ جو صحافت اور صحافت میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو میں بہت سوچ کر ہی اس صحافی دوستوں کی طرح میں نے بھی صحافت کو ترجیح دی ہے۔ گیلانی صاحب نے مجھے اس انتخاب کی ہمیشہ عزت کی ہے اور مجھے یاد نہیں پڑتا کہ جب سے وہ وزیراعظم بنے ہیں انہوں نے مجھ سے کبھی کوئی گلہ کیا ہو یا ایک دفعہ بھی یہ شکوہ کیا ہو کہ تم میرے اور میرے خاندان کے خلاف لکھتے ہو۔ لیکن انہوں نے اتنا بڑا دل کیا ہو۔ میں خود حیران ہوں کہ انہوں نے ابھی اپنی حکومت کے خلاف مسلسل چھپنے والے سکینڈلز پر کبھی انہیں رکوانے کی کوشش کی ہو۔

○○○

جب گیلانی صاحب عدالت سے رہا ہوئے تو میں اس وقت لندن میں تھا۔ یہ اگست 2007ء کے دن تھے۔ بے نظیر بھٹو نے لندن میں اپنی پارٹی کے لیڈروں کا اجلاس انہیں ٹکٹیں دینے کے لیے بلایا تھا۔ مجھے ایک فون آیا۔ میں نے اٹینڈ کیا تو دوسری طرف لائن پر یوسف رضا گیلانی تھے۔ مجھے بڑی خوشگوار حیرانی ہوئی کہ بھلا وہ لندن کیسے پہنچ گئے تھے۔ پتہ چلا کہ وہ اپنی دو بچوں کے ساتھ سات سال بعد پاکستان سے باہر جیل سے رہا ہونے کے بعد آئے ہیں۔ وہ ایجور روڈ کے قریب واقع ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں ان دنوں رسل اسکوائر میں رہتا تھا۔ میں ان سے ملنے گیا تو وہ ہوٹل کی لابی میں اپنے بچوں کے ساتھ گپ شپ کر رہے تھے۔ ایک خوبصورت فرانسیسی ویٹرس انہیں سرو کر رہی تھی۔ گیلانی صاحب کے اردگرد سب لوگ اس ویٹرس کو متاثر کرنے کے چکر میں تھے۔ گیلانی صاحب بھی اس کار خیر میں اپنا حصہ ڈال رہے تھے۔ انہوں نے کسی کو اشارہ کیا کہ وہ اس ویٹرس کو ان کا پورا تعارف کرائیں تا کہ اسے متاثر کرنے میں آسانی رہے۔ اس بچاری کو ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں سمجھایا گیا کہ وہ پاکستان کے بہت بڑے سیاستدان سے بات چیت کر رہی ہے۔ گیلانی صاحب کی ذات کے بارے میں اسے اور بھی بہت کچھ بتایا جا رہا تھا۔ اب اس مذاق میں گیلانی صاحب کے بچے بھی شامل ہو گئے تھے۔ میں چپ بیٹھا رہا کیونکہ مجھے پتہ تھا کہ یورپ کی ویٹرس کو بھلا پاکستان کی سیاست یا سیاستدانوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ وہ ویٹرس بہرحال پروفیشنل ضروریات کے تحت ایک ایک سے مسکرا کر بات

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdf!!novels!!blogspot!!com!!

رہی۔ اب مجھے پہیلی سمجھ آئی کہ اتنی خوش کس کی ہوئی تھی کیونکہ گیلانی صاحب کے ساتھ ساتھ ان کا ایک عزیز بھی اس محفل میں شریک ہو گیا تھا۔ ہم سارے اس ہنسی مذاق سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ لیکن اب سوچتا ہوں کہ کیا اس دوشیزہ کو یہ پتہ ہو گا کہ وہ کسی ایسے شخص کو مسرور کر رہی تھی جو کل کو اس پاکستان کا وزیر اعظم بنے گا۔

ابھی ہم وہاں بیٹھے ہی تھے کہ گیلانی صاحب نے مجھے بتایا کہ ان سے ملنے کے لیے آصف علی زرداری کے ایک بڑے قریبی دوست فیصل تنی بٹ آ رہے ہیں۔ میں انہیں نہیں جانتا تھا۔ گیلانی صاحب کہنے لگے کہ وہ انہیں کھانے پر لے جانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے مجھے بھی کہا کہ میں بھی ان کے ساتھ چلوں۔ میں نے محسوس کیا کہ گیلانی صاحب کچھ چپ چپ سے تھے۔ ان کی آج بینظیر بھٹو سے سات سال بعد پارٹی میٹنگ میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ شاید سمجھ رہے تھے کہ پارٹی کے لیے پانچ سال جیل میں رہنے کے بعد اور جنرل مشرف کی ہر آفر ٹھکرانے کے بعد بینظیر بھٹو شاید انہیں بڑا پروٹوکول دیں گی۔ تاہم میٹنگ میں بینظیر بھٹو نے یوسف رضا گیلانی کو شاید وہ پروٹوکول نہیں دیا جس کے وہ واقعی حقدار تھے۔ جب فیصل تنی بٹ وہاں پہنچے تو میرا ان سے تعارف ہوا۔ انہوں نے بھی تھوڑی دیر بعد یہ بات محسوس کی کہ گیلانی صاحب کچھ بجھے بجھے سے تھے۔ فیصل بٹ بڑے سمجھدار نکلے۔ انہوں نے گیلانی صاحب کا حوصلہ بڑھانے کے لیے اسی وقت اپنے موبائل فون سے آصف علی زرداری کو فون کیا جو اس وقت نیو یارک میں تھے۔ انہوں نے یوسف رضا گیلانی کی آصف زرداری سے بات کرائی۔ فیصل بٹ زرداری صاحب کو اشارۃً بتا چکے تھے کہ گیلانی صاحب کا موڈ کچھ بہتر نہیں ہے۔ آصف زرداری کو احساس ہو گیا تھا کہ شاید لندن میں ہونے والی پارٹی میٹنگ میں ان کے جیل کے ساتھی کو وہ مقام نہیں دیا گیا جس کی وہ توقع کر رہے تھے۔ زرداری صاحب بڑی دیر تک گیلانی صاحب کے ساتھ ٹیلی فون پر باتیں کرتے رہے۔ اتنی دیر میں فیصل بٹ ہمیں اپنی گاڑی میں بٹھا کر کھانا کھلانے کے لیے ایک خوبصورت ترکش ریسٹورنٹ لے گئے۔ رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا لیکن اس ریسٹورنٹ کے اندر مستی اور خوبصورتی ابھی جنم لے رہی تھی۔ میں گیلانی صاحب اور فیصل بٹ اس ریسٹورنٹ کے اندر ایک کونے والی ٹیبل پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہاں عربی موسیقی کی دھنوں پر عربی لڑکیوں نے وہ رقص پیش کیا کہ ہم تینوں اپنی اپنی پریشانیاں بھول گئے اور ہمارے سامنے پڑی لذیذ ڈشیں بھی سانسوں کو گرمانے والے

اس ماحول میں کب کی پڑی ٹھنڈی ہو گئی تھیں۔

○○○

اگلے دن بینظیر بھٹو نے شیلا پارٹی کی ایک اور میٹنگ والی ہوئی تھی۔ گیلانی صاحب نے مجھے کہا کہ میں اس میٹنگ کے بعد ایجوئے روڈ پر آ جاؤں۔ فارغ ہو کر وہاں کچھ بات کریں گے۔ جب میں مقررہ وقت پر وہاں پہنچا تو میٹنگ ختم ہو چکی تھی۔ میں اور گیلانی صاحب ایجوئے روڈ پر پیدل چلنے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ آج ایک دفعہ پھر چپ چپ سے تھے۔ آگے ایک عربی کی دکان پر کھجوریں دیکھ کر میرے منہ میں پانی بھر آیا اور میں نے گیلانی صاحب سے کہا کہ مجھے پہلے یہ کھجوریں خرید دیں۔ ہم ابھی وہیں کھجوریں خرید رہے تھے کہ کسی نے پیچھے سے آ کر انہیں زور سے پکڑ لیا۔ گیلانی صاحب بڑے حیران ہوئے کہ ایجوئے روڈ کی اس سرد شام میں بھلا ان کا کون جاننے والا اتنی بے تکلفی سے ان کی کمر میں ہاتھ ڈال سکتا تھا۔ ہم دونوں نے مڑ کر دیکھا تو شہباز شریف وہاں کھڑے مسکرا رہے تھے۔ گیلانی صاحب اور شہباز شریف آٹھ سال بعد ایجوئے روڈ پر یوں مل رہے تھے۔ دونوں بڑی دیر تک خوشگوار حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ دو تین منٹ ایک دوسرے کا حال احوال پوچھا۔ شہباز شریف ذرا سی جلدی میں تھے۔ وہ اجازت لے کر روانہ ہوئے۔ تقدیر کی بھی اپنی ایک کہانی ہوتی ہے۔ ان دونوں نے بھلا یہ کب سوچا تھا کہ چھ ماہ بعد ان میں سے ایک ملک کا وزیر اعظم اور دوسرا پنجاب کا وزیر اعلیٰ بنے گا۔

میں نے اور گیلانی صاحب نے ایک مرتبہ پھر ایجوئے روڈ پر چلنا شروع کیا۔ انہوں نے مجھے کہا کہ تمہیں پتہ ہے کہ ایک سیاستدان کتنے عرصے بعد اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ جب چاہے، جس وقت چاہے اور جہاں چاہے لوگوں کو استعمال کرنے کا فن سیکھ لیتا ہے۔

میں بڑا حیران ہوا کہ گیلانی صاحب بھلا یہ کس طرح کی بات مجھ سے پوچھ رہے تھے۔ میں کیسے ان کے اس بیان کی تائید یا تردید کر سکتا تھا۔ خیر، میں نے بڑی سمجھداری سے ان کی بات سنی اور جواب دینے کی بجائے چپ رہنا مناسب سمجھا کیونکہ میرا تجربہ کہتا ہے کہ ایسے موقعوں پر جب کوئی شخص اس طرح کی بات کرے تو اس کا مطلب بڑا واضح ہوتا ہے کہ وہ خود ہی کوئی بات کرنے کے موڈ میں تھا لہٰذا اپنے آپ کو سمجھدار سمجھ کر بولنے کے بجائے بہتر ہے انتظار کر کے اس کی بات سنی جائے کہ آخر اس

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

کے من میں کیا ہے۔

میرا چپ رہنا میرے حق میں بہتر نکلا کیونکہ گیلانی صاحب نے پھر اپنی ذات سے جڑی ایک ایسی تاریخی کہانی سنائی جس سے مجھے سیاستدانوں کے مزاج اور نفسیات کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہوئی۔ گیلانی صاحب بولے کہ آج جب بینظیر بھٹو صاحبہ پارٹی کی میٹنگ کی صدارت کر رہی تھیں تو انہیں دیکھ کر پیر پگاڑا کی بائیس سال پہلے کی یہ بات یاد آ رہی تھی کہ ایک سیاستدان بیس سال بعد لوگوں کو استعمال کرنے کا فن سیکھ لیتا ہے۔ کامیاب سیاستدان بھی وہی ہوتا ہے جو دوسروں کو استعمال کرنے کا فن سیکھ لے انہیں تو ساری عمر خود استعمال ہوتا رہے گا۔ گیلانی صاحب کا خیال تھا کہ بینظیر بھٹو اب اتنی میچور سیاستدان بن چکی ہیں کہ آج انہیں محسوس ہوا کہ پیر پگاڑا کی یہ بات سچی تھی۔ وہ جس طریقے سے پارٹی کے لوگوں کو ڈیل کر رہی تھیں اس سے صاف واضح تھا کہ وہ نہ صرف سیاستدان کو سمجھتی تھیں بلکہ سیاستدانوں کو استعمال کرنے کے فن سے بھی اچھی طرح آشنا تھیں۔

میں بینظیر بھٹو کے بارے میں گیلانی صاحب کا تبصرہ بھول کر ان سے پوچھنے لگا کہ بھلا پیر پگاڑا نے ان سے یہ بات کیوں اور کب کی تھی اور اس کے پیچھے کیا کہانی تھی۔

یوسف رضا گیلانی نے ایجوئے روڈ پر چلتے چلتے مجھے بائیس سال پہلے کی وہ کہانی سنائی جو انہیں آج بینظیر بھٹو کو دیکھ کر یاد آ گئی تھی۔

○○○

یوسف رضا گیلانی محمد خان جونیجو کی حکومت میں ایک نوجوان وزیر تھے۔ ان کو وزیر بنے ابھی کچھ عرصہ ہوا تھا۔ وزیراعظم جونیجو اور پیر صاحب پگاڑا کی پنجاب کے وزیراعلیٰ نواز شریف سے نہیں بنتی تھی۔ اور تو اور، جنرل ضیاء الحق کو بھی یہ گلہ تھا کہ نواز شریف یہ سمجھتے تھے کہ وہ وزیراعلیٰ پنجاب اس لیے تھے کہ ارکان صوبائی اسمبلی کی اکثریت ان کے ساتھ تھی۔ یہ بات جنرل ضیاء سے ہضم نہیں ہو رہی تھی کہ نواز شریف یہ سمجھیں کہ وہ اپنی وجہ سے وزیراعلیٰ تھے نہ کہ جنرل ضیاء کی بدولت۔ جنرل ضیاء نے اپنے دل کی بات پیر پگاڑا کے سامنے رکھی۔ جنرل ضیاء کا گلہ سن کر پیر پگاڑا نے فرمایا کہ سائیں فکر نہ کریں، نواز شریف ٹھیک ہو جائیں گے۔ اگلے دن پیر پگاڑا نے یوسف رضا گیلانی کو بلایا اور انہیں کہا کہ آپ

پنجاب جائیں اور اپنے آپ کو وزیراعلیٰ پنجاب کے طور پر ممبران اسمبلی کے سامنے پیش کرنا شروع کریں اور اپنے ساتھ چند بڑے بڑے سیاسی لوگوں کو شامل کریں۔ گیلانی صاحب نے پیر پگاڑا کے کہنے پر پنجاب میں جا کر ڈیرے لگا دیے۔ وہ ان دنوں وزیر ریلوے تھے۔ ایئرپورٹ اور ریلوے اسٹیشن سے آتے جاتے پنجاب کی صوبائی اسمبلی کے درجنوں اراکین اسمبلی نے ان کا استقبال کرنا شروع کر دیا۔ یہ خبر پھیل چکی تھی کہ وفاقی حکومت یوسف رضا گیلانی کو نیا وزیراعلیٰ بنانا چاہتی ہے۔ جب بات زیادہ پھیل گئی تو بڑے بڑے لوگوں نے ان سے خفیہ رابطے کرنا شروع کر دیے۔ ان میں نصراللہ دریشک، عاشق گوپانگ، ملک اللہ یار کھنڈا، مخدوم الطاف، رفیق لغاری اور دیگر بے شمار ایم پی اے ان کے گروپ میں آ گئے۔ سب سے بڑی کامیابی اس وقت ہوئی جب چوہدری پرویز الٰہی نے ان سے رابطہ کیا۔ وہ نواز شریف کو چھوڑ کر ان کے ساتھ شامل ہونا چاہتے تھے۔ اور تو اور، منظور وٹو کو بھی جب اس سارے معاملے کی بھنک ملی تو وہ بھی گیلانی صاحب سے ملنے کے لیے بے چین ہو گئے۔ یوں بہت کم عرصے میں گیلانی صاحب نے ایم پی ایز کی ایک بڑی تعداد کو اپنے ساتھ ملا لیا۔

پیر پگاڑا صاحب کو پیغام بھیجا گیا کہ جناب اب آپ بتائیں کہ نیا وزیراعلیٰ کس کو بنانا ہے کیونکہ نواز شریف کے خلاف بغاوت ہو چکی ہے۔ پیر صاحب سیاست کے پرانے کھلاڑی تھے۔ انہوں نے نوجوان گیلانی کو کہا کہ انتظار کرو۔

گیلانی صاحب ابھی لاہور میں تھے اور اپنے تئیں اپنی مرضی کے وزیراعلیٰ کا سوچ رہے تھے کہ پتہ چلا کہ نواز شریف جنرل ضیاء الحق سے ملنے کے لیے اسلام آباد تشریف لے گئے ہیں۔ نواز شریف کو احساس ہو گیا تھا کہ جنرل ضیاء سے معافی تلافی کیے بغیر ان کی وزارت اعلیٰ نہیں بچے گی۔ وہ جنرل صاحب سے ملے گئے اور اپنی وفاداری کا نئے سرے سے حلف اٹھایا۔ جب جنرل ضیاء اور نواز شریف کی ملاقات ختم ہوئی تو جنرل ضیاء الحق نے ایک بیان جاری کیا کہ نواز شریف کا کلہ مضبوط ہے۔ وزیراعظم محمد خان جونیجو نے بھی یہ بیان دیا کہ پنجاب میں کوئی تبدیلی نہیں ہو گی۔ رہی سہی کسر پیر صاحب پگاڑا کے بیان نے پوری کر دی کہ نواز شریف کی بوری میں سوراخ تھا جس کی میں نے مرمت کر دی ہے۔ یوں یہ سارا کھیل ختم ہو گیا تھا۔

جونہی یہ خبر لاہور پہنچی، سارے کے سارے ایم پی ایز خوفزدہ ہو کر بھاگ گئے۔ ان سب کو

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdf!!novels!!blogspot!!com!!

احساس ہو گیا کہ انہیں استعمال کیا گیا تھا۔ ان سے زیادہ گیلانی صاحب کو احساس ہوا کہ مجھے جنرل ضیاء، محمد خان جونیجو اور پیر پگاڑو نے مل کر استعمال کیا تھا۔ میں بڑے بجھے دل کے ساتھ پیر پگاڑو صاحب سے ملنے گیا اور ان سے پوچھا کہ انہوں نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا تھا۔

وہ مسکرائے اور بولے بچہ یہ سب سیاست ہے۔ نواز شریف جنرل ضیاء کو آنکھیں دکھا رہا تھا۔ میں نے جنرل ضیاء سے کہا کہ ہم نواز شریف کو ٹھیک کر دیں گے۔ اب ہم نے ایک ایسے بندے کا انتخاب کرنا تھا جس کو استعمال کر کے نواز شریف کو سبق سکھایا جا سکتا۔ میری نظر تمہارے اوپر پڑی۔ تم نوجوان ہو۔ تمہاری ابھی سیاست میں پوری گریجویشن نہیں ہے۔ ملتان کے ایک بڑے سیاسی گھرانے سے تمہارا تعلق ہے۔ دوسرے تم میرے رشتہ دار ہو چنانچہ تمہارے لیے ایم پی ایز کو یقین دلانا آسان تھا کہ وہ نواز شریف کو چھوڑ کر تمہارے ساتھ مل جائیں۔ شکر ہے میرا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ تم نے مجھے مایوس نہیں کیا۔

گیلانی صاحب نے ٹوٹے دل کے ساتھ کہا کہ اس کا مطلب ہے آپ نے مجھے استعمال کیا ہے۔

پیر صاحب مسکرائے اور بولے جی ہاں میں نے آپ کو استعمال کیا ہے۔

ایک شکست خوردہ گیلانی نے سیاست کے گرو سے پوچھا کہ ایک سیاستدان کب اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ جب چاہے کسی کو بھی اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔

پیر صاحب نے کہا، بیس سال بعد۔

○○○

ایم اے روڈ پر چلتے ہوئے مجھے ایک لمحے میں یہ بات سمجھ آ گئی تھی کہ یوسف رضا گیلانی کے کہنے کا کیا مطلب تھا اور انہیں وزیر اعظم بھٹو کو آج پارٹی کی میٹنگ میں کیوں پیر پگاڑو کا بیس سال پرانا فقرہ یاد آ گیا تھا۔

میں نے مسکراتے ہوئے گیلانی صاحب سے پوچھا کہ آپ کو سیاست میں کتنا عرصہ ہو گیا ہے۔

میری بات کا مطلب سمجھ کر وہ ہنسے کہ کہو اڑا ہوا دل چلتے ہیں، وہیں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔

لندن میں ہونے والی اس ملاقات کے ٹھیک سات ماہ بعد مارچ 2008 کی ایک شام مجھے پتہ چلا کہ یوسف رضا گیلانی گھر پر ایک کیک دے کر گئے تھے۔ وہ کیک اپنے وزیر اعظم بننے کی خوشی میں تھا۔ یہ بھی ان کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ انہوں نے یہ بات یاد رکھی کہ جس دن وہ ملک کے وزیر اعظم بن رہے تھے اس صحافی کے گھر جا کر انہوں نے کیک دینا تھا جو کبھی ان سے جیل میں آ کر ملتا تھا۔

○○○

جب گیلانی صاحب وزیر اعظم بنے تو ان کے لیے سب سے بڑا بحران ان کے وہ دوست تھے جو ان کے ساتھ ان پانچ سالوں میں جیل میں رہے تھے۔ وہ ایک بہت بڑے گلے کا شکار تھے۔ اگر وہ جیل کے دنوں کے ان دوستوں کو بھلاتے تو ان پر یہ الزامات لگتے کہ وہ ایک خود غرض اور بے وفا انسان تھے جو اقتدار میں آتے ہی بدل گئے تھے لیکن اگر وہ انہیں اہمیت دیتے تو پھر ان کی اپنی بدنامی ہوتی تھی۔ اور بدنامی ہو کر رہی کیونکہ جیل کے دنوں کے ان ساتھیوں نے ہر جگہ یہ بتانا شروع کر دیا کہ وہ وزیر اعظم کے ذاتی دوست ہیں۔ کسی نے کہیں پلاٹوں پر قبضہ کر لیا تو کسی نے چھوٹی کی کشتم کو زبان اپنے نام کرانی شروع کر دیں۔ کوئی ان کا نام استعمال کر کے ٹرانسفر پوسٹنگ کرانے لگ گیا تو کسی نے ٹھیکے پکڑنے شروع کر دیے۔ جب مجھ تک اس طرح کی خبریں پہنچیں تو میں نے گیلانی صاحب کے خلاف زور دار قسم کی سٹوریاں فائل کیں۔ گیلانی صاحب کو پہلا دھچکا اس وقت لگا جب میں نے اپنے اخبار دی نیوز میں ایک خبر لگائی کہ جس دن ملتان میں پاور لوم کے تاجر لوڈشیڈنگ کے خلاف ہنگامے کر رہے تھے اور پورے شہر کو آگ لگی ہوئی تھی، اسی شام گیلانی صاحب بحریہ ٹاؤن میں ملک ریاض کے گھر ایک بہت بڑی دعوت میں شریک تھے۔ ان کے نزدیک جلتے ہوئے ملتان جانے سے ملک ریاض کے گھر دعوت میں جانا زیادہ اہم تھا۔

یہ خبر پڑھ کر کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ میری اور گیلانی صاحب کی اتنی قریبی دوستی تھی اور میں پھر بھی ان کے خلاف اتنی بڑی خبر فائل کروں گا۔ مجھے بعد میں وزیر اعظم گیلانی کے پرنسپل سٹاف آفیسر خالد سلطان نے بتایا کہ جونہی صبح اس نے خبر پڑھی تو اس نے وزیر اعظم گیلانی کو فون کیا اور انہیں بتایا کہ

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdf!!novels!!blogspot!!com!!

[illegible]

[illegible]

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

کے سب مشہور صحافی ایک چھت تلے اکٹھے تھے۔ اچانک ان سب کے سامنے "آج" ٹی وی چینل کی اینکر پرسن راشدہ نے ان سے پوچھا کہ گیلانی صاحب اطلاع ہے کہ آپ نے لاہور ڈیفنس میں چار گھر خریدے ہیں۔ راشدہ کے سوال پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ یہ پیسے کہاں سے آئے تھے۔ ایک لمحے کے لیے پورے ہال میں ایک سناٹا چھا گیا۔ سب صحافیوں نے وزیراعظم گیلانی کی طرف دیکھنا شروع کیا کہ اب وہ کیا ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔ میں آپ کو یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر یہ سوال شوکت عزیز، جنرل پرویز مشرف یا نواز شریف سے کیا جاتا تو انہوں نے اس رپورٹر کی زندگی حرام کر دینی تھی۔ گیلانی صاحب نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا کہ اگر خریدے ہیں تو چھپ کر نہیں خریدے۔ اس کے ساتھ ہی دوسری طرف دیکھ کر کہا کہ کسی اور نے کوئی سوال پوچھنا ہو تو پوچھ لے۔ یوں ایک لمحے میں انہوں نے اپنے خلاف ایک سکینڈل کو وہیں ختم کر دیا۔ انہوں نے اس کی کوئی لمبی چوڑی وضاحت دینا مناسب نہیں سمجھا اور اس کے بعد میں نے کبھی ان کے ان چار گھروں والا معاملہ اخبارات یا ٹیلی ویژن چینلز پر نہ کبھی پڑھا اور نہ سنا۔

گیلانی صاحب سے پوچھے گئے اس سوال کا موازنہ اب نواز شریف سے جولائی 2010ء کے پہلے ہفتے میں لاہور کے ایک صحافی کی جانب سے پوچھے گئے سوال کے جواب میں دکھائے گئے شدید ردعمل سے کریں۔ داتا دربار پر ہونے والے خودکش حملوں کے بعد ان سے ایک رپورٹر نے جرأت کر کے صرف اتنا پوچھ لیا کہ میاں صاحب! آپ کی سیکیورٹی پر سینکڑوں کی تعداد میں پنجاب پولیس کے لوگ تعینات ہیں.... یہ سن کر میاں صاحب بھڑک اٹھے اور انہوں نے رپورٹر کو غصے میں جواب دیا کہ آپ نے مجھ سے کس طرح کا سوال پوچھا ہے۔ میاں صاحب نے فوری طور پر اس سوال کو یہ کہہ کر مسترد کیا کہ صحافی نے ان کی ذات پر حملہ کیا ہے۔ آپ تصور کریں کہ اگر ہماری صحافی دوست راشدہ میاں صاحب سے اسی طرح کا کوئی سوال پوچھ لیتی جیسا انہوں نے یوسف رضا گیلانی صاحب سے پوچھا تھا تو کیا ردعمل ہوتا۔

ممکن ہے کہ گیلانی صاحب نے یہ سوچ لیا ہو کہ عوام اور میڈیا کچھ بھی کہتے رہیں، وہ وہی کچھ کرتے رہیں گے جو ان کے سیاسی مفاد میں ہے۔ ایک بات طے ہے کہ گیلانی صاحب اس پائے کے لیڈر نہیں ہیں جس کی ہمیں ان برے وقتوں میں ضرورت ہے۔ وہ شریف اور مروت بھرے انسان ضرور ہیں لیکن قابل نہیں! مجھے ان کی جو بات اچھی لگتی ہے وہ ان کا قوت برداشت ہے جس کو صحافی ہونے کے

دینے میں اپنا پیسہ خرچ کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہوں لیکن اب تک انہیں اپنے فیصلے بدلنے پر آمادہ نہ کر سکا۔

گیلانی صاحب قوم کی قسمت بدل سکیں یا نہ بدل سکیں لیکن انہوں نے اپنی، ان کے بچوں، عزیز رشتہ داروں اور دوستوں کی قسمت ضرور بدل دی ہے۔ اس سے زیادہ شاید گیلانی صاحب کو خدا سے بھی اور نہیں طلب!!

www.freepdfpost.blogspot.com

!allurdupdfnovels.blogspot.com!

ذوالفقار علی بھٹو

انٹرویو: اوریانا فلاچی

میں وہ دعوت نامہ دیکھ کر بڑی حیران ہوئی تھی۔ یہ دعوت ذوالفقار علی بھٹو کی طرف سے تھی۔ میرے پاس کوئی بہانہ بھی نہیں تھا کہ میں اسے مسترد کرتی۔ مجھے صرف اتنا کہا گیا تھا کہ جتنا جلدی ممکن ہو میں راولپنڈی پہنچ جاؤں۔ میں حیران ہوئی کہ اتنی جلدی کیوں؟ یہ بات درست ہے کہ ہر صحافی کی زندگی میں یہ بڑی خواہش ہوتی ہے کہ اسے ایک دفعہ وہ لوگ خود دعوت دے کر ملنے کی خواہش کا اظہار کریں جو اس وقت آپ سے ملنے سے انکاری ہوتے ہیں جب آپ کو ان کی ضرورت پڑتی ہے۔

میرے ذہن میں مختلف باتیں آنے لگیں۔ بھٹو صاحب مجھ سے کیوں ملنا چاہ رہے تھے۔ کیا وہ مجھے اندرا گاندھی کے نام کوئی پیغام دے کر بھارت بھیجنا چاہتے تھے۔ میں نے اپنے یہ مفروضے خود ہی مسترد کر دیے۔ بھٹو صاحب کو اپنے دشمن کے ساتھ رابطہ کرنے کے لیے مجھ جیسی صحافی کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ یہ کام سوئس اور روسی سفارتکاروں کے ذریعے بخوبی سرانجام دے سکتے تھے۔ میرے ذہن میں ایک اور بات آئی لیکن وہ بھی میں نے فوری طور پر مسترد کر دی کیونکہ بھٹو صاحب ایک تہذیب یافتہ شخص ہیں اور ایسے لوگ اپنے مہمانوں کو بلا کر قتل نہیں کرتے۔ ایک اور خیال آیا کہ شاید مجھے بلا کر اپنا انٹرویو دینا چاہ رہے ہوں اور یوں ایک طرح کا سرپرائز میرا انتظار کر رہا تھا۔ شاید یہی بات بھٹو صاحب کے

ذہن میں بھی تھی، بھٹو صاحب سے انہوں نے بنگلہ دیش کے بدنصیب صدر مجیب الرحمن کے بارے میں ایک مضمون پڑھا تھا۔

آخر میرا تجسس میرے شک پر حاوی ہو گیا اور میں نے بھٹو صاحب کی یہ دعوت قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ تاہم یہ دعوت قبول کرنے سے پہلے میں نے یہ بات ان پر واضح کر دی کہ ان کے یہاں جانے کا مطلب یہ نہیں ہو گا کہ میں کھل کر ان کے بارے میں جو چاہوں وہ نہیں لکھ سکوں گی۔ میں جیسے لوگوں کے بارے میں اپنی مرضی کا تاثر لکھتی ہوں اسی طرح میں ان کے بارے میں بھی لکھوں گی۔ کوئی بات بھی چاہے وہ اچھے آداب ہوں یا میری خوشامد، مجھے نہیں خرید سکیں گی۔

بھٹو صاحب کا جواب آیا کہ یقیناً آپ کا جو جی چاہے وہی لکھیے گا۔

یہ میرا بھٹو صاحب کے بارے میں پہلا تاثر تھا۔

بھٹو صاحب ایک ایسے شخص ہیں جن کے بارے میں کوئی بات وثوق سے نہیں کی جا سکتی۔ وہ بڑی تیزی سے اپنا ذہن بدلتے رہتے ہیں۔ ایک عجیب و غریب شخص ہیں جو اسی طرح کے فیصلے کرتے ہیں۔ تاہم یہ بات ماننی پڑے گی کہ وہ بہت ذہین شخص ہیں۔ وہ ایک لومڑی کی طرح بہت چالاک ہیں۔ لوگوں کو اپنی خوبصورتی سے متاثر کرنے والے یا انہیں کنفیوژ کرنے والے ہیں۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ ان میں آپ کو ایک مجھ روانی اور گہری یادداشت کی جھلکیاں بھی نظر آئیں گی۔

جب میں راولپنڈی ایئرپورٹ پر اتری تو دو افسران نے مجھے ریسیو کیا۔ دونوں نے بڑے جذباتی انداز میں مجھے بتایا کہ صدر پاکستان ایک گھنٹے کے اندر اندر ان سے ملاقات کرنے والے ہیں۔ اس وقت پاکستان میں صبح کے دس بج رہے تھے اور میں پچھلے اڑتالیس گھنٹوں سے نہیں سو پائی تھی۔ میں نے ان دونوں افسروں کو بتایا کہ ایک گھنٹے کے اندر ہرگز ان سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔ اس وقت مجھے ایک اچھے باتھ اور نیند کی ضرورت ہے۔

شاید یہ بات اگر کسی اور صدر کے لیے مجھ جیسی صحافی نے کی ہوتی تو وہ شاید ان کے لیے بہت بڑی توہین ہوتی لیکن بھٹو صاحب نے اس بات کا برا نہیں منایا۔ انہوں نے اس ملاقات کو شام ساڑھے سات بجے تک یہ کہہ کر ملتوی کر دیا کہ وہ رات کو کھانے پر میرا انتظار کریں گے۔

جب میں شام کو بھٹو صاحب سے ملنے گئی تو بھٹو صاحب نے کھلے بازوؤں اور مسکراتے چہرے

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ میرے سامنے ایک ایسا دراز قد شخص کھڑا تھا جو مجھے ایک ایسے بینکر کی طرح لگا جو آپ سے اپنے بینک میں اکاؤنٹ کھلوانا چاہتا ہو۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ ان کی عمر چوالیس برس ہے لیکن مجھے وہ اپنی عمر سے زیادہ بڑے لگے۔ ان کے سر کے بال جھڑنا شروع ہو چکے تھے اور جو باقی بچ گئے تھے وہ بھورے تھے۔ ان کی گہری پلکوں کے پیچھے ان کا چہرہ گول، ہونٹ، حتیٰ کہ آنکھوں کی پتلیاں بھی مجھے بھاری لگ رہی تھیں۔ پتہ نہیں کیوں بھٹو صاحب کی آنکھوں میں مجھے ایک عجیب سی اداسی نظر آئی۔ ان کی مسکراہٹ میں بھی ایک عجیب سا شرمیلا پن تھا۔

بہت سارے طاقتور لیڈروں کی طرح بھٹو صاحب میں بھی بہت زیادہ شرمیلا پن ہے۔ ان میں اور بھی بہت ساری ایسی باتیں ہیں جو آپ کو اندرا گاندھی میں بھی نظر آتی ہیں۔ آپ بھٹو صاحب کو جتنا پڑھتے جائیں گے آپ اتنے ہی زیادہ کنفیوژ اور غیر یقینی نتائج اخذ کرتے جائیں گے۔ آپ بھٹو صاحب کو کئی طریقوں سے دیکھ اور سمجھ سکتے ہیں۔ آپ جس طریقے سے بھی دیکھیں گے وہی آپ کو درست لگے گا۔ بھٹو صاحب آپ کو ایک لبرل، ایک سخت گیر حکمران، فاشسٹ، کمیونسٹ، ایک انتہائی مخلص اور ایک جھوٹے شخص بھی لگیں گے۔ مجھے یہ کہنے میں حرج نہیں ہے کہ بھٹو صاحب ہمارے وقت کے سب سے زیادہ مشکل لیڈر ہیں۔ اگر پاکستان نے آج تک کوئی انتہائی دلچسپ چیز پیدا کی ہے تو وہ خود بھٹو صاحب ہیں۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ اگر اس وقت کوئی بھی پاکستان کو محفوظ رکھ سکتا ہے تو وہ بھٹو صاحب ہیں۔ آپ کو یہ بات ہر کوئی بتائے گا کہ بھٹو صاحب کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ اگر بھٹو نہ رہا تو پاکستان بھی دنیا کے نقشے سے مٹ جائے گا۔

جب آپ یہ بات سوچتے ہیں تو پھر آپ کے ذہن میں اندرا گاندھی کی بجائے اردن کے شاہ حسین کا خیال آتا ہے۔ شاہ حسین کی طرح بھٹو صاحب پر بھی یہ الزام لگتا ہے کہ وہ ایک ایسی قوم کی قیادت کر رہے ہیں جو مصنوعی طریقے سے وجود میں آئی ہے۔ وہ بھی شاہ حسین کی طرح سوویت یونین، انڈیا، چائنا اور امریکہ کے درمیان ایک سینڈوچ بنے ہوئے ہیں۔ شاہ حسین کی طرح وہ اس بات پر اڑے ہوئے ہیں کہ وہ کسی کے آگے نہیں جھکیں گے۔ اس کے ساتھ آپ کو یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ شاید وہ امریکی صدر جان کینیڈی کی طرح ہیں۔ وہ ایک ایسے دولت مند گھرانے میں پیدا ہوئے جہاں کوئی چیز ناممکن نہیں تھی کہ آپ سیاسی طاقت بھی حاصل کر لیتے ہیں چاہے اس پر کتنی ہی قیمت کیوں نہ صرف

ہو۔ کینیڈی ہی کی طرح بھٹو صاحب نے بھی بڑا خوبصورت، آرام دہ، طویل اور بڑا اچھا بچپن گزارا ہے۔ جان کینیڈی کی طرح ہی وہ اقتدار کی غلام گردشوں میں اوائل عمری میں ہی داخل ہو گئے تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بھٹو صاحب جاگیرداروں اور اشرافیہ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے پہلے برکلے اور پھر آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی جہاں انہوں نے انٹرنیشنل لاء میں ڈگری لی۔ ابھی ان کی عمر تیس برس سے کچھ ہی زیادہ ہوئی تھی کہ وہ ایوب خان کی کابینہ کے وزیر بن چکے تھے اگرچہ وہ ان سے شدید نفرت کرتے تھے۔ ابھی چالیس سال کی عمر پوری ہونے میں کچھ عرصہ باقی تھا کہ وہ جنرل یحییٰ خان کے وزیر بن چکے تھے اور ان سے بھی وہ نفرت کرتے تھے۔ بھٹو صاحب بہت تکلیف دہ مراحل سے گزرنے کے بعد ایوان صدر میں براجمان ہوئے۔

طاقت محبت سے زیادہ بڑا جذبہ ہے اور جو لوگ طاقت سے محبت کرتے ہیں ان کے نہ صرف معدے بلکہ ناک بھی طاقتور ہوتے ہیں۔ انہیں بڑی خوشبوئیں تنگ نہیں کرتیں۔ بھٹو صاحب نے بھی اس طرح کی بڑی خوشبوؤں کو ناپسند نہیں کیا کیونکہ بھٹو صاحب کو بھی طاقت سے پیار ہے۔ تاہم جس طرح کے پاور سے وہ پیار کرتے ہیں اس کے بارے میں اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ وہ خود بھی اس بات کا جواب انتہائی مبہم انداز میں دیتے ہیں۔ وہ ان سیاستدانوں کے بارے میں آپ کو پہلے سے ہی خبردار کر دیتے ہیں جو سچ بولتے ہیں یا ایک بوائے اسکاؤٹ مورالٹی کو اپنی شخصیت کا حصہ بنا لیتے ہیں۔ جب آپ بھٹو صاحب کو سن رہے ہوتے ہیں تو آپ تقریباً اس بات پر یقین کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ شاید ان کی خواہشات بہت اچھی ہیں اور وہ یقیناً ایک اچھا سوشلزم پاکستان میں نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم جب آپ کراچی میں ان کی شاندار لائبریری میں داخل ہوتے ہیں تو آپ پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ مسولینی اور ہٹلر جیسے فاشسٹ لیڈروں کی کتابوں کو کتنے احترام کے ساتھ سٹور کی جلدوں میں رکھا گیا ہے۔ جتنی نفاست سے مسولینی اور ہٹلر کی کتابوں کو وہاں لائبریری میں رکھا گیا ہے تو آپ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وہ کتابیں محض اس وجہ سے وہاں نہیں رکھی گئیں کہ اس لائبریری کا مالک انہیں ایک شیلف میں رکھنا چاہتا تھا۔ آپ کے اندر شک اور غصہ ابھرنا شروع ہو جاتا ہے۔ آپ بھٹو صاحب سے پوچھتے ہیں تو آپ کو پتہ چلتا ہے کہ ان کے دو اچھے دوست، کاسترو اور ناصر ہیں اور آپ کو ایک عجیب سی اذیت ہوتی ہے۔ کیا بھٹو صاحب نے کوئی خفیہ خواب دیکھ رکھا ہے کہ وہ ایک دن ڈکٹیٹر بن جائیں گے اور

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdf!!novels!!blogspot!!com!!

ان پر بھی کئی کتابیں [illegible] کی طرح اسی طرح کی سطور جلدوں میں کسی بڑے شخص کی لائبریری میں پڑی ہوں گی۔ اب یہ بات ذہن میں رکھیے گا کہ یہ اس طرح کا سوال ہے جو [illegible] سارے [illegible] لوگ پوچھتے ہیں جو ایک ایسے ملک کی تاریخ سے واقف نہیں ہوتے جہاں [illegible] [illegible]

[illegible] سے [illegible] ہے۔

میں بھٹو صاحب کے پاس چھ دن ان کی مہمان بن کر رہی اور ان کے ساتھ چند مہینوں کے [illegible]

[illegible]

بھٹو صاحب [illegible] آواز میں ایک مجھے کو خطاب کرتے ہیں [illegible]

[illegible]

[illegible] کی طرف دیکھا تو مجھے یوں لگا کہ خوبصورت قالینوں پر ایک شیر اور چیتا ہوا آ رہا ہے۔ ایک [illegible] کی طرح وہ وہاں بیٹھ جاتے ہیں۔ بھٹو صاحب مجھے بھی اپنے ساتھ بٹھا لیتے ہیں۔ اتنی بڑی بڑی مونچھوں والے مردوں کے درمیان میں اکیلی عورت یہ سوچ رہی ہوں کہ بھٹو صاحب جان بوجھ

[illegible]

بھٹو صاحب کے گھروں میں آپ کو ایک بہت عجیب سا ماحول نظر آتا ہے جہاں [illegible] [illegible] اپنے [illegible] کے ساتھ [illegible] ہوئے ہیں۔

[illegible] سب سے پہلے رکھا گیا ہے۔

جب ڈنر کا وقت ہوا تو ہم نے اکٹھے وائن پی۔ اس وقت ان کی دوسری بیوی نصرت بھٹو بھی موجود تھیں۔ نصرت بھٹو کو میں نے ایک خوبصورت اور اچھے اخلاق کی خاتون پایا۔ ان کے بعد بھٹو صاحب کا ایک بیٹا اندر آیا۔ ایک چھوٹا پیارا سا بڑے بالوں والا بچہ مجھے وہ ایک ماڈرن اور یورپین بھٹو

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

[illegible] سے اردو سے [illegible] [illegible] ہیں۔ بہت بڑی [illegible] ہو گئی ہیں۔

یہ سب کچھ [illegible] ہوئے مجھے انٹرویو کی ایک بات یاد آ گئی جب میں نے ان سے پوچھا تھا کہ [illegible] کے بارے میں [illegible] تھا جس کے ان نے ایک [illegible] طور پر انٹرویو کیے تھے۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کسی بھی سربراہ مملکت کو تسخیر نہیں کر سکتے اگر آپ اس کے اندر صرف ایک انسان تلاش کر رہے ہوتے ہیں۔ آپ کو اس کے اندر ایک آدمی کو نہیں دیکھنا چاہیے کیونکہ جس لمحے آپ پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ وہ بھی محض ایک آدمی ہی ہے جس کے اندر آپ کی طرح کی خوبیاں اور خامیاں ہیں تو پھر نہ چاہتے ہوئے بھی آپ اس سربراہ مملکت کو پسند کرنے لگتے ہیں اور باقی باتیں بھول جاتے ہیں۔

○○○

بھٹو صاحب کے اس انٹرویو کے چھپنے کی دیر تھی کہ ایک نیا شور شرابہ شروع ہو گیا۔ یہ ہنگامہ محض صحافیانہ انداز کا نہیں تھا جیسے کہ امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر کے سلسلے میں کھڑا ہو گیا تھا بلکہ اس کی نوعیت سفارتی اور عالمی بھی تھی۔ جیسے بھٹو صاحب اندرا گاندھی کے انٹرویو میں اپنے بارے میں ان کا یہ تبصرہ پڑھ کر بڑے غصے میں آ گئے تھے کہ وہ ایک غیر متوازن شخص ہیں۔ اسی طرح اندرا گاندھی بھی بھٹو صاحب کا یہ فقرہ پڑھ کر بہت ناراض ہوئیں جب انہوں نے مسز گاندھی کو ایک ایسی درمیانی ذہانت کی عورت قرار دیا جس میں کوئی خاص خوبی نہیں تھی اور سب سے بڑھ کر اپنے والد نہرو کے مقابلے میں اس میں آدھی خوبیاں بھی نہیں تھیں۔ بھٹو صاحب کا یہ بھی کہنا تھا کہ اندرا گاندھی سے ملنا اور ہاتھ ملانے کے بارے میں سوچ کر انہیں ہمیشہ ایک چڑ سی رہتی تھی۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اندرا گاندھی کا بھٹو صاحب کے ایک تبصرے سے ناراض ہونا واقعی درست تھا کیونکہ میرے خیال میں بھٹو صاحب نے وہ تبصرہ مسز گاندھی سے اپنی نفرت کی بنیاد پر کیا تھا نہ کہ انہوں نے انصاف کے تقاضوں سے کام لیا تھا۔ مجھے خود بھی بھٹو صاحب کی یہ بات سن کر خاصی

[illegible] کی کوشش بھی کی تھی۔ میں نے ان سے [illegible] [illegible] کے ساتھ [illegible] نہیں کر رہے تھے۔ [illegible] صاحب نے مجھ سے کہا [illegible] تھی بلکہ اس کے بعد انہوں نے اندرا گاندھی کے بارے میں کچھ ایسی باتیں بھی کہیں [illegible] اپنے انٹرویو میں شائع کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا لیکن [illegible] کے بارے [illegible] ہوا۔ اس انٹرویو کا نتیجہ بہت سنسنی خیز نکلا یا آپ کہہ لیں کہ [illegible] [illegible] خواہش تھی۔ جن دنوں یہ انٹرویو شائع ہوا تھا انہی دنوں اندرا گاندھی اور بھٹو صاحب پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ کے بعد صلح کی دستاویز پر دستخط کرنے کے لیے ملنے والے تھے۔

جب بھٹو صاحب کا یہ انٹرویو نئی دہلی کے کچھ اخبارات میں چند اقتباسات کے ساتھ چھپا تو اندرا گاندھی چونک گئیں۔ انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ بھٹو صاحب کا یہ پورا انٹرویو پڑھنا چاہتی ہیں اور انہوں نے روم سے خصوصی طور پر اس انٹرویو کا سارا ٹیکسٹ منگوایا۔ بھٹو صاحب کا یہ سارا انٹرویو پڑھنے کے بعد اندرا گاندھی نے یہ اعلان کیا کہ اب وہ پاکستان کے وزیراعظم سے ملاقات نہیں کریں گی۔ یہ سن کر بھٹو صاحب مزید غصے میں آ گئے۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اپنا غصہ کس پر نکالیں۔ آخر انہوں نے اپنی توپوں کا رخ میری طرف کر لیا۔ انہوں نے ایک دفعہ پھر اٹلی میں پاکستانی سفیر کے ذریعے مجھے طلب کیا۔ بھٹو صاحب نے مجھے ادیس ابابا (شہر کا نام) میں ڈھونڈ نکالا جہاں میں ایک اور انٹرویو کرنے گئی ہوئی تھی۔ اس سفیر نے مجھ سے بہت غیر معمولی درخواست کی۔ وہ بولے کہ میں ایک دوسرا آرٹیکل لکھوں جس میں میں یہ کہوں کہ میں نے کبھی بھٹو صاحب کا انٹرویو نہیں کیا تھا۔ یہ محض ایک خواب تھا اور اسی کی بنیاد پر میں نے وہ سب کچھ لکھا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں یہ لکھوں کہ اندرا گاندھی کے بارے میں انہوں نے کوئی رائے نہیں دی تھی بلکہ یہ رائے میرے اپنے خیالات کی پیداوار تھی۔

پہلے تو مجھے بھٹو صاحب کی بھیجی ہوئی یہ فرمائش کی سمجھ نہیں آئی۔

میں نے پاکستانی سفیر سے کہا کہ آپ نے کیا کہا؟

وہ بولے کہ میں آپ سے یہ درخواست کر رہا ہوں کہ آپ ایک نیا کالم لکھیں اور اس میں یہ لکھیں کہ یہ سارا انٹرویو آپ کی اپنی ذہنی تخلیق تھا، خصوصاً جو کچھ مسز گاندھی کے بارے میں لکھا گیا تھا۔

میں چلائی کہ آپ لوگ پاگل ہو گئے ہیں۔ آپ لوگوں کا وزیراعظم بھی پاگل ہو گیا ہے۔

www.freepdfpost.blogspot.com

allurdupdfnovels.blogspot.com

پاکستانی سفیر نے کہا کہ مس فلاسی! آپ یہ بات سمجھنے کی کوشش کریں کہ ساٹھ کروڑ لوگوں کی زندگیوں کا انحصار آپ پر ہے۔ ان کی زندگی اب آپ کے ہاتھ میں ہے۔

میں نے اس پر لعنت بھیجی اور کہا کہ بھاڑ میں جاؤ۔

تاہم، بھٹو صاحب نے ہمت نہیں ہاری اور وہ میرے پیچھے لگے رہے۔ میں جہاں بھی جاتی تو میرے پیچھے کوئی نہ کوئی اہم پاکستانی تعاقب میں لگا رہتا جس کا کام ایک ہی تھا کہ وہ مجھ سے ایک ہی درخواست کرے کہ میں بھٹو صاحب کے اس انٹرویو کی تردید کروں۔ یہ پاکستانی مجھے یہ بات یاد دلانا نہ بھولتے کہ ساٹھ کروڑ لوگوں کی زندگیاں میرے ہاتھوں میں تھیں۔

آخر تنگ آ کر میں نے ایک دن جواب دیا کہ میرے ہاتھ اتنے بڑے نہیں ہیں کہ میں ساٹھ کروڑ لوگوں کو اپنی دو ہتھیلیوں میں تھام سکوں۔ میں نے اس پر بھی بس نہیں کی بلکہ ان پر چلائی کہ ان کا مطالبہ نہ صرف احمقانہ ہے بلکہ میری توہین کے بھی مترادف ہے۔

آخر میرے سر سے اس وقت یہ عذاب اترا جب اندرا گاندھی نے بہت بڑے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے بھٹو صاحب سے امن معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے ملنے کا فیصلہ کیا۔ اندرا گاندھی نے اس طرح کا مظاہرہ کیا جیسے بھٹو صاحب نے ان کے بارے میں اتنے توہین آمیز بیانات کبھی دیئے ہی نہیں تھے۔

جب میں نے ان دونوں کو ٹیلی ویژن کیمروں پر ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے اور مسکراہٹیں تبدیل کرتے دیکھا تو میں نے بڑا انجوائے کیا۔ اندرا گاندھی کی مسکراہٹ میں فاتحانہ پن صاف نظر آ رہا تھا۔ میں اس مسکراہٹ میں irony دیکھ سکتی تھی۔ بھٹو صاحب کی حالت دیکھنے والی تھی۔ ایچ ٹی وی کی بلیک اینڈ وائٹ سکرین پر بھی آپ ان کی شرمندگی کو واضح محسوس کر سکتے تھے۔

OOO

بھٹو صاحب کہنے لگے مس فلاسی! میں آپ سے ملنے کا بہت زیادہ خواہاں تھا۔ وجہ یہ ہے کہ آپ وہ واحد صحافی ہیں جنہوں نے شیخ مجیب الرحمن کے بارے میں سچ لکھا ہے۔ مجھے آپ کا وہ مضمون [illegible] اور شاید اس وجہ سے بھی [illegible] لیکن یہ بات پڑھ کر مزا بھی نہیں آیا جب آپ نے اس میں [illegible] ڈھاکہ [illegible] شاید میرا بھی ہاتھ تھا۔

میں بڑی حیران ہوئی اور بولی جناب صدر! آپ کیا کہہ رہے ہیں کہ شاید آپ کا ہاتھ نہیں تھا۔ اخبار کی میں تو سارے لوگ سڑکوں پر آ کر یہی بات کر رہے تھے کہ یہ آپ ہی تھے جو وہاں قتل عام چاہتے تھے۔ آپ شیخ مجیب کو گرفتار کرانا چاہتے تھے اور اسی وجہ سے آپ 26 مارچ کی صبح تک ڈھاکہ میں موجود بھی رہے۔

بھٹو صاحب طنزیہ انداز میں بولے ہاں، شاید میں ہوٹل انٹر کانٹیننٹل کے آخری طور پر واقع اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے قتل عام کے اس منظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے وہاں رکا ہوا تھا اور ہاتھ میں وہسکی کا گلاس لیے شاید میں نیرو بادشاہ کی طرح بانسری بجا رہا تھا۔

بھٹو صاحب بولتے رہے۔ انہوں نے کیسے یہ جرأت کی کہ وہ اتنے بڑے وحشیانہ اور احمقانہ انداز میں کیے گئے قتل عام کا بوجھ میرے کندھوں پر ڈالیں۔ یہ سارا کام انتہائی احمقانہ طریقے سے کیا گیا تھا۔ انہوں نے تمام لیڈروں کو بھارت فرار ہونے کا موقع دیا اور پھر اپنا سارا غصہ اس غریب عوام پر اتارا جن کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ صرف شیخ مجیب کو گرفتار کیا گیا۔ ہمیں تھوڑی سی عقل سے کام لینا چاہیے۔ اگر یہ کام میں کرتا تو میں اسے زیادہ سمجھداری، تھوڑے وحشیانہ پن اور زیادہ سائنسی انداز میں کرتا۔ میں ان پر آنسو گیس اور ربڑ کی گولیاں چلا کر ان کے تمام لیڈروں کو گرفتار کرتا۔ اس طرح کا کام جیسا کہ ڈھاکہ میں کیا گیا، یہ ایک انتہائی احمق اور شرابی سابق صدر یحییٰ خان ہی کر سکتا تھا جس نے انتہائی بھونڈے طریقے سے اتنا بڑا خونی آپریشن کیا تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ میں پاگل پن کے اس مظاہرے سے بھلا کیا نتیجہ حاصل کر سکتا تھا۔ آپ کو اس بات کا پتہ ہے کہ یحییٰ خان کا پہلا شکار شیخ مجیب کے بجائے میں خود ہوتا۔ میری پارٹی کے بہت سارے لوگ اس وقت جیلوں میں تھے۔ 1970ء کے آخر کی بات ہے، جس میں آپ کو صحیح تاریخ بتاؤں 7 دسمبر 1970ء کا دن تھا۔ جنرل یحییٰ نے مجیب سے کہا "کیا میں بھٹو کو گرفتار کروں یا نہیں۔" جنرل یحییٰ نے اپنا یہ فیصلہ صرف اس وجہ سے تبدیل کیا اور مجھے گرفتار نہیں کیا کیونکہ اسے پتہ تھا کہ وہ مغربی پاکستان میں میری گرفتاری سے پیدا ہونے والی صورت حال کو شاید اس طرح نہ سنبھال سکیں جیسے کہ وہ مشرقی پاکستان میں سنبھال سکتا تھا۔ اس کے علاوہ مجیب الرحمن کبھی بھی اتنا ذہین یا سمجھدار نہیں تھا۔ اس لیے وہ بڑی آسانی سے یحییٰ خان کے ہاتھوں [illegible] تھا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

آپ کو اس کی بات بتاتا ہوں۔ [illegible] بھارت کے [illegible] قتل عام [illegible]

[illegible] تیس لاکھ لوگ مارے گئے تھے [illegible] آپ کو خود بتا دیتا ہوں [illegible]

یہ شخص ایک پیدائشی جھوٹا شخص ہے۔ وہ جھوٹ بولے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جھوٹ بولنا اس کی فطرت میں ہے۔ وہ ادھر ادھر کی ہانکتا رہتا ہے۔ یہ اس کے موڈ پر انحصار کرتا ہے کہ کب وہ کیا بات کرے۔ [illegible] تیس لاکھ لوگ مارے گئے تھے۔ وہ پاگل ہے۔ وہ بالکل پاگل ہے۔ وہ سب لوگ پاگل ہیں جن میں مشمول اخبارات کے جو اس کی بات کو دہراتے رہتے ہیں کہ تیس لاکھ لوگ مارے گئے۔ تیس لاکھ لوگ قتل ہو گئے۔

بھارتیوں نے کہا تھا کہ دس لاکھ لوگ مارے گئے تھے۔ شیخ مجیب نے پہلے دس کو تین کیا اور پھر تیس لاکھ بنا دیا۔ یہ تو اس شخص کا کمال ہے۔ وہ تو طوفان سے مرنے والے لوگوں کی تعداد بھی اسی طریقے سے ضرب تقسیم کر کے بڑھاتا رہتا ہے۔ بھارتی صحافیوں کے مطابق مرنے والوں کی تعداد ساٹھ سے ستر ہزار تھی جبکہ مشرقی لوگوں کے مطابق تیس ہزار لوگ مارے گئے تھے۔ جہاں تک میری معلومات ہیں تقریباً پچاس ہزار لوگ مارے گئے تھے۔ چاہے اس فوجی ایکشن کا اخلاقی طور پر کوئی بھی جواز پیش کیا جائے۔ میں حالات کی سنگینی کو کم کرنے کی کوشش نہیں کر رہا۔ میں صرف چیزوں کو حقیقت کی طرف واپس لا رہا ہوں کیونکہ پچاس ہزار اور تیس لاکھ لوگوں کے مرنے میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔

یہ بات ان پناہ گزینوں پر بھی صادق ہوتی ہے جو مشرقی پاکستان چھوڑ کر بھارت چلے گئے تھے۔ اندرا گاندھی صاحبہ فرماتی ہیں کہ ایک کروڑ لوگ ان کے ہاں پناہ گزین تھے۔ یہ بات بڑی واضح ہے کہ انہوں نے جان بوجھ کر ایک کروڑ کا ہندسہ دیا تاکہ وہ اس کو جواز بنا کر مشرقی پاکستان پر حملہ کر سکیں۔ جب ہم نے اقوام متحدہ سے کہا کہ وہ پناہ گزینوں کی تعداد چیک کر کے بتائے تو بھارتیوں نے اس کی بڑی شدت سے مخالفت کی۔ اب آپ مجھے بتائیں کہ وہ اس کے خلاف کیوں تھے۔ اگر ایک کروڑ کا ہندسہ ٹھیک تھا تو انہیں اس تعداد کو اقوام متحدہ سے چیک کرانے سے کوئی ڈر نہیں ہونا چاہیے تھا۔

[illegible]

[illegible] ایک اور [illegible] کہ وہاں [illegible] کے ہاتھوں [illegible] قتل [illegible]

[illegible] یقین نہیں کرتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہاں بہت زیادتیاں کی گئی تھیں۔

[illegible] انہوں نے [illegible] جنرل ٹکا خان [illegible] رپورٹ کریں۔ جنرل ٹکا نے اپنی [illegible] چار کیس رپورٹ ہوئے۔ اب اگر ان [illegible] کو ضرب دے کر ان ہیروں کی تعداد پانچ کر دیں پھر بھی ہم ان نمبروں کے قریب نہیں پہنچ سکیں گے جو شیخ [illegible]

[illegible] پوری دنیا میں پھیلا رہے تھے۔

میں نے بھٹو صاحب سے کہا کہ لیکن جناب صدر! آپ ان چار ہیروں کو ایک ہزار کے ساتھ ضرب دیں یا دس ہزار سے ضرب دیں پھر جا کر کہیں آپ اس اصل گھر کے قریب پہنچیں گے۔ اگر شیخ مجیب [illegible] کہ تیس لاکھ لوگ مارے گئے تھے تو پھر ٹکا خان بھی یہ مذاق کر رہے تھے کہ صرف چار کیس رپورٹ ہوئے تھے۔ وہاں بڑے پیمانے پر ظلم اور زیادتیاں کی گئی تھیں۔ میں اس لیے یہ بات کر رہی ہوں کہ میں نے ڈھاکہ کی گلیوں میں خود لاشیں دیکھی ہیں۔ ویسے آپ نے کیا عجیب بات کی ہے کہ اس قتل عام کا اخلاقی طور پر جواز پیش کیا جا سکتا تھا۔ آپ نے یہ کہا کہ اس قتل کا اخلاقی جواز [illegible] کیا میں نے آپ کی بات سچ سمجھی ہے۔ کیا آپ واقعی یہ بات کہنا چاہتے ہیں کہ [illegible] اس قتل عام کا اخلاقی جواز موجود تھا۔

بھٹو صاحب نے جواب دیا کہ ہر حکومت اور ہر ملک کو یہ حق ہوتا ہے کہ جب ضرورت ہو وہ طاقت کا استعمال کرے۔ [illegible] طاقت کا استعمال ہو سکتا ہے۔ آپ [illegible] نہیں کر سکتے۔ ایک ملک بچانے کے لیے [illegible] طاقت کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ [illegible]

www.freepdfpost.blogspot.com

allurdupdfnovels.blogspot.com

بہت سارے لوگوں کو قتل بھی کرنا پڑا تھا۔ سوائے مجھ کو بھی بہت سارے لوگوں کو مارنے کے لیے طاقت کو استعمال کرنا پڑا تھا۔ میں آپ کو موجودہ تاریخ کے صرف دو واقعات بتا رہا ہوں۔ میں پوری انسانی تاریخ میں سے اور مثالیں نہیں ڈھونڈ رہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض دفعہ حالات ایسے ہو جاتے ہیں جہاں آپ طاقت کے فوری استعمال کا جواز ڈھونڈ سکتے ہیں اور اس کا جواز بھی پیش کر سکتے ہیں۔ مارچ کے مہینے میں پاکستان کے اتحاد کا انحصار علیحدگی پسندوں کو کچلنے پر تھا لیکن میرے خیال میں طاقت کا فوری استعمال بلا جواز عام لوگوں پر کیا گیا نہ کہ ان لیڈروں پر جو اس کے ذمہ دار تھے۔ اس طرح کے وحشیانہ پن کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ یہ کوئی طریقہ نہیں تھا کہ آپ غریب لوگوں کو اس طریقے سے قائل کرنے کی کوشش کریں جنہیں یہ بتایا گیا ہو کہ شیخ مجیب کے چھ نکاتی پروگرام سے نہ تو سمندری طوفان آئیں گے نہ سیلاب اور نہ ہی کوئی بھوک سے مرے گا۔ میں تو خود اس طرح کے ہتھکنڈوں کے خلاف اس وقت پورے زور سے بولا تھا جب کسی کو بات کرنے کی جرأت بھی نہیں ہوتی تھی۔

میں آگے سے بولی بھٹو صاحب اچھا ہے کچھ بھی ہو کیا آپ نے اسی جنرل ٹکا کو اپنا آرمی چیف نہیں بنایا جس نے بنگالیوں کے ڈھاکہ میں قتل عام کا حکم دیا تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟

بھٹو صاحب بولے ٹکا خان ایک فوجی تھا اور وہ اپنی ڈیوٹی کر رہا تھا۔ اسے ایک حکم کے ذریعے مشرقی پاکستان بھیجا گیا تھا اور دوسرے حکم کے تحت اسے واپس بلایا گیا تھا۔ اس نے وہی کچھ کیا جس کا اسے حکم دیا گیا تھا۔ اگرچہ وہ اس طرح کے احکامات سے بروقت مطمئن نہیں تھا۔ میں نے اسے اس لیے آرمی چیف بنایا کیونکہ مجھے پتہ ہے کہ وہ اسی ڈسپلن کے ساتھ میرے آرڈرز مانے گا۔ وہ سیاست میں دخل دینے کی کوشش نہیں کرے گا۔ میں پوری پاکستان آرمی تباہ نہیں کر سکتا اور ویسے بھی میں آپ کو بتاتا چلوں کہ ڈھاکہ میں ہونے والے واقعات کے حوالے سے اس کی ریپوٹیشن کے بارے میں باتیں بڑھا چڑھا کر بیان کی جاتی رہی ہیں۔ ان تمام واقعات کا ذمہ دار صرف ایک ہی شخص ہے جس کا نام یحییٰ خان ہے۔ یحییٰ خان اور اس کے مشیر جب طاقت اور کرپشن کے نشے میں چور تھے وہ یہ بھی بھول گئے کہ فوج کی بھی کوئی عزت تھی۔ انہیں خوبصورت کاریں، خوبصورت گھر تعمیر کرنے، بینکرز سے دوستیاں کرنے اور پیسہ کما کر بیرون ملک بھیجنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں تھا۔ یحییٰ خان ملک کی حکومت میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ اسے اگر کسی چیز میں دلچسپی تھی تو وہ اپنے لیے طاقت حاصل کرنے میں تھی اور کچھ نہیں! آپ

… کے بارے میں کیا کہیں گے جو بیڈ سے اٹھتے ہی صبح سویرے شراب پینا شروع کر دے اور اس کا یہ سلسلہ جب رات گئے دوبارہ شروع ہو جائے۔ آپ تصور بھی نہیں کر سکتیں کہ یحییٰ خان کے ساتھ … کتنا مشکل کام تھا۔ He was really Jack the Ripper.

میں نے بھٹو صاحب سے پوچھا کہ آج کل جنرل یحییٰ خان کہاں ہے اور اب آپ ان کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟

بھٹو صاحب بولے وہ راولپنڈی میں واقع اپنے گھر میں قید ہیں۔ وہ بنگلہ جس میں انہیں رکھا گیا ہے وہ سرکاری ہے۔ میں نے ایک وار کمیشن بنا لیا ہے (حمود الرحمٰن کمیشن) جو اس مشرقی پاکستان کے سقوط کی ساری تحقیقات کر رہا ہے۔ میں اس کمیشن کی رپورٹ کا انتظار کر رہا ہوں۔ اس رپورٹ سے ہی مجھے فیصلہ کرنے میں آسانی رہے گی۔ اگر کمیشن نے اسے مجرم قرار دیا تو میرا خیال ہے کہ پھر یحییٰ خان کا زوال ہوگا۔ ساری شکست کی ذمہ داری جنرل یحییٰ خان پر آتی ہے۔ اندرا گاندھی اس بات پر بالکل صحیح فخر کر سکتی ہیں کہ انہوں نے ایک جنگ جیتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اگر انہوں نے یہ جنگ جیتی ہے تو پھر سب سے پہلے مسز گاندھی کو جنرل یحییٰ خان اور اس کے جاہل خوشامدیوں کے ٹولے کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ یحییٰ خان سے عقل کی بات کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے اور بندہ بات سمجھاتے سمجھاتے غصے میں آ جاتا ہے۔

25 مارچ کو ڈھاکہ میں قتل عام کے بعد اپریل کے مہینے میں یحییٰ خان نے مجھے ملاقات کے لیے بلایا۔ اس وقت وہ بڑا مطمئن نظر آ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ اسے اس چیز کا یقین تھا کہ اب صورتحال پوری طرح قابو میں تھی۔ یحییٰ خان نے مجھے شراب کا گلاس پیش کیا اور بولا "تم سیاستدان تو ختم ہو کر رہ گئے ہو۔"

جنرل بولا نہ صرف مجیب بلکہ بھٹو صاحب آپ بھی ان لیڈروں میں شمار ہوتے ہیں جو بہت بڑھ چڑھ کر بول رہے تھے اور پاکستان کی سلامتی کے خلاف تقریریں کر رہے تھے۔

یحییٰ خان بولے "بھٹو تمہیں پتہ ہے میرے اوپر تمہیں گرفتار کرنے کے لیے ہمیشہ پریشر رہتا ہے۔"

یحییٰ خان کی یہ بات سن کر میرا پارہ چڑھ گیا اور میں نے اسے جواب دیا کہ وہ اس طرح کی باتیں کر کے مجھے خوفزدہ نہیں کر سکتا تھا اور اس کے انہی ہتھکنڈوں کی وجہ سے ہم تباہی کے دہانے پر

www.freepdfpost.blogspot.com

allurdupdfnovels.blogspot.com

کر رہے تھے۔ میں نے وسکی کا گلاس دور پھینکا اور اس کمرے سے نکل گیا۔ باہر نکلا تو مجھے جنرل عمر نے روک لیا اور مجھے بازوؤں سے پکڑ کر کہنے لگا

"No. Come on, calm down, have a seat, go back in."

میں ٹھنڈا پڑ گیا اور کمرے میں واپس چلا گیا۔ میں نے جنرل یحییٰ کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ میرے اور مجیب میں بہت فرق ہے۔ مجیب ایک علیحدگی پسند تھا میں نہیں۔

لیکن میری یہ ساری گفتگو بیکار گئی۔ میری بات سننے کے بجائے جنرل یحییٰ خان ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا اور پھر چوتھا اور پتہ نہیں کتنے گلاس شراب کے پیتا چلا گیا اور پھر اس کا رویہ ناقابل برداشت ہو گیا۔

میں نے بھٹو صاحب سے کہا کہ کیا ایک لمحے کے لیے ہم دوبارہ یہ بات سمجھنے کی کوشش کر سکتے ہیں کہ آپ مارچ کے اس خوفناک مہینے میں وہاں تک کیسے پہنچے تھے چاہے اس مہینے میں ہونے والے قتل عام کا اخلاقی جواز تھا یا نہیں۔

بھٹو صاحب بولے میری طرف دیکھو۔ 27 جنوری کو میں شیخ مجیب سے ملنے کے لیے ڈھاکہ گیا تھا۔ اگر میں نے شیخ مجیب سے بات چیت کرنی تھی تو پھر مجھے ڈھاکہ جانا ہی تھا۔ وہ مجھ سے ملنے کے لیے راولپنڈی آنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں اس دن شیخ مجیب سے ملنے کے لیے گیا تھا جس دن میری اپنی سگی بہن کے خاوند کی موت ہوئی تھی۔ اسے لاڑکانہ کے خاندانی قبرستان میں دفن کرنا تھا۔ میری بہن مجھ سے بہت شدید ناراض ہو گئی۔ قومی انتخابات میں شیخ مجیب نے مشرقی پاکستان اور میں نے مغربی پاکستان میں اکثریت حاصل کر لی تھی لیکن اب وہ اپنے چھ نکات پر اڑا ہوا تھا۔ ہم دونوں کو کسی نہ کسی معاہدے پر پہنچنا تھا۔ جنرل یحییٰ خان مسلسل یہ مطالبہ کر رہا تھا کہ ہم چار مہینے کے اندر اندر آئین پر کام کر لیں ورنہ وہ اسمبلی توڑ کر نئے انتخابات کرائے گا۔ شیخ مجیب کو یہ بات سمجھانے کے لیے بہت زیادہ کوششوں کی ضرورت تھی۔ آپ ان لوگوں سے ذہانت کی توقع نہیں کر سکتے جن کے پاس ذہانت ہی نہ ہو۔ میں نے شیخ مجیب سے ان باتوں کی بار بار وضاحت کی، اسے سمجھایا لیکن وہ اپنی ایک ہی بات پر اڑا رہا کہ کیا آپ میرے چھ نکات کو مانتے ہیں۔ میں ان چھ میں سے پہلے میں تین نکات پر بات چیت کے لیے تیار تھا لیکن میں چوتھا نکتہ کیسے مانتا جس میں یہ لکھا تھا کہ ہر صوبہ کسی بھی غیر ملک سے تجارت کر سکتا

[illegible]

...کو کیا ہوتا اور سب سے بڑھ کر ملک کا اتحاد کیسے قائم رہتا۔ اس کے علاوہ اس بات کا سب کو ... کہ شیخ مجیب الرحمٰن مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے علیحدہ کرنا چاہتا تھا اور اس کے بھارتیوں کے ساتھ 1966ء سے رابطے بھی تھے۔ یوں جنوری کے مہینے میں ہماری بات چیت آگے نہ بڑھ سکی اور پھر مارچ آ گیا۔

وسط مارچ میں یحییٰ خان کراچی آئے اور مجھے بتایا کہ وہ ڈھاکہ جا رہے تھے اور مجھ سے پوچھا کہ کیا میں وہاں جانا چاہتا تھا۔

میں نے انہیں جواب دیا ہاں اگر شیخ مجیب مجھ سے بات چیت کے لیے تیار ہے تو میں ڈھاکہ جاؤں گا۔ اگلے روز مجھے ایک ٹیلی گرام ملا کہ شیخ مجیب بات چیت کے لیے تیار ہیں۔ یہ ٹیلی گرام ڈھاکہ سے جنرل یحییٰ خان نے مجھے خود بھیجا تھا۔ میں 19 مارچ کو ڈھاکہ کے لیے روانہ ہوا۔ 20 مارچ کو میری یحییٰ خان سے ملاقات ہوئی اور 21 مارچ کو میں شیخ مجیب الرحمٰن سے ملا۔ اس ملاقات میں یحییٰ خان بھی میرے ساتھ تھے۔ میں اس وقت بڑا حیران ہوا جب میں نے دیکھا کہ شیخ مجیب یحییٰ خان سے بڑے پیار محبت بھرے لہجے میں بات کر رہے تھے۔ شیخ مجیب بولے کہ یحییٰ خان صاحب! میرا تو آپ سے معاہدہ ہو گیا ہے۔ میرا بھٹو صاحب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں پریس کو بتاؤں گا کہ میری صدر صاحب سے ملاقات ہوئی ہے اور بھٹو صاحب وہاں اتفاقاً موجود تھے۔

یہ بات سن کر یحییٰ خان بولے تو مجیب تم صرف اپنی بات کرو۔

شیخ مجیب نے یحییٰ کو جواب دیا کہ سمندری طوفانوں میں پہلے ہی بہت سارے لوگ مارے گئے تھے۔ بہت سارے لوگ مارے گئے تھے۔ شیخ مجیب نے اپنی بات کو دہرایا۔

یہ ہے شیخ مجیب۔ اچانک اس کے بیمار ذہن میں ایک فقرہ اٹک سا جاتا ہے۔ ایک ایسا فقرہ جس کا اس گفتگو سے دور دور تک تعلق ہی نہیں ہوتا جو آپ کر رہے ہوتے ہیں اور وہ ایک جنونی کی طرح اسے بار بار دہراتا رہتا ہے۔

اس میٹنگ میں ایک موقع ایسا بھی آیا کہ مجھے غصہ آ گیا کہ بھلا مشرقی پاکستان میں آنے والے سمندری طوفان کی ذمہ داری مجھ پر کیسے آ جاتی تھی۔ کیا وہ سمندری طوفان میں نے مشرقی پاکستان

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

بیٹھا تھا۔ میری بات سن کر شیخ مجیب اٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ اس نے ایک جنازے میں شرکت کرنی تھی لہٰذا وہ جا رہا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ جب بھی آپ شیخ مجیب کے بارے میں بات کرتے ہیں تو آپ کو ہر بات ناقابل یقین سی لگتی ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ بھلا دنیا کیسے اسے سنجیدگی سے لیتی ہے۔

پھر جب شیخ مجیب نے جانے کی بات کی تو میں بھی اٹھ کھڑا ہوا تاکہ اسے باہر تک چھوڑ آؤں۔ اگرچہ میں نے محسوس کیا کہ شیخ مجیب یہ نہیں چاہتا تھا کہ میں انہیں چھوڑنے جاؤں۔ ایک کمرے میں تین لوگ بیٹھے ہوئے تھے جن میں یحییٰ خان کے ملٹری سیکرٹری اور اس کا سیاسی جلاد جنرل عمر بھی شامل تھے۔ انہیں دیکھ کر شیخ مجیب چلایا کہ کمرہ خالی کرو۔ سب لوگ باہر چلے جاؤ۔ میں نے مسٹر بھٹو سے بات کرنی ہے۔ وہ تینوں کمرے سے باہر نکل گئے۔ شیخ مجیب میرے ساتھ بیٹھ گیا اور بولا برادر، برادر۔۔۔ میرے بھائی ہمیں کوئی معاہدہ کر لینا چاہیے۔ خدا کے نام پر میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ ہم یہ معاہدہ کر لیں۔

میں اس کی بات سن کر شدید حیران ہوا۔ میں اسے باہر لے گیا تاکہ کوئی اس کی بات نہ سن سکے۔ جب ہم باہر گئے تو اس نے انتہائی پرجوش سی آواز میں مجھے کہا کہ بھٹو صاحب! آپ مغربی پاکستان رکھ لو اور اسے مشرقی پاکستان دے دو۔ وہ بولا اس نے ایک خفیہ ملاقات کا بندوبست بھی کر لیا ہے۔ رات کے اندھیرے میں بھی وہ مجھے بلوائے گا اور وہ یہ سارے معاملات طے کریں گے۔

میں نے اسے بتایا کہ مجھے اس طرح کی چیزیں بالکل پسند نہیں ہیں۔ میں نے کہا کہ میں ڈھاکہ اس سے ایک چور کی طرح رات کے اندھیرے میں کیلے کے کسی درخت کے نیچے چھپ کر نہیں ملنے آیا ہوں اور نہ ہی میں پاکستان کو دو حصوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہوں۔ اگر وہ پاکستان کو دو حصوں میں تقسیم بھی کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ قومی اسمبلی میں یہ معاملہ اٹھائے اور اپنی عددی اکثریت پر بھروسہ کرے۔

مجھے یوں لگا کہ میں کسی دیوار سے باتیں کر رہا تھا۔ میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ میں اپنے ترجمان کے ذریعے بات چیت کو جاری رکھنے کے اعلان پر کچھ [illegible] کرتا۔ یہ تھی وہ ساری اصل کہانی اور وہ سارا قصہ۔ ان دنوں وہ ایک طرح سے پاگل بنا ہوا تھا۔ اس کا دماغ گھوم گیا تھا

پھر 25 مارچ کا دن آیا جس دن بنگالیوں کا بڑے وحشیانہ طریقے سے قتل عام ہوا۔

میں نے بھٹو صاحب سے پوچھا کہ کیا انہوں نے 25 مارچ کو کوئی عجیب و غریب چیزیں محسوس کی تھیں۔

بھٹو صاحب بولے یقیناً اس دن کوئی عجیب سا ماحول تھا۔ انہوں نے بھی ایک عجیب سی بے چینی محسوس کی تھی۔ وہ ہر شام یحییٰ خان سے ملنے جاتے اور اسے بتاتے کہ ان کے اور مجیب کے درمیان معاملات آگے نہیں بڑھ رہے تھے لیکن یحییٰ خان ان باتوں میں کوئی دلچسپی ظاہر نہ کرتے۔ وہ میری بات سن کر اپنا پیگ پورا کر لیتے یا پھر ٹیلی ویژن کی شکایتیں کرنے لگ جاتے۔ وہ اس بات پر بڑبڑاتے کہ راولپنڈی سے ابھی ان کا ریکارڈ نہیں پہنچا تھا اور وہ اپنی پسند کے گانے نہیں سن سکتے تھے۔ 25 مارچ کی شام جنرل یحییٰ نے مجھ سے ایک ایسی بات کہی جسے سن کر میں ششدر رہ گیا۔ وہ بولے آج مجیب سے ملنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کل صبح میں اور تم دونوں مجیب سے اکٹھے ملیں گے۔ میں نے پھر بھی کہا کہ ٹھیک ہے۔ میں نے اسی شام یہ بات شیخ مجیب کے ایک بندے کو بتائی تو وہ بولا "وہ کتے کا بچہ پہلے ہی ڈھاکہ سے چلا گیا ہے۔"

میں نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا۔ میں نے صدارتی رہائش گاہ فون کیا اور بتایا کہ میں یحییٰ خان سے بات کرنا چاہ رہا ہوں۔ مجھے بتایا گیا کہ ان سے بات نہیں ہو سکتی۔ وہ رات کے کھانے پر جنرل ٹکا خان کے ساتھ ہیں۔ میں نے ٹکا خان کو فون کیا تو وہاں سے مجھے بتایا گیا کہ ان سے بات نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ اس وقت یحییٰ خان کے ساتھ کھانے پر ہیں۔ اس وقت مجھے کچھ کچھ سمجھ آنا شروع ہو گئی تھی۔ مجھے شک پڑا کہ کوئی کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ اس کے بعد میں رات کا کھانا کھانے چلا گیا اور پھر سو گیا۔ میری آنکھ گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے کھلی۔ میں نے اپنے دوستوں کو کمروں سے بھاگنے کی آوازیں سنیں۔ میں دوڑ کر کھڑکی کی طرف گیا اور میں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں رو پڑا اور میرے منہ سے نکلا

My country is finished۔

میں نے بھٹو صاحب سے پوچھا کہ انہوں نے اپنی کھڑکی سے کیا دیکھا تھا؟

بھٹو صاحب بتانے لگے کہ اگرچہ لوگوں کو اندھا دھند نہیں مارا جا رہا تھا تاہم یہ ضرور تھا کہ فوجی [illegible] کے People نامی اخبار کے دفاتر کو گرانے کی کوشش کر رہے تھے جو ہمارے ہوٹل کے بالکل

www.freepdfpost.blogspot.com

!allurdupdfnovels.blogspot.com!

سامنے واقع تھے۔ فوجی لاؤڈ سپیکروں پر چیخ کر لوگوں کو اس جگہ سے دور جانے کا کہہ رہے تھے۔ جو لوگ باہر آئے انہیں مشین گنیں دکھا کر ایک طرف کر دیا گیا۔ دوسرے گروپس کو دوسری جانب مشین گنوں کی مدد سے وہیں پر روک لیا گیا تھا جبکہ ہوٹل کو ٹینکوں نے گھیرا ہوا تھا۔ جس نے بھی ہوٹل میں پناہ لینے کی کوشش کی وہ سیدھا فوجیوں کے ہاتھ لگا۔

میں نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

صبح آٹھ بجے جب میں وہاں سے روانہ ہوا تو مجھے پتہ چلا کہ شیخ مجیب کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ چلیں شیخ مجیب زندہ تھا۔ یہ بات میرے ذہن میں ضرور آئی کہ انہوں نے شیخ مجیب کے ساتھ بدتمیزی کی ہوگی۔ پھر میں نے سوچا کہ شاید اس کی گرفتاری سے اس کے ساتھ کمپرومائز کرنے میں آسانی رہے گی۔ وہ اسے ایک دو ماہ سے زیادہ جیل میں نہیں رکھیں گے اور اسی اثناء میں ہم ڈھاکہ میں لاء اینڈ آرڈر پر قابو پالیں گے۔

میں نے ان سے کہا کہ جناب صدر! مجیب نے آپ سے کہا کہ آپ مغربی پاکستان لے لو اور میں مشرقی پاکستان رکھ لیتا ہوں اور بعد میں بالکل یہی کچھ ہوا۔ کیا آپ شیخ مجیب سے اس بات پر نفرت کرتے ہیں؟

بھٹو صاحب نے زور سے کہا کہ بالکل نہیں اور میں یہ بات انڈین فیشن میں بھی نہیں کہہ رہا۔ میں آپ کو پورے خلوص سے کہہ رہا ہوں کہ میں اسے نفرت کرنے کے بجائے بہت زیادہ ہمدردی محسوس کرتا ہوں۔ اس میں نہ کامن سینس ہے نہ ہی کوئی کلچر۔ اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ اس پوزیشن میں ہی نہیں ہے کہ کوئی سیاسی، سماجی، معاشی یا مالی مسئلہ حل کر سکے۔ اسے صرف ایک ہی طریقہ آتا ہے کہ چلانا کیسے ہے۔ میں اسے 1954ء سے جانتا ہوں اور میں نے کبھی اسے سنجیدگی سے نہیں لیا۔ میری اس سے جس لمحے ملاقات ہوئی تھی میں اسی وقت سے اس کے بارے میں یہی رائے رکھتا ہوں کہ اس میں کوئی گہرائی نہیں تھی۔ وہ محض ایک Agitator تھا جس کے اندر بہت آگ بھری ہوئی تھی لیکن آئیڈیا ایک بھی نہیں تھا۔ اگر اس کے ذہن میں کوئی آئیڈیا تھا بھی سہی تو وہ علیحدگی پسندی کا تھا۔ اب ایسے شخص کے ساتھ آپ بھلا ہمدردی کا جذبہ محسوس کرنے کے علاوہ اور کیا محسوس کر سکتے ہیں۔

یہ 1961ء کی بات ہے۔ میں ڈھاکہ گیا اور میری شیخ مجیب سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ وہ

ہوٹل کی لابی میں بیٹھا تھا۔ میں چل کر اس کے پاس گیا اور کہا ہیلو مجیب! آؤ چائے کا ایک کپ پیتے ہیں۔

وہ ان ہی دنوں نیا نیا جیل سے باہر آیا تھا اور اس میں تلخی بھری ہوئی تھی اور ہم نے اس دفعہ بڑے تحمل سے گفتگو کی۔ شیخ مجیب مجھے بتا رہا تھا کہ کیسے مشرقی پاکستان کا مغربی پاکستان کے ہاتھوں استحصال ہو رہا تھا کہ اس پر ایک کالونی کی طرح حکومت کی جا رہی تھی۔ اس کا خون چوسا جا رہا تھا۔ شیخ مجیب کی یہ باتیں سچی تھیں۔ میں نے بالکل یہی باتیں ایک کتاب میں بھی لکھی تھیں۔ تاہم شیخ مجیب الرحمن نے ان باتوں سے کوئی نتیجہ نہیں نکالا۔ اس نے یہ وضاحت نہیں کی کہ غلطی معاشی نظام میں تھی۔ اس دور کے حکمرانوں میں تھی۔ اس نے اس وقت سوشلزم یا جدوجہد کی کوئی بات نہیں کی۔ اس کے برعکس اس نے کہا کہ مشرقی پاکستان کے لوگ اس وقت جدوجہد کے لیے تیار نہیں تھے اور کوئی بھی فوج کی مخالفت نہیں کر سکتا تھا۔ فوج کو چاہیے تھا کہ وہ ان ناانصافیوں کا خاتمہ کرے۔ اس کے اندر جرأت بھی تھی ہی نہیں۔ یا وہ واقعی اپنے آپ کو صحافیوں کے سامنے شیر بنگال کہتا ہے۔

بھٹو صاحب کی یہ بات سن کر میں نے کہا کہ ہاں وہ تو یہ بھی کہتا ہے کہ جب اس کا ٹرائل کیا گیا تو اس نے اپنا دفاع کرنے سے انکار کر دیا تھا اور گرفتاری کے بعد اس نے ایک ہیرو کی طرح کا رویہ اختیار کیا۔ اسے ایک ایسے سیل میں رکھا گیا جہاں سونے کے لیے ایک گدا تک بھی نہ تھا۔

بھٹو صاحب نے کہا کم آن۔ اسے کبھی کسی جیل کے سیل میں نہیں رکھا گیا۔ اسے ایک ایسے اپارٹمنٹ میں رکھا گیا تھا جو خصوصی طور پر بڑے اہم سیاسی قیدیوں کے لیے تیار کرایا گیا تھا۔ اسے پنجاب کی میانوالی کی جیل میں رکھا گیا تھا۔ یہ بات درست ہے کہ اسے پڑھنے کے لیے اخبارات اور سننے کے لیے ریڈیو فراہم نہیں کیا جاتا تھا۔ تاہم اس کے پاس گورنر پنجاب کی بہت بڑی لائبریری کی سہولت موجود تھی اور وہ وہاں بڑے اچھے طریقے سے رہا۔ کئی موقعوں پر تو اسے بنگالی خانساماں بھی دیا گیا کیونکہ وہ بنگالی ڈشز کھانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے ٹرائل کے موقع پر اپنا دفاع بھی کیا۔ اس نے اپنے دفاع کے لیے دو بڑے وکیلوں کمال حسین اور اے کے بروہی کی خدمات بھی مانگیں جو اس کا قانونی مشیر اور دوست بھی تھا۔ کمال حسین ان دنوں جیل میں تھا لیکن بروہی صاحب آزاد تھے۔ بروہی کو اپنا وکیل بنانے کا مقصد یہ تھا کہ آپ کے پاس بہتر سے بہتر وکیل آپ کا دفاع کرنے کے لیے موجود ہو۔ میں

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels.blogspot.com!!

آپ کو ایک اور بات بتاتا ہوں۔ پہلے تو بروہی نے اس کا وکیل بننے سے انکار کیا تاہم یحییٰ خان نے اسے مجبور کیا اور وہ شیخ مجیب کے مقدمے میں اپنے چار دیگر جونیئر وکیلوں کے ساتھ پیش ہوا۔ بروہی کے ساتھ صرف ایک ہی مسئلہ ہے کہ وہ بولتا بہت ہے۔ جب بھی وہ لائل پور سے کراچی واپس آتا تو وہ شیخ مجیب کے ساتھ کی گئی اپنی ساری گفتگو لوگوں کو سناتا اور کہتا کہ اسے مجرم ثابت کرنا بہت مشکل ہوگا۔ مجیب نے اسے بہترین انداز میں وہ ساری باتیں اسے بتائی ہوتیں کہ جیسے وہ جنرل یحییٰ کا بھی احترام کرتا تھا اور پاکستان توڑنے میں بھی اسے دلچسپی نہیں تھی۔ شیخ مجیب یہ بات کہتے ہوئے کبھی نہیں تھکتا تھا کہ یحییٰ خان ایک زبردست آدمی تھا۔ بہت بڑا محب وطن لیکن بھٹو نے اسے دور کر دیا تھا۔ شیخ مجیب کا خیال تھا کہ اس کی گرفتاری کا ذمہ دار بھٹو تھا۔ یہ مجھے جنرل پیرزادہ نے بھی مجھے بعد میں کنفرم کی تھی اور میں نے اسے کہا تھا کہ آپ اسے میرے حوالے کر دیں۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ مجھے بھی یہی کہے گا کہ بھٹو ایک زبردست انسان، بہت بڑا محب وطن ہے اور آپ لوگوں کی بے عزتی کرے گا۔

میں نے کہا کہ بھٹو صاحب! شیخ مجیب کو تو اس ٹرائل میں باقاعدہ سزا بھی سنائی گئی تھی؟

بھٹو صاحب بولے نہیں ایک اسپیشل ٹریبونل نے اسے مجرم قرار دیا تھا۔ اس کے بعد مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے طور پر یہ پاور یحییٰ خان کے پاس تھے کہ وہ سزا کا فیصلہ کرے جو پانچ سال سے لے کر عمر قید یا سزائے موت ہو سکتی تھی۔ یحییٰ خان نے کوئی فیصلہ نہیں کیا کیونکہ جنگ پہلے ہی شروع ہو چکی تھی۔ اس کے ذہن پر اور بہت ساری چیزیں سوار تھیں۔

میں نے کہا کہ بھٹو صاحب! شیخ مجیب نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی قبر تک کھود دی گئی تھی۔

بھٹو صاحب بولے کہ کیا آپ کو پتہ ہے کہ یہ قبر کیا تھی۔ یہ ایئر ریڈ شیلٹر تھی۔ انہوں نے جیل کی دیواروں کے ارد گرد کھدائی کی ہوئی تھی۔ بیچارہ مجیب وہ اتنا خوفزدہ تھا کہ وہ ہر چیز کو اپنی موت کا پروانہ سمجھتا ہے۔ میرا نہیں خیال کہ یحییٰ خان اسے قتل کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ 27 دسمبر کو جب مجھے پاکستان کے نئے صدر کا حلف دیا گیا تو میں جنرل یحییٰ خان سے ملا۔ اس وقت وہ نشے میں دھت تھا اور Dorian Gray کے پورٹریٹ کی طرح لگ رہا تھا۔ یحییٰ خان نے مجھے بتایا کہ "میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ میں نے شیخ مجیب کو پھانسی پر نہیں چڑھایا۔ تم اگر چاہتے ہو تو یہ کام کر گزرو۔"

میں نے بھٹو صاحب سے پوچھا پھر کیا ہوا؟

بھٹو صاحب بولے میں نے [...] میں اسے پھانسی نہیں لگاؤں گا اور بار بار سوچنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے شیخ مجیب کو رہا کر دینا چاہیے۔ پاکستان آرمی کے مظالم کی کہانیوں کے بعد جس کی ہر طرف سے مذمت کی جا رہی تھی، میرے ملک کو چند ہمدردیوں کی ضرورت بھی تھی۔ میرا خیال تھا کہ شیخ مجیب کی رہائی کے بعد ہمیں زیادہ ہمدردیاں ملیں گی۔ اس کے علاوہ میرے ذہن میں یہ بھی تھا کہ اس کی رہائی سے اچھا پیغام جائے گا اور ہمارے جنگی قیدی جلدی واپس آ سکیں گے۔ یہ سوچ کر میں نے فوری طور پر حکم دیا کہ شیخ مجیب کو لائل پور سے راولپنڈی لایا جائے۔ جب شیخ مجیب کو یہ آرڈرز دیے گئے تو وہ خوفزدہ ہو گیا اور سسکیاں بھرنے لگا کہ وہ اسے باہر نکال کر مار دیں گے۔ وہ لائل پور سے راولپنڈی کے سفر کے دوران بھی پُرسکون نہیں تھا۔ اس کی اس وقت بھی تسلی نہیں ہوئی جب اسے بڑے خوبصورت بنگلے میں لے جایا گیا۔ وہ خوبصورت بنگلہ چند بڑے لوگوں کے استعمال کے لیے مخصوص تھا۔ جب میں وہاں اپنے ساتھ ایک ریڈیو، ایک ٹیلی ویژن سیٹ اور کپڑوں کا ایک بنڈل لے کر گیا تو اس نے میرے اوپر چڑھائی کر دی۔ وہ بولا تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اس وقت پاکستان میں صدر بن چکا ہوں۔ یہ سن کر اس کی آواز فوراً بدل گئی۔ وہ آ کر میرے گلے لگ گیا اور بولا کہ یہ اس کی زندگی کی سب سے اچھی خبر ہے اور یہ کہ خدا اسے ہمیشہ بچانے کے لیے مجھے وقت پر بھیج دیتا ہے۔ میں اس سے پہلے بھی اسے ایک دفعہ اسی طرح جیل سے نکلوا چکا تھا۔ جیسا کہ میرا اندازہ تھا شیخ مجیب نے جنرل یحییٰ خان پر تنقید شروع کر دی۔ اپنی اس تنقید میں وہ وقفہ صرف اس وقت کرتا جب وہ مجھ سے یہ پوچھتا کہ کیا وہ اب اپنے آپ کو آزاد سمجھے۔ اسے بذریعہ لندن ڈھاکہ جانے سے پہلے میں اس سے دو دفعہ ملا اور دونوں دفعہ اس نے قرآن پاک نکالا اور اس پر ہاتھ رکھ کر قسم کھا کر کہا کہ وہ مغربی پاکستان کے ساتھ تعلقات رکھے گا۔ جب وہ جہاز پر سوار ہوا تو اس نے تب بھی قرآن پاک پر قسم کھائی۔ جب میں اسے صبح تین بجے چھوڑنے ایئرپورٹ گیا تو یقین کریں میں اس کی ان باتوں سے متاثر ہو گیا تھا۔ اس نے ایک اور قسم کھائی، مجھے گلے سے لگایا، میرا شکریہ ادا کیا اور ہمیشہ کے لیے میرا ممنون رہنے کی باتیں کیں۔ جہاز پر چڑھنے سے پہلے وہ مجھ سے بولا کہ صدر صاحب! میں بہت جلد واپس آؤں گا۔ میں اب آپ کے ملک کو بہتر طریقے سے جاننا چاہتا ہوں۔ میں اب یہاں بار بار آتا رہوں گا۔

میں نے بھٹو صاحب سے پوچھا کہ کیا کبھی انہیں شیخ مجیب کو رہا کرنے کا افسوس ہوا؟

www.freepdfpost.blogspot.com

alllurdupdfnovels.blogspot.com

بھٹو صاحب نے کہا نہیں، ابھی بھی نہیں اور کبھی بھی کوئی بات ہے وہ دوسری طرف ایک پاکستان ہے
اور ہم دونوں پر ہر طرح کی ایک طرف کے اثرات لگتے رہے ہیں۔ ہم نے ایک طرف کے حملے وغیرہ کا سامنا
کیا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود بھی اور ہمارے درمیان ایک تعلق موجود ہے۔ میں آج بھی اسے یاد کرتا
ہوں جب مجھے ادھوری کا وہ دن یاد آتا ہے جب اس نے پھر سے بازو کھول دیے تھے اور سسکیاں لے کر
درخواست کی تھی کہ مجھے بچاؤ، بچاؤ۔ میں واقعی اس کے لیے ہمدردی محسوس کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ
مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ بے چارہ مجیب زیادہ دیر تک اقتدار میں نہیں رہے گا۔ آٹھ ماہ گزر گئے ہیں۔ ابھی
ایک سال پورا ہوگا اور یہ بادی جو وہ ہمیشہ سے چاہتا تھا وہ اسے خود نگل جائے گی۔ آج آپ دیکھ رہی
ہیں بنگلہ دیش انڈیا کا سیٹلائٹ بنا ہوا ہے۔ بہت جلد یہ روس کا سیٹلائٹ بنے گا اور مجیب کمیونسٹ نہیں
ہے۔ اگر مجیب ان تمام معاملات کو اچھے طریقے سے سنبھال بھی لے جس کا امکان مجھے نہیں لگتا تو بھی
بہت جلد اس کا سامنا Maoists سے ہوگا جو اس جنگ کے اصل فاتح ہیں۔ وہ پہلے ہی اس پر دباؤ بڑھا
رہے تھے۔ سیاسی طور پر مکتی باہنی کچھ بھی نہیں۔ اگر معاشرتی طور پر دیکھا جائے تو وہ ایک طرح سے کوئی
خطرہ ہی نہیں۔ مکتی باہنی کو صرف ایک چیز آتی ہے کہ ہوا میں گولی کیسے چلانی ہے۔ لوگوں کو خوفزدہ کیسے کرنا
ہے۔ کیسے مال چرانا ہے اور Joi Bangla کے نعرے کیسے لگانے ہیں۔ اور آپ محض نعرے لگا کر ایک
ملک نہیں چلا سکتے جبکہ دوسری طرف بنگالی Maoists نے ماؤزے تنگ کی آدھی لال کتاب پڑھی ہوئی
ہے لیکن وہ سمجھدار ہیں اور بھارتیوں کو یہ اجازت نہیں دیتے کہ وہ انہیں استعمال کر سکیں۔ میرا انہیں خیال
کہ وہ پاکستان کے اتحاد کے خلاف ہیں۔ آپ دیکھیے گا برتری انہی کو ہی ملے گی۔ اتنے خوفناک اور
پیچیدہ مسائل کا سامنا کرنے کے لیے آپ کو ایک جینئس کی ضرورت ہوگی۔ اب آپ ذرا تصور کریں کہ
شیخ مجیب الرحمٰن جیسا شخص ان تمام مسائل سے ڈیل کر رہا ہے اور پھر یہ زمین (بنگلہ دیش) بہت بدنصیب
دھرتی ہے۔ سمندری طوفان، سیلاب اور دیگر مصیبتیں ہر وقت چلتی رہتی ہیں۔ ان کے بارے میں کہا
جائے گا کہ وہ کسی منحوس ستارے کے زیر اثر پیدا ہوا تھا۔ آپ نے ڈھاکہ کو 1947ء میں دیکھا تھا اور
1954ء میں بھی، ایک گندہ سا گاؤں جہاں گلیاں تک نہیں تھیں اب وہاں ہر چیز تباہ ہو چکی ہے اور اسے
تباہ کرنے میں بنگلہ دیش کی مکتی باہنی کے ڈاکا ایجنٹس نے بڑا کردار ادا کیا ہے۔

میں نے جب بھٹو صاحب کے منہ سے بنگلہ دیش کا نام سنا تو میں بڑی حیران ہوئی اور ان سے

کہا کہ آپ کے منہ سے بنگلہ دیش کا نام سن کر مجھے حیرت ہو رہی ہے!

بھٹو صاحب میری حیرانی دیکھ کر بولے کہ صاف ظاہر ہے میں بنگلہ دیش کا نام لیتے اور نفرت
کے ساتھ لے رہا ہوں۔ میرے لیے تو ابھی تک یہ مشرقی پاکستان ہے۔ اب کچھ غلط۔ اگرچہ بھی
بھارتیوں کی فوجی کارروائی کا نتیجہ ہے۔ پچاس ملک اسے تسلیم کر چکے ہیں۔ اب مجھے بھی اسے تسلیم کرنا
پڑے گا۔ میں بھی اسے تسلیم کرنے کو تیار ہوں اگر بھارت ہمارے قیدی واپس کرے اور بہاریوں کا وہاں
قتل عام بند کیا جائے اور پاکستان کے حامیوں کو نہ مارا جائے۔ اگر ہم نے دوبارہ ایک فیڈریشن میں ضم
ہونا ہے تو ہمیں سفارتی تعلقات قائم کرنے چاہئیں۔ میرا خیال ہے کہ اگلے پندرہ سالوں میں پاکستان
اور بنگلہ دیش دوبارہ ایک فیڈریشن بن سکتے ہیں۔ یہ بن سکتے ہیں اور انہیں بننا بھی چاہیے ورنہ اس
کمی کو کون پورا کرے گا۔ دوسری طرف مغربی بنگال بھی بھارت سے علیحدگی چاہتا ہے۔ مشرقی بنگالیوں
اور مغربی بنگالیوں میں کوئی چیز مشترک نہیں ہے جبکہ ہمارے اور مشرقی پاکستان کے بنگالیوں کے درمیان
ایک مذہب مشترک ہے۔ 1947ء میں ہونے والی تقسیم بہت اچھی تھی۔

میں نے کہا کہ بھٹو صاحب آپ بھول گئے۔ کیا آپ نے ایک ایسا ملک 1947ء میں بنایا جو ایک
دوسرے سے دو ہزار کلومیٹر دور اور درمیان میں انڈیا تھا۔

بھٹو صاحب بولے کہ آپ یہ بات کیوں بھول رہی ہیں کہ یہ دونوں علاقے باوجود بہت ساری
مشکلوں کے پچیس سال تک ایک ملک کا حصہ رہے۔ ایک ریاست محض علاقائی یا جغرافیائی تصور بھی نہیں
ہوتی۔ جب آپ کا جھنڈا، قومی ترانہ، مذہب ایک ہو تو پھر فاصلوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب
مغلوں نے انڈیا کو اکٹھا کیا تھا تو مسلمانوں کو اس کے دوسرے حصے تک پہنچنے کے لیے پورا ایک سو سال
لگتا تھا۔ اب ہوائی جہاز کے ذریعے محض دو گھنٹے لگتے ہیں۔ کیا آپ میری بات سمجھ رہی ہیں۔

میں نے کہا جناب صدر! نہیں۔ مجھے اندرا گاندھی کی بات زیادہ بہتر سمجھ میں آتی ہے جب وہ یہ
کہتی ہیں کہ 1947ء کی تقسیم غلط تھی اور 1970ء کی دہائی میں مذہب کی لڑائی ایک احمقانہ چیز تھی!

بھٹو صاحب بولے، مسز گاندھی کے ذہن میں صرف یہ خواب ہے کہ وہ پورے برصغیر پر قبضہ کر
کے ہمیں اپنی رعایا بنانا چاہتی ہے۔ وہ ایک کنفیڈریشن بنا کر پاکستان کو دنیا کے نقشے سے غائب کرنا
چاہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ یہ کہتی ہیں کہ ہم آپس میں بھائی بھائی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ہم بھائی بھائی نہیں

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels.blogspot.com!!

[illegible]

...نہیں ہے۔

آپ کو پتہ ہے کہ ہندوستان میں بھی [illegible] ہیں جیسے اندرا گاندھی [illegible] کہ ہم ان کے بارے میں اس طرح سوچیں۔ وہ اپنی ماں [illegible] کی عزت کرتے ہیں لیکن مسلمانوں کی نہیں۔ انہوں نے ہمیشہ ہمارے ساتھ برا سلوک کیا اور ہماری بے عزتی کی۔ میں اس ایک واقعے کو نہیں بھول سکتا جو میرے ساتھ 1944ء میں پیش آیا۔ میں چھٹیوں میں اپنے والدین کے ساتھ کشمیر گیا ہوا تھا۔ میں ایک پہاڑی پر اچھل کود کر رہا تھا جیسے بچے کرتے ہیں۔ مجھے شدید پیاس لگی۔ میں ایک شخص کے پاس گیا جو پانی بیچ رہا تھا اور اس سے میں نے پینے کے لیے پانی مانگا۔ اس شخص نے پانی کا گلاس بھرا اور جونہی مجھے دینے لگا وہ اچانک رک گیا اور پوچھا کہ تم ہندو ہو یا مسلمان؟ میں سوال کا جواب دینے کے لیے تھوڑی دیر کے لیے جھجکا کیونکہ مجھے شدید پیاس لگی ہوئی تھی۔ خیر میں نے ہمت کر کے کہا کہ میں مسلمان ہوں۔ یہ سن کر اس شخص نے وہ پانی زمین پر گرا دیا۔

اب تم جا کر یہ واقعہ اندرا گاندھی کو ضرور بتانا۔

کیا آپ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے نہیں ہو سکتے۔ میں نے بھٹو صاحب سے پوچھا۔

بھٹو صاحب بولے میں اندرا گاندھی کی عزت تک نہیں کرتا۔ وہ میرے نزدیک ایک معمولی سی عورت ہے جس میں اوسط درجے کی ذہانت ہے۔ اس میں بڑے لوگوں والی کوئی بات نہیں ہے۔ محض

[illegible]

... ہے۔ میری اس سے پہلی ملاقات لندن میں ہوئی تھی۔ مجھے اس میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی جس سے میں [illegible] ہوتا۔ ہم دونوں وہاں ایک لیکچر سننے کے لیے اکٹھے ہوئے تھے۔ وہ بڑی سنجیدگی سے اس لیکچر کے نوٹس لے رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تم نوٹس لے رہی ہو یا تھیسس لکھ رہی ہو۔ اب اگر تھیسس کی بات چل پڑی ہے تو میں اب آپ کو یہ بتا چلوں کہ میں یہ نہیں مان سکتا کہ وہ آکسفورڈ یونیورسٹی سے ڈگری لینے میں کامیاب بھی ہوئی تھی۔ میں نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں اپنی تین سالہ ڈگری کو دو سالوں میں مکمل کیا تھا جبکہ وہ تین سالوں میں بھی اپنا کورس مکمل نہیں کر سکی تھی۔

بھٹو صاحب کی یہ باتیں سن کر میں ان سے یہ کہے بغیر نہ رہ سکی کہ آپ مسز گاندھی کے ساتھ کہیں زیادتی تو نہیں کر رہے ہیں۔ اگر ان میں کوئی ایسی خاص بات نہ ہوتی تو بھلا وہ اتنے عرصے تک کیسے اقتدار میں رہ سکتی تھیں یا آپ یہ بات اس لیے کہہ رہے ہیں کہ وہ ایک عورت ہے اور اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے؟

بھٹو صاحب فوراً بولے نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ پاکستان کا سربراہ ہونے کے ناطے میں عورتوں کے خلاف نہیں ہوں۔ تاہم میں یہ نہیں سوچتا کہ عورتیں مردوں سے بہتر ریاست کی سربراہ ہو سکتی ہیں۔ میری مسز گاندھی کے بارے میں رائے آبجیکٹیو ہے۔ اس میں کوئی ذاتیات نہیں

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels.blogspot.com!!

ہے۔ میں یہ بات اس لیے بھی نہیں کہہ رہا کہ وہ ہمارے نوّے ہزار فوجی واپس کرنے کو تیار نہیں ہے اور نہ اس کوشش کا احترام نہیں کر رہی۔ میں تو آپ کو وہ بتا رہا ہوں جیسا میں نے اسے پایا ہے۔ وہ ایک ایسی خاتون ہیں جن میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بالکل نہیں ہے۔ ٹھیک ہے کہ آج وہ ان دنوں سے زیادہ بہتر ہیں جب وہ آکسفورڈ میں پڑھتی تھیں یا لندن میں ہونے والے ایک لیکچر میں بیٹھی نوٹس لے رہی تھیں۔ اقتدار نے اسے اعتماد دیا ہے اور کامیابی سے بہتر کوئی اور چیز نہیں ہوتی، لیکن اصل سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسے اس کی خوبیوں سے زیادہ کامیابی ملی ہے۔ اگر پاکستان اور انڈیا نے ایک کنفیڈریشن بنا لی تو مجھے مسز اندرا گاندھی سے ان کا یہ عہدہ لینے میں کوئی مسئلہ نہ ہوتا۔ میں ان سے Intellectual Confrontations سے بھی خوفزدہ نہیں ہوں۔ یہ سب کچھ کہنے کے باوجود بھی میں مسز گاندھی سے کسی بھی جگہ ملنے کو تیار ہوں جہاں وہ پسند کریں۔ میں نیو دہلی جا کر بھی ان سے ملاقات کے لیے جا سکتا ہوں۔ جی ہاں! میں ان سے ملنے کے لیے نیو دہلی بھی جانے کو تیار ہوں۔ تاہم، جو بات مجھے پریشان کرتی ہے وہ یہ ہے کہ مجھے بھارتی فوج گارڈ آف آنر پیش کر رہی ہے اور میں اندرا گاندھی سے ملاقات کر رہا ہوں۔ یہ دونوں چیزیں مجھے پتہ نہیں کیوں اچھی نہیں لگتیں۔ خدارا مجھے ان دونوں چیزوں کے بارے میں سوچنے پر مجبور بھی نہ کرو۔

بھٹو صاحب نے مجھ سے پوچھ لیا کہ آپ یہ باتیں چھوڑیں اور مجھے یہ بتائیں کہ مسز اندرا گاندھی نے ان کے بارے میں مجھے اپنے انٹرویو میں کیا کہا تھا۔

میں نے بھٹو صاحب کو جواب دیا کہ وہ کہتی تھیں کہ آپ ایک غیر متوازن شخصیت کے مالک انسان ہیں۔ آپ ایک دن ایک بات کرتے ہیں اور دوسرے دن دوسری۔ وہ یہ بھی کہتی تھیں کہ آپ کے بارے میں کسی کو کوئی پتہ نہیں چلتا کہ آپ کے ذہن میں کیا ہے۔

بھٹو صاحب بولے۔ واقعی؟

بھٹو صاحب نے کہا میں آپ کو اس کا بڑا سیدھا سا جواب دیتا ہوں۔ مجھے مشہور فلاسفر لاک کی صرف ایک بات اچھی لگتی ہے کہ Consistency is a virtue of small minds (اگرچہ بھٹو صاحب نے یہ مشہور فقرہ لاک کے نام سے کہا۔ دراصل یہ بات ایمرسن نے کی تھی۔ اس نے کہا تھا A foolish consistency is the hobgoblin of little minds۔ مترجم)

بھٹو صاحب نے کہا کہ دوسرے لفظوں میں میرے خیال میں آپ کا بنیادی تصور ضرور ایک ہونا چاہیے لیکن اس کے اندر بھی تبدیلی کی گنجائش ہونی چاہیے۔ آپ بھی ایک پول پر چلے جائیں تو بھی موسم ہے۔ ایک دانشور کو صرف ایک خیال کے ساتھ چپٹ کر نہیں رہنا چاہیے۔ اس کے خیالات میں لچک ہونی چاہیے ورنہ اس کے خیالات ڈرامے یا فلم میں کسی کردار کی لمبی تحریر جیسے ہی ہوں گے۔ یہ بات سیاستدان پر بھی صادق آتی ہے۔ سیاست بھی ایک تحریک کی طرح ہوتی ہے اور ایک سیاستدان کو بھی سوالی رہنا چاہیے۔ اسے کبھی رائٹ تو کبھی لیفٹ کی طرف گھومنا چاہیے تو کبھی اس کے اندر تضادات اور شکوک بھی ابھرنے چاہئیں۔ اسے مسلسل اپنے آپ کو بدلتے رہنا چاہیے۔ چیزوں کو ٹیسٹ کرتے رہنا چاہیے اور ان پر ہر سائیڈ سے حملہ کرتے رہنا چاہیے تاکہ وہ اپنے مخالفین کے کمزور پوائنٹ اور وہ ان پر حملہ کر سکے۔ اس شخص پر ترس کھانا چاہیے جو ہر وقت اپنے ایک بنیادی خیال سے چمٹا رہے اور اس سے ہمدردی کرنی چاہیے کہ اگر وہ اپنے اس بنیادی نقطے کا انکشاف کرتا ہے۔ بظاہر ایک غیر مستقل مزاجی کسی بھی ذہین شخص اور منجھے ہوئے شخص کی بہت بڑی خوبی ہوتی ہے۔ اگر یہ بات مسز اندرا گاندھی کو سمجھ نہیں آتی تو پھر مجھے یہ کہنے میں حرج نہیں ہے کہ وہ اپنے سیاسی پیشے کی اس خوبصورتی سے ناآشنا ہے۔ یہ بات بہرحال مسز گاندھی کے والد نہرو کو اچھی طرح پتہ تھی۔

میں نے بھٹو صاحب کو بتایا کہ اندرا گاندھی تو کہتی ہیں کہ ان کے والد صاحب نہرو سیاستدان نہیں بلکہ ایک Saint تھے۔ (یہ خطاب دراصل رومن کیتھولک اور آرتھوڈکس چرچ ایک بہت ہی اچھے اور نیک انسان کو اس کی موت کے بعد دیا کرتے تھے۔ مترجم)

بھٹو صاحب فوراً بول پڑے اور ان کے منہ سے نکلا اوہ۔ مسز گاندھی اپنے باپ کے بارے میں یہ غلط بات کہہ رہی ہیں۔ ان کا باپ ایک بہت عظیم سیاستدان تھا۔ میری خواہش تھی کہ ان میں اپنے باپ کی آدھی خوبیاں بھی ہوتیں۔ اگرچہ نہرو پاکستان کے قیام کے خلاف تھا لیکن پھر بھی میں اس کی خوبیوں کا معترف ہوں بلکہ جب میں نوجوان تھا تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں ان کا بہت بڑا فین تھا۔ یہ تو مجھے بعد میں پتہ چلا کہ ان میں بھی بہت ساری خامیاں تھیں۔ ان کے حصے کی اپنی ناکامیاں تھیں۔ ان میں بھی کمزوریاں تھیں اور وہ سنتان، چرچل یا موزے تنگ کی کلاس سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔

بھٹو صاحب نے پھر مجھ سے پوچھا کہ اس کے علاوہ مسز گاندھی نے ان کے بارے میں اور کیا کہا؟

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

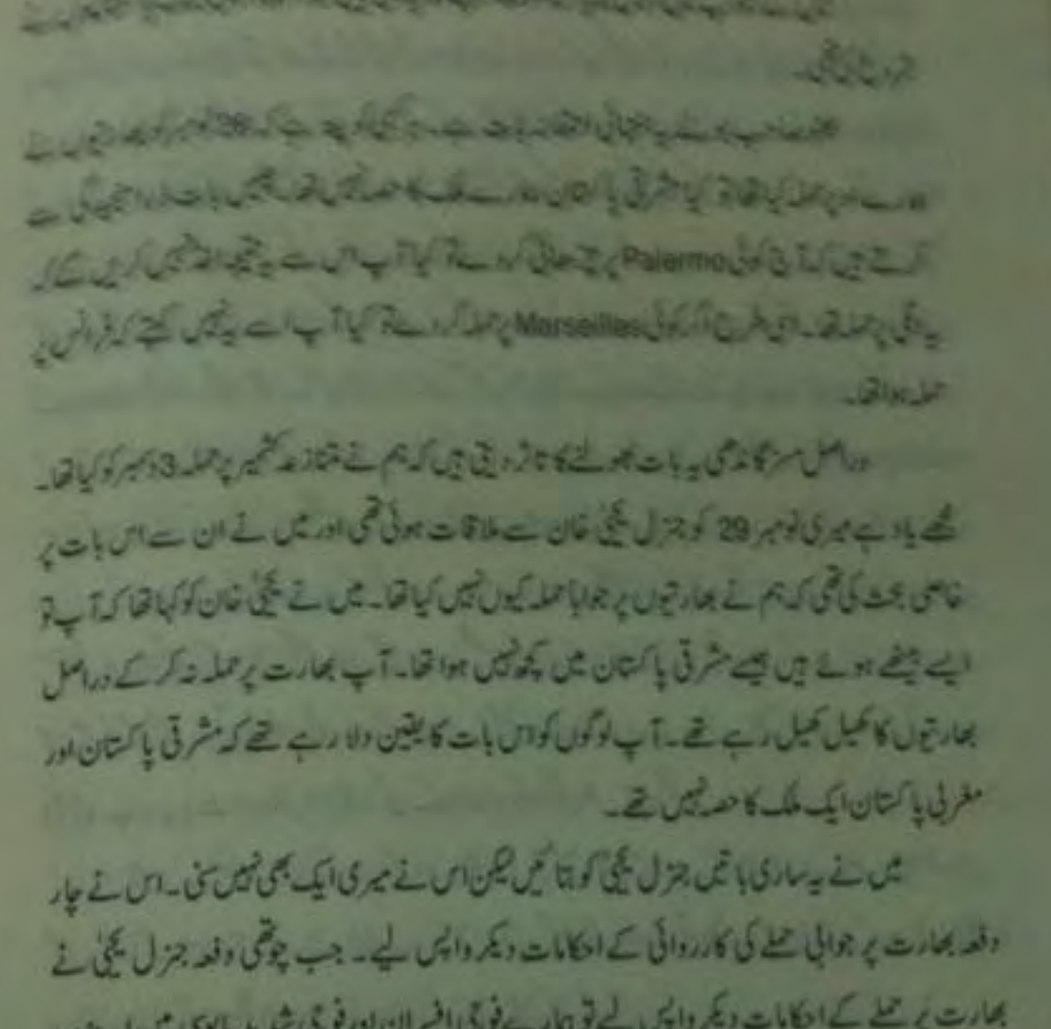

[illegible] 1971 [illegible]

[illegible]

[illegible] 38 [illegible]

[illegible] مشرقی پاکستان ہمارے ملک کا حصہ تھا [illegible]

کرتے ہیں کیا آج کوئی Palermo پر حملہ کر دے تو کیا آپ اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کریں گے کہ سسلی پر حملہ تھا۔ اسی طرح اگر کوئی Marseilles پر حملہ کر دے تو کیا آپ اسے یہ نہیں کہیں گے کہ فرانس پر حملہ ہوا تھا۔

دراصل مسز گاندھی یہ بات بھولنے کو تیار نہیں ہیں کہ ہم نے مقبوضہ کشمیر پر حملہ 3 دسمبر کو کیا تھا۔ مجھے یاد ہے میری نومبر 29 کو جنرل یحییٰ خان سے ملاقات ہوئی تھی اور میں نے ان سے اس بات پر خاصی بحث کی تھی کہ ہم نے بھارتیوں پر جوابا حملہ کیوں نہیں کیا تھا۔ میں نے یحییٰ خان کو کہا تھا کہ آپ تو ایسے بیٹھے ہوئے ہیں جیسے مشرقی پاکستان میں کچھ نہیں ہوا تھا۔ آپ بھارت پر حملہ نہ کر کے دراصل بھارتیوں کا کھیل کھیل رہے تھے۔ آپ لوگوں کو اس بات کا یقین دلا رہے تھے کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان ایک ملک کا حصہ نہیں تھے۔

میں نے یہ ساری باتیں جنرل یحییٰ کو بتائیں لیکن اس نے میری ایک بھی نہیں سنی۔ اس نے چار دفعہ بھارت پر جوابی حملے کی کارروائی کے احکامات دیکر واپس لیے۔ جب چوتھی دفعہ جنرل یحییٰ نے بھارت پر حملے کے احکامات دیکر واپس لیے تو ہمارے فوجی افسران اور فوجی شدید مایوسی میں اپنے سر اپنے ٹینکوں کے ساتھ ٹکرا رہے تھے۔

جہاں تک ڈھاکہ کی بات ہے میں نے جنرل یحییٰ سے کہا کہ ہم باقی محاذ چھوڑ کر ڈھاکہ میں بیٹھ جاتے ہیں۔ ہم ڈھاکہ کو ایک بہت بڑا قلعہ بنائیں گے اور وہاں دس ماہ سے لے کر ایک سال تک بھارت سے جنگ لڑیں گے اور پوری دنیا ہمارے ساتھ ہوگی۔ تاہم، یحییٰ خان کے ذہن میں صرف ایک بات سمائی ہوئی تھی کہ کہیں بھارتی ہمارے چھوٹے سے علاقے پر بھی قبضہ نہ کر لیں اور وہاں بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرا دیں اور جب اسی جنرل یحییٰ نے جنرل نیازی کو بھارتی جنرل کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا تو میں نے خدا سے کہا تھا بہتر ہوتا کہ میں اس سے پہلے ہی مر جاتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میں اس

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

بھٹو صاحب نے کہا کہ ہاں میں اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ یہ واقعی ایک حقیقت ہے [illegible]

وقت تھے سے ہوا تھا۔ بھارتی اپنے غرور کی آخری حد تک پہنچے ہوئے تھے۔ مجھے اس چیز پر بڑی فکر تھا کہ بڑی بڑی طاقتیں بھارت سے خوفزدہ تھیں کہ کہیں وہ ان سے ناراض نہ ہو جائے۔ مجھے اپنے جذبات پر قابو نہ رہا اور میں نے پھر وہ تقریر کی تھی جس میں میں نے ان سب سے کہا تھا کہ آپ لوگ جائیں جہنم میں۔ میں اس وقت رو پڑا تھا۔ آپ حیران نہ ہوں میں کبھی کبھار روتا بھی ہوں۔ میں ہمیشہ اس وقت روتا ہوں جب میں کہیں ناانصافی ہوتے دیکھتا ہوں۔ میں ایک بہت جذباتی آدمی ہوں۔

میں نے بھٹو صاحب سے کہا کہ یعنی آپ ایک جذباتی، ایک مشکل اور ایک ایسے انسان ہیں جن کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جا سکتی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ سب سے زیادہ زیر بحث بھی رہتے ہیں۔ میرا خیال ہے بہتر ہوگا کہ ہم آپ کی شخصیت کے بارے میں تھوڑی سی گفتگو کریں۔ اب اس بات پر بات کرتے ہیں کہ آپ ایک بہت امیر آدمی ہیں پھر بھی آپ ایک سوشلسٹ ہیں۔ آپ مغربی انداز میں زندگی گزارتے ہیں اور پھر بھی آپ کی دو بیویاں ہیں۔

بھٹو صاحب بولے کہ میری شخصیت تضادات سے بھری ہوئی ہے اور مجھے ان کا علم بھی ہے۔ میں ان تضادات کو ایک دوسرے سے ملانے اور ان پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہوں لیکن مجھے اس میں کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ میں مشرق اور مغرب کا ایک عجیب سا ملاپ ہوں۔ میں نے ایک عام آدمی کی سی تعلیم حاصل کی ہوئی ہے اور ایک مسلم گھرانے میں میری پرورش ہوئی ہے۔ میرا ذہن مغربی اور میری روح مشرقی ہے۔ جہاں تک میری دو بیویوں کی بات ہے، میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میری شادی اس وقت کر دی گئی تھی جب میں 13 سال کا تھا۔ میری پہلی بیوی میری کزن تھی۔ میں 13 برس کا اور وہ 23 برس کی تھی۔ اس وقت تو مجھے یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ بیوی کیا چیز ہوتی ہے۔ جب انہوں نے مجھے بہلانے کی کوشش کی تو مجھے اس وقت شدید غصہ آیا تھا۔ مجھے اس وقت بیوی نہیں چاہیے تھی۔ میں کرکٹ کھیلنا چاہتا تھا۔ مجھے کرکٹ بہت پسند تھی۔ مجھے اس شادی پر راضی کرنے کے لیے انہوں نے

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels.blogspot.com!!

مجھے کرکٹ کے دو نئے بیگ خرید کر دیے۔ جونہی میری شادی کی رسومات ختم ہوئیں میں بھاگ کر کرکٹ کھیلنے چلا گیا۔

مجھے احساس ہے کہ میرے ملک میں ایسی بہت ساری چیزیں ہوتی ہیں جنہیں مجھے تبدیل کرنا چاہیے۔ میں پھر بھی اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں۔ میرے گاؤں میں تو میرے ساتھ کرکٹ کھیلنے والے ایک کھلاڑی دوست جس کی عمر اس وقت گیارہ سال تھی، کی شادی ایک 32 سالہ خاتون سے کر دی گئی تھی۔ وہ مجھے ہمیشہ کہتا تھا کہ یار تم تو خوش قسمت ہو کہ تمہاری بیوی 23 برس کی تھی اور تم 13 برس کے۔

جب میں اپنی دوسری بیوی نصرت کی محبت میں گرفتار ہوا تو میری عمر اس وقت 23 برس تھی۔
نصرت اس وقت لندن میں پڑھ رہی تھی۔ اگرچہ وہ ایرانی تھی اور ایران میں ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی روایت تھی، پھر بھی میرے لیے اسے شادی پر رضامند کرنا بہت مشکل تھا۔ میرے پاس اسے منانے کے لیے کوئی زیادہ دلیلیں نہیں تھیں۔ میں نے اسے صرف دو تین الفاظ ہی کہے تھے کہ کیا ہوا اگر میں پہلے سے شادی شدہ ہوں۔ لعنت بھیجو اس پر۔ اب میں یہ بات ضرور کہوں گا کہ اپنی پہلی بیوی کا خیال میرے ذہن میں کبھی نہیں آیا۔ نہ صرف یہ کہ وہ میری کزن ہے بلکہ یہ بھی کہ اب وہ میری ذمہ داری ہے۔ اس بچاری کی تمام عمر اس احمقانہ شادی کی وجہ سے تباہ ہو کر رہ گئی جو ایک 13 سال کے بچے سے کی گئی تھی۔ یہ ایک ایسی بیہودہ روایت ہے جس میں ہم سب پل بڑھ کر جوان ہوئے ہیں۔ وہ میرے لاڑکانہ والے گھر میں رہتی ہے۔ ہم اکثر ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ وہ زیادہ تر تنہا زندگی گزارتی ہے۔ وہ ماں ہی نہیں بن سکی جبکہ میری دوسری بیوی سے میرے چار بچے ہیں۔ میں نے اپنی پہلی بیوی کے ساتھ بہت کم وقت گزارا ہے۔ میں جونہی تھوڑا سا بڑا ہوا میں پڑھنے کے لیے لندن چلا گیا۔ یہ ناانصافی کی ایک اپنی داستان ہے۔ میں وزیر اعظم کی حیثیت سے وہ سب کچھ کروں گا جس سے لوگ دوسری شادی نہ کریں۔ پھر دوسری شادی کے بعد بہت بڑے معاشی مسائل بھی کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اکثر یہ بیویاں الگ گھروں اور شہروں میں رہتی ہیں جیسا کہ میرے ساتھ ہوا، لیکن اب ہر کوئی میری طرح بھی دو بیویاں مختلف شہروں اور گھروں میں افورڈ نہیں کر سکتا۔ اگرچہ میں کوئی اتنا امیر آدمی بھی نہیں ہوں۔

میں نے حیرانی سے بھٹو صاحب سے پوچھا، کیا آپ واقعی امیر نہیں ہیں؟

بھٹو صاحب نے فوراً جواب دیا کہ نہیں! میں اس طرح امیر نہیں ہوں جیسا آپ کے ہاں سمجھا

جاتا ہے۔ یہاں جس کے پاس بہت ساری زمین ہو اسے امیر سمجھا جاتا ہے جبکہ اس کے برعکس وہ یورپ کے ان نوابوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے جو شاندار بنگلوں میں رہتے ہیں اور زندہ رہنے کے لیے Gigolo کھیلتے ہیں۔ ہماری زمینیں خشک ہیں اور پیداوار کم ہے۔ اس لیے یہ کہنے کے بجائے کہ میں ایک امیر آدمی ہوں، آپ یہ کہہ سکتی ہیں کہ میں نسبتاً ایک امیر آدمی ہوں۔ میں ایک اچھی زندگی گزارتا ہوں۔ میری بہن بھی ایک اچھی لائف گزار رہی ہے۔ میرے بھائی نے بھی اچھی زندگی گزاری اور ہم اچھے سکولوں میں پڑھنے گئے لیکن ہم نے کبھی ایک روپیہ بھی ضائع نہیں کیا۔ میں کبھی بھی پلے بوائے نہیں رہا۔ جب میں امریکہ میں سٹوڈنٹ تھا اور بعد میں آکسفورڈ میں پڑھ رہا تھا، میں نے وہاں کوئی کار نہیں خریدی۔ میں نے پیسوں کو ہمیشہ بڑی احتیاط سے خرچ کیا ہے، مثلاً میں نے پیسے کو یورپ جانے اور اچھے لوگوں سے ملنے اور کتابیں خریدنے پر خرچ کیا ہے۔ اگر آپ میری لائبریری پر ایک نظر دوڑائیں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ میں نے اپنی دولت کا بڑا حصہ کتابوں پر خرچ کیا ہے۔ میرے پاس ہزاروں کتابیں ہیں جن میں بہت ساری پرانی اور نئی کتابیں ہیں۔ میں مطالعے سے بہت لطف اندوز ہوتا ہوں جس طرح سپورٹس سے! چند لوگ میرے اوپر یہ الزام لگاتے ہیں کہ میں ڈریس کپڑے پہنتا ہوں۔ یہ بات درست ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اپنی دولت کپڑوں پر اڑاتا ہوں۔ اچھے کپڑے پہننے کی وجہ یہ ہے کہ میں ایک صاف ستھرا انسان ہوں۔ میں نہانے اور کپڑے تبدیل کرنے سے محبت کرتا ہوں۔ میں ان بھارتی اور پاکستانی شہزادوں کے ساتھ کھڑا نہیں ہو سکتا جو گندے رہتے ہیں اور ان سے بُو آتی ہے۔ میرے پاس خوبصورت اور آرام دہ گھر ہیں۔ یہ بات بھی درست ہے، لیکن بہت بڑے عرصے تک میرے ان گھروں میں ایئر کنڈیشنر تک نہیں تھے۔ میں لوگوں کو کھلا پلا کر خوش ہوتا ہوں لیکن احمق اور بیوقوف لوگوں کو نہیں! مجھے رقص کرنا آتا ہے لیکن اس وجہ سے کیونکہ مجھے میوزک پسند ہے۔ دوسرے میں اس وقت دیوار پر لگا ہوا ایک ساکت پھول بن کر نہیں رہ سکتا جب دوسرے رقص میں مصروف ہوں اور آخر میں۔۔۔۔

میں نے بھٹو صاحب کی بات ان کے منہ سے اچک لی اور بولی کہ آخر میں آپ کی یہ ریپوٹیشن ہے کہ خوبصورت عورتیں آپ پر مرتی ہیں۔ آپ ایک Don Juan ہیں۔ جناب صدر! کیا یہ بات درست ہے؟

www.freepdfpost.blogspot.com

!!!allurdupdfnovels!!!blogspot!!!com!!!

بھٹو صاحب نے کہا کہ یہ بات بھی بہت بڑھا چڑھا کر بیان کی گئی ہے۔ میں ایک رومانٹک شخص ہوں اور میرا یہ خیال نہیں کہ رومانٹک ہوتے ہوئے بجز آپ ایک اچھے سیاستدان بن سکتے ہیں اور ایک رومانٹک شخص ہونے کے ناطے میرا خیال ہے کہ ایک تو آنکھ سے بجز آپ کو انسپائر کرنے کی اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ کسی کی محبت میں گرفتار ہونا یا کسی عورت کے دل کو فتح کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ آپ کو ان لوگوں پر رحم کرنا چاہیے جو محبت میں گرفتار نہیں ہوتے۔ آپ سیکڑوں دفعہ محبت میں گرفتار ہو سکتے ہیں اور میں بھی محبت میں گرفتار ہوتا ہوں۔ میں اخلاقیات پر بہت یقین رکھنے والا ایک شخص ہوں۔ میں عورتوں کی عزت کرتا ہوں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم مسلمان مرد، عورتوں کی عزت نہیں کرتے۔ وہ لوگ جو ایسا سوچتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ عورتوں کی عزت اور ان کا تحفظ کرنا ہمارے حضور پاک کی پہلی تعلیمات میں سے ایک ہے۔ میں جو اپنے آپ کو جسمانی تشدد کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ایک دفعہ ایک شخص کو اتنے کوڑے مارے کہ اس کے جسم سے خون نکل آیا۔ آپ کو پتہ ہے میں نے اسے اتنے کوڑے کیوں مارے کیونکہ اس نے ایک چھوٹی سی لڑکی کا ریپ کیا تھا۔ اس طرح ایک صبح میں غصے سے پاگل ہو گیا تھا جب میں نے یہ پڑھا کہ چند سو جا بطلیوں نے کراچی کے ساحل پر چند طالبعلم لڑکیوں کے کپڑے پھاڑ ڈالے تھے۔ یہ حواس کیسے کہ میں انہیں مارشل لاء کے ذریعے ٹھیک کروں گا۔ میں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ پڑھتا ہوں۔ اگر مجھے اس چیز کا یقین ہو گیا کہ بنگلہ دیش میں ہمارے فوجیوں نے وہاں کی عورتوں پر تشدد کیا تھا تو میں وہ پہلا شخص ہوں گا جو اس بات پر اصرار کرے گا کہ ایسے فوجیوں کو سزا دی جائے۔

میں نے گفتگو کا موضوع بدلنے کے لیے بھٹو صاحب سے کہا کہ چلیں کسی اور موضوع پر بات کرتے ہیں۔ آپ کے مارکسزم کی بات کرتے ہیں۔ آپ اپنے ان نظریات کا اپنی امارت اور اسلام کے نظریات سے کیسے ملاپ کرتے ہیں؟

بھٹو صاحب بولے میں محض معاشی معاملات میں اپنے آپ کو مارکسٹ کہتا ہوں۔ میں صرف معاشی معاملات میں مارکسٹ نظریے کو تسلیم کرتا ہوں۔ تاہم میں مارکسزم کی زندگی کے بارے میں پیش کی گئی تعبیروں اور اس سوال پر کہ خدا کا وجود ہے کہ نہیں جیسے سوالات پر یقین نہیں رکھتا۔ ایک اچھے مسلمان کی طرح میں خدا پر ایمان رکھتا ہوں۔ لہٰذا بالآخر میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ ایمان ایک ایسی چیز ہے جو وجود رکھتی ہے یا نہیں رکھتی۔ اگر ایمان کا وجود ہے تو پھر اس پر بحث کرنا فضول ہے۔ میں ایمان پر یقین رکھتا ہوں اور میں اسے مارکسزم کے کلاسیکل پہلوؤں کی وجہ سے ترک کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ میں اس بات پر بھی یقین رکھتا ہوں کہ اپنے آپ کو مارکسٹ اور مسلمان کہنا دو ایسی چیزیں ہیں جو ایک ساتھ چل سکتی ہیں خصوصاً پاکستان جیسے غیر ترقی یافتہ ملک میں جہاں سوشلزم کے علاوہ مجھے اور کوئی حل نظر نہیں آتا۔

میں نے پاکستان کی بات کی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں کوئی عالمی خدائی فوجدار تیار کر رہا ہوں۔ میں دوسرے لوگوں کے معاملات میں مداخلت نہیں کر رہا۔ میں صرف اپنے ملکی حقائق پر توجہ کرتا ہوں اور بس۔ میں ایک انقلابی شخص ہوں لیکن میں اچانک اور خونی انقلابات افورڈ نہیں کر سکتا۔ پاکستان ایسے انقلابات کا متحمل نہیں ہو سکتا اور اگر ایسا ہوا تو یہ بہت بڑی تباہی ہوگی لہٰذا مجھے احتیاط، صبر کے ساتھ اصلاحات متعارف کروانی ہوں گی اور ایسے اقدامات کرنے ہوں گے جو دھیرے دھیرے ہمیں سوشلزم کی طرف لے کر جائیں۔ جہاں ممکن ہو وہاں نیشنلائزیشن کی پالیسی اپنائی جائے اور جب ضرورت پڑے تو اس سے دور بھی رہا جائے۔ سب سے بڑھ کر ہم غیر ملکی سرمائے کی بھی قدر کریں گے جس کی ہمیں اس وقت ضرورت ہے۔ مجھے صبر سے کام لینا ہوگا۔ ایک ایسے سرجن کی طرح کام کرنا ہوگا جو معاشرے میں اپنی پوری قوت اور ہمت تک نہیں کھو بیٹھتا۔ یہ ایک بیمار معاشرہ ہے اور اگر آپ نے اس معاشرے کو بیماریوں سے مرنے سے بچانا ہے تو پھر آپ کو بہت زیادہ احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ آپ کو بڑے صبر کے ساتھ ایک زخم کے تندرست ہونے کا انتظار کرنا ہوگا۔ آپ کو اصلاحات کی کامیابی کے لیے بھی صبر سے کام لینا ہوگا۔ ہم صدیوں تک سوتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی تو دیکھیں کہ شروع میں لینن جیسے انقلابی لیڈر کو بھی کمپرومائز کرنے پڑ گئے تھے۔

میں بولی کہ بھٹو صاحب! بہت سارے لوگ آپ کی ان باتوں پر یقین نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ آپ کو صرف طاقت چاہیے اور کچھ نہیں اور اقتدار میں رہنے کے لیے آپ کچھ بھی کر گزریں گے اور آپ کبھی بھی ان چیزوں سے دستبردار نہیں ہوں گے جو اس وقت آپ کے پاس ہیں؟

بھٹو صاحب بولے کہ یہ بالکل غلط ہے۔ میں نے تین مہینوں میں زرعی اصلاحات کی ہیں اور میرے اپنے خاندان کو 45 ہزار ایکڑ زمین چھوڑنی پڑی ہے۔ میری اپنی ذاتی چھ سے سات ہزار ایکڑ

www.freepdfpost.blogspot.com

allurdupdfnovels.blogspot.com

دونوں ان اصطلاحات میں بٹی گئی ہے۔ میں ابھی بھی مرد ہوں لیکن ان اصطلاحات میں گھوڑوں گا۔ میرے بچے بھی اپنی راہیں نکالیں گے۔ خدا میرا گواہ ہے کہ میں سوشلزم کے خلاف کھیل نہیں کھیلا ہوں۔ میں کوئی ہولوسی کی بنیاد پر ان اصطلاحات پر وجہ سے جو میرے کام نہیں کر دیا۔ جس دن میں نے مارکس کو پڑھا تھا اس دن سے مجھے ان چیزوں کو چھوڑنے میں کوئی خوف محسوس نہیں ہوا جو میری ہیں۔ میں آپ کو وہ جگہ اور وقت بھی بتا سکتا ہوں جب میں نے مارکس کو پہلی دفعہ پڑھا تھا یعنی 1945ء۔

جہاں تک میرے اوپر الزامات کی بات ہے کہ میں صرف اقتدار کا بھوکا ہوں میرا خیال ہے کہ یہ بڑا ضروری ہے کہ ہم یہ بات سمجھیں کہ طاقت کیا چیز ہوتی ہے۔ میرے نزدیک پاور وہ نہیں ہوتا جو جنرل یحییٰ کے پاس تھا۔ طاقت سے میری مراد ہے وہ چیز جس سے آپ پہاڑوں کو گرا کر زمین برابر کرتے ہیں۔ جس سے صحراؤں میں پھول کھلتے ہیں اور ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیتے ہیں جہاں بھوک اور ذلت سے کوئی نہیں مرتا۔ میں ڈکٹیٹر نہیں بننا چاہتا لیکن اس وقت میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے بہت زیادہ سخت ہونا پڑے گا۔ میں جن ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو دوبارہ جوڑنے کی کوشش کر رہا ہوں وہ کرچیوں میں بکھری ہوئی ہیں۔ مجھے کرچیاں اٹھا کر باہر پھینکنی ہوں گی اور اگر میں نے ان کرچیوں کو پھینکتے وقت احتیاط نہ کی تو یہ ملک نہیں رہے گا۔ میرے پاس صرف ایک بازار رہ جائے گا۔ ایک بات سمجھنے کی ہے کہ آپ سیاست محض کھیل کود کے لیے جائز نہیں کرتے۔ آپ سیاست اس لیے کرتے ہیں تاکہ طاقت حاصل کریں اور اسے اپنے پاس رکھیں۔ جو یہ بات نہیں مانتا وہ جھوٹ بولتا ہے۔ سیاستدان ہمیشہ آپ کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ وہ بہت اچھے ہیں، بہت اچھے کردار کے مالک ہیں اور مستقل مزاج ہیں۔ آپ ان کی باتوں میں نہ آئیں۔ اس طرح کے سیاستدان کا کوئی وجود نہیں ہوتا جو اچھا ہو، اخلاقی لحاظ سے بہتر اور مستقل مزاج ہو۔ سیاست پکڑو اور پچھاڑو کا نام ہے۔ میرے باپ نے ایک دفعہ مجھے ایک بات بتائی تھی کہ کبھی کسی شخص پر اس وقت ہاتھ مت اٹھاؤ جب تک آپ اس کے ہاتھوں مار کھانے کے لیے تیار نہ ہوں۔ باقی چیزیں بوائے سکاؤٹ حماقت ہے اور میں بوائے سکاؤٹ کی وہ تمام خوبیاں اس وقت سے بھول چکا ہوں جو میں نے سکول کے دنوں میں سیکھی تھیں۔

میں نے کہا کہ صدر صاحب! آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ مسولینی، ہٹلر اور نپولین کی کتابیں پڑھتے ہیں۔

[illegible] سوال کے جواب [illegible]

بھٹو صاحب نے مجھے [illegible] جواب دیا۔ Of course [illegible] کے بارے میں [illegible]

فرانس کے انقلاب [illegible] کے چرچل اور روس کے سٹالن کے بارے میں [illegible] ہے

آپ مجھ سے یہ اعتراف کروانا چاہتے ہیں کہ میں ایک فاشسٹ ہوں تو آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں فاشسٹ نہیں ہوں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ ایک فاشسٹ ہونے کے لیے [illegible] ہونا ہے اور میں مجھ سے بہت زیادہ محبت کرتا ہوں۔ ایک فاشسٹ دائیں بازو سے تعلق رکھتا ہے جبکہ میرا تعلق بائیں بازو سے ہے۔ ایک فاشسٹ مڈل بورژوا ہوتا ہے جبکہ میرا تعلق آرسٹوکریسی سے ہے۔ اگر آپ کسی شخص کے بارے میں کوئی کتاب پڑھتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ آپ کا ہیرو ہے۔ میرے بھی اپنے ہیرو ہے لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب میں ایک طالب علم تھا۔ یہ ہیروز بھی ایک چیونگم کی طرح ہوتے ہیں۔ آپ انہیں منہ میں چباتے ہیں اور پھر نکال کر پھینک دیتے ہیں اور اس کی جگہ نئی چیونگم رکھ دیتے ہیں۔ یہ ہیروز آپ کو جوانی میں اچھے لگتے ہیں۔ تاہم اگر آپ یہ جاننا چاہتی ہیں کہ اب تک میں نے کتنے ہیروز کو منہ میں چبایا ہے۔ میں آپ کو ان کے نام بتا دیتا ہوں۔ چنگیز خان، سکندر اعظم، ہنی بال اور نپولین۔ نپولین کو میں سب سے بڑا ہیرو سمجھتا تھا۔ میں روسو کا بھی بڑا فین رہا ہوں۔ اس کے علاوہ مجھے Cavouro، Mazzini اور Garibaldi کو بھی چبانے کا موقع ملا ہے۔ آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ میرے اندر کتنے تضادات تھے۔

میرے منہ سے نکلا "آئی سی"۔

میں نے بھٹو صاحب سے کہا کہ چلیں، آپ کی شخصیت کو زیادہ بہتر سمجھنے کے لیے آپ مجھے یہ بتائیں کہ موجودہ دنیا کے کون سے ایسے لیڈر ہیں جنہیں آپ پسند کرتے ہیں یا جو آپ کو پسند کرتے ہیں۔

بھٹو صاحب نے جواب دیا۔ سکارنو۔ وہ میری ایک طرح سے پوجا کرتا تھا اور میں اس کی۔ اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود جس میں عورتوں کے ساتھ Vulgarity کرنے کے باوجود وہ ایک زبردست انسان تھا۔ اسے اکنامکس کی بھی کوئی سمجھ بوجھ نہیں تھی۔ دوسرا لیڈر ناصر تھا۔ وہ بھی ایک شاندار انسان تھا۔ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا اور میں اس سے۔ میں نے 1966ء میں جب جنرل ایوب کی کابینہ سے استعفیٰ دیا تو ناصر نے مجھے مصر آنے کی دعوت دی اور مجھے ایک سربراہ مملکت کا پروٹوکول دیا اور کہا کہ

www.freepdfpost.blogspot.com

!!allurdupdfnovels!!blogspot!!com!!

میں جتنا عرصہ چاہوں وہاں ٹھہر سکتا ہوں۔ اس کے بعد تیسرا لیڈر جس سے میں متاثر رہا ہوں وہ سٹالن تھا۔ میں ہمیشہ اس کی دل سے بڑی عزت کرتا ہوں۔ تاہم، میں نے خروشیف کو کبھی پسند نہیں کیا۔ اسے میں نے ہمیشہ چٹکلے چلاتے، سٹالن کو برا بھلا کہتے یا شراب پیتے اور ہمیشہ امریکیوں کے آگے جھکنے کے لیے تیار دیکھا۔ خروشیف نے ایشیا کو بہت نقصان پہنچایا۔ آخری لیڈر جس سے میں متاثر ہوں اور میرا خیال ہے کہ آپ چاہتی ہیں کہ میں ماؤزے تنگ کے بارے میں کچھ کہوں تو میں آپ کو بتاؤں کہ میرے لیے چو این لائی کے بارے میں بات کرنا زیادہ آسان ہے کیونکہ میں اسے ذاتی طور پر جانتا ہوں اور میری ان سے کئی ملاقاتیں اور بحث ومباحثے ہوئے ہیں جو صبح سے شام تک جاری رہے حتیٰ کہ ایک سال تک ہم یہ مباحثے کرتے رہے۔ میں 1962ء سے چین جا رہا ہوں اور چو این لائی سے ملاقاتیں کرتا رہا ہوں۔ میں اسے بہت پسند کرتا ہوں۔

میں نے کہا کہ جناب صدر! آپ جن لیڈروں کے نام لے رہے ہیں انہوں نے اقتدار حاصل کرنے کے لیے بہت جدوجہد کی تھی جبکہ آپ نے تو ایسا کچھ نہیں کیا؟

بھٹو صاحب بولے آپ غلط کہہ رہی ہیں۔ یہاں تک پہنچنا میرے لیے کوئی آسان کام نہیں تھا۔ مجھے جیل میں ڈالا گیا۔ میں نے کئی دفعہ خطرات کا سامنا کیا۔ میں نے جنرل ایوب خان اور یحییٰ خان کا سامنا کیا۔ انہوں نے کھانے میں زہر دیکر مجھے قتل کرنے کی کوشش کی۔ میرے اوپر گولیاں بھی برسائی گئیں۔ دو دفعہ میرے اوپر قاتلانہ حملہ 1968ء میں ہوا اور ایک دفعہ 1970ء میں۔ سندھ کے شہر سانگھڑ میں دو سال پہلے میں یحییٰ خان کے بھیجے ہوئے قاتلوں کی کی گئی کراس فائرنگ میں ایک گھنٹے تک پھنسا رہا۔ مجھے بچاتے ہوئے ایک شخص مارا گیا جبکہ دوسرے شدید زخمی ہوئے۔ آپ ایک اور بات بھی نہ بھولیں کہ جب آپ کسی امیر گھر میں پیدا ہوتے ہیں اور اس کے بعد سوشلسٹ بنتے ہیں تو پھر کوئی آپ کی بات کا یقین نہیں کرتا نہ دوست اور نہ ہی آپ کے قریبی لوگ بلکہ وہ آپ کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اور تو اور غریب بھی آپ کی بات کا یقین نہیں کرتے جو بچارے اتنے پڑھے لکھے نہیں ہوتے کہ وہ آپ کے خلوص پر یقین کریں۔ میرے لیے گولیوں کی بوچھاڑ اور خوراک میں زہر سے بچنا اتنا مشکل کام نہیں تھا جتنا ان لوگوں کو اس بات پر مجبور کرنا کہ وہ میری باتوں کو سنجیدگی سے لیں جو مجھ پر یقین نہیں کرتے تھے۔ ایک ایسا شخص جو آسائشوں اور مراعات میں میں پیدا ہوا تھا، انہوں نے کوئی مجھے الہ دین کے قالین پر

نہیں بٹھا دیا تھا اور اگر سیاست میرا پیشہ نہ ہوتا۔۔۔۔

میں نے کہا بھٹو صاحب آپ کے اندر سیاست کے لیے اتنی محبت کہاں سے آئی؟

بھٹو صاحب بولے یہ ہمیشہ سے میرے اندر تھی۔ جب میں ایک بچہ تھا اس وقت بھی میرے ساتھ تھی، لیکن میرا خیال ہے کہ یہ چیز میرے والدین کی طرف سے میرے اندر آئی تھی۔ میرا باپ ایک بڑا زبردست سیاستدان تھا۔ تاہم، افسوس کی بات ہے کہ سیاست سے اس وقت وہ نکل گئے جب وہ مختلف انتخابات میں ہار گئے۔ ان کے سیاست کے بارے میں بڑے اعلیٰ خیالات تھے۔ ایک دن وہ مجھے لاڑکانہ کا چکر لگوانے لے گئے۔ انہوں نے مجھے قدیم مندر دکھائے۔ شاندار گھر اور اپنی تہذیب کی نشانیاں اور مجھے کہا کہ دیکھو بیٹا سیاست بھی ایک مندر یا گھر تعمیر کرنے کی طرح ہوتی ہے یا میوزک یا شاعری لکھنے کی مانند۔ انہوں نے اپنی گفتگو میں مائیکل اینجلو کا بھی ذکر کیا۔ تاہم میری ماں بڑی مختلف خاتون تھیں۔ ان کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا اور وہ دوسرے غریب لوگوں کی غربت بہت محسوس کرتی تھی۔ وہ مجھے اکثر کہتی رہتی تھی کہ بیٹا تم ہمیشہ غریبوں کا خیال رکھنا۔ ہمیں غریبوں کی مدد کرنی چاہیے وغیرہ وغیرہ۔ جب میں امریکہ گیا تو میری ماں کی باتیں میرے ذہن میں اتنی رچ بس گئی تھیں کہ میں ایک انقلابی بن گیا۔ میں امریکہ کی یونیورسٹی آف کیلیفورنیا میں پڑھنے گیا جہاں انٹرنیشنل لاء کا ایک بہت بڑا جیوریسٹ پڑھا رہا تھا۔ میں اس وقت انٹرنیشنل لاء میں بھی ڈگری لینا چاہتا تھا۔ یہ دور کمیونسٹوں کو ہرٹ کرنے کا دور تھا۔ میں پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ میں نے کیا کرنا تھا۔ میں لال نیل پالش لگانے والی لڑکیوں سے دور رہتا اور ایک ایسی سٹریٹ میں جا کر رہا جہاں نیگروز رہتے تھے۔ میں وہاں ایک مہینہ اور ایک ہفتہ رہا۔ مجھے ان کے ساتھ رہنا اچھا لگا۔ وہ جو بھی تھے ان میں بناوٹ نہیں تھی۔ انہیں ہنسنا آتا تھا۔ ایک دن سانڈیاگو میں ایک ہوٹل والے نے اس وجہ سے کمرا دینے سے انکار کر دیا کہ میں ایک میکسیکن لگتا تھا۔ اس واقعے نے بھی میری سوچ کافی بدلی۔ میں امریکہ سے لندن گیا۔ ان دنوں الجیریا کی آزادی کی تحریک چل رہی تھی۔ میں الجیریا کے لوگوں کے ساتھ ہو گیا لیکن میں مظاہرین کے ساتھ مل کر برطانیہ کے وزیراعظم کے دفتر 10۔ ڈاؤننگ سٹریٹ کے باہر نعرے نہیں لگاتا تھا۔ ہو سکتا ہے شاید کسی کو علم نہیں ہے کہ میں اندر سے ایک شرمیلا انسان ہوں۔ میں لوگوں میں زیادہ گھلنا ملنا پسند نہیں کرتا تھا۔ میں ہمیشہ لکھ کر بحث ومباحثہ کرنے کو ترجیح دیتا تھا۔ میرے خیال میں سیاست کی گیم میں یہ چیز مجھے

www.freepdfpost.blogspot.com

!!!allurdupdfnovels!!!blogspot!!!com!!!

زیادہ دلچسپی تھی۔

میں نے کہا کہ بھٹو صاحب اب آپ سے آخری سوال۔ معاف کیجیے گا اگر سوال آپ کو زیادہ تلخ لگے۔ آپ کا کیا خیال ہے، آپ کل بچیں گے؟

بھٹو صاحب نے کہا کہ آپ کے اس سوال کو ہم اس طرح لیتے ہیں کہ یہ ممکن ہے کہ میں اگلی صبح ختم ہو جاؤں لیکن میرا خیال ہے کہ میں ان تمام لوگوں سے زیادہ دیر تک پاکستان کا حکمران رہوں گا جنہوں نے ابھی تک اس ملک پر حکمرانی کی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں اس وقت صحت مند ہوں اور میرے اندر خاصی انرجی بھری ہوئی ہے۔ میں کام کر سکتا ہوں جیسے ابھی بھی ایک دن میں اٹھارہ گھنٹے کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ میں اس وقت نوجوان ہوں۔ میری عمر 44 برس ہے اور میں اندرا گاندھی سے دس سال چھوٹا ہوں اور سب سے بڑھ کر مجھے اس بات کا پتہ ہے کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے میں تیسری دنیا کا واحد لیڈر ہوں جو دنیا کی دو بڑی سپر پاورز کی مخالفت کے باوجود دوبارہ سیاست میں واپس آیا۔ 1966ء میں امریکہ اور روس دونوں مجھ سے سخت خفا تھے اور مجھے مشکلات میں دیکھنا چاہتے تھے۔ آج میں ان تمام مشکلات پر قابو پا کر یہاں بیٹھا ہوں کیونکہ مجھے اپنے پیشے (سیاست) کے بنیادی اصولوں کا پتہ ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ اصول کیا ہیں؟ دراصل سیاست میں آپ کو کئی دفعہ یہ تاثر دینا پڑتا ہے کہ آپ بیوقوف ہیں اور دوسروں کو یہ یقین دلانا پڑتا ہے کہ ان سے بہتر ذہین کوئی پیدا نہیں ہوا۔ تاہم، یہ سب کچھ کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ کے اندر لچک ہو۔۔۔ کیا آپ نے کبھی کسی گھونسلے پر کسی پرندے کو اپنے انڈوں پر بیٹھے دیکھا ہے۔ ایک سیاستدان کی انگلیاں اتنی ہلکی اور لچکدار ہونی چاہییں کہ وہ بڑی مہارت سے اس پرندے کے نیچے سے اس کے انڈوں کو ایک ایک کرکے اتنی خوبصورتی سے نکالے کہ اسے پتہ ہی نہ چلے!

کراچی، اپریل 1972ء

Courtesy : An Interview With History

مترجم: رؤف کلاسرا

www.freepdfpost.blogspot.com

allurdupdfnovels.blogspot.com

رؤف کلاسرا کی یہ کاوش آج کے ان تجزیہ نگاروں کے لیے بہت مفید ہے جن کے پاس رائے عامہ کو تبدیل کرنے کی طاقت تو بہت ہے مگر سیاست کو سمجھنے کا تجربہ، جماعتوں کے اسرار و رموز، مقامی سیاست کے مسائل اور علاقائی تفریقوں سے آگاہی بہت کم ہے۔ رؤف نے یہ سیاسی خاکے لکھ کر ان شخصیات کے اندر جھانکنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ہم رؤف کے تجربے سے اتفاق کریں، مگر رؤف نے سیاست کے ایک دور کا خاکہ میدان میں ریفرنس کے لیے پھینک دیا ہے۔ جس کسی میں اختلاف کا مواد یا مباحثے کی عقل ہو وہ اس معرکے میں شریک ہو سکتا ہے۔

مجھے یہ خاکے پڑھ کر احساس ہوا کہ جو چوہدری نثار یا چوہدری شجاعت رؤف کے خاکوں میں ابھرے ہیں ان کو تو میں جانتا ہی نہیں یا یہ کہ مصنف نے ان کو اپنے زاویے سے دیکھا ہے۔ شاید سیاسی صحافت کا یہی سب سے بڑا سبق ہے کہ ایک ہی منظر اور کردار کی کئی کہانیاں ہوتی ہیں۔ اسی لیے ان خاکوں کا عنوان "ایک سیاست کئی کہانیاں" بہت موزوں ہے۔ کسی کے پاس سچائی کی ٹھیکیداری نہیں اور یوں ہی چھوٹی کہانیوں سے ایک بڑی کہانی ابھرتی ہے جو حقیقت کے قریب تر ہوتی ہے۔

عامر متین

ISBN: 978-969-496-385-3

www.freepdfpost.blog